رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

۷۸۶

رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلشیہ (......)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۷) بابتہ ماہ خورداد ۱۳۴۰ ف مطابق اپریل سنہ ۱۹۳۱ء شمارہ (۱)

(تصاویر)

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور —— چارمینار حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

شذرات

ہندوستان کی موجودہ ابتری میں ایک اہم جز تعلیم کا بھی ہے۔ اہل رائے عرصہ سے اس طریقہ تعلیم کے خلاف احتجاج بلند کرتے رہے ہیں، جس کی بڑی کامیابی صرف چند منشیوں کے پیدا کر دینے تک محدود ہے۔ اب تک تو صرف نوجوان مردوں کے لئے رونا تھا۔ لیکن جب سے لڑکیاں بھی اس میدان میں قدم رکھنے لگی ہیں، موجودہ تعلیمی نصاب اور زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ پروفیسر کاروے، جن کی خدمات نے انھیں تعلیم اناث میں بجا طور پر مجتہدانہ حیثیت دیدی ہے گذشتہ کسی رسالے میں اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہندوستانیوں کی غلامی بھی تو بر تو ہے۔ کہیں تو وہ سماجی رسوم کے غلام ہیں کہیں عقائد کے رہین ہیں، اور تعلیم میں بھی خصوصاً جہاں عورتوں کا سوال ہے، انھیں عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ عورتیں جنھیں عام طور پر نہ تو دفتروں میں نوکری کرنے کی ضرورت ہے اور نہ فراہمی مایحتاج کی، مردوں کے دوش بدوش ڈگری کی تعلیم حاصل کرکے کیا بنالینگی۔ عورتوں کی تعلیم کے نصاب میں یقیناً ایسے مضامین داخل کرنے کی سخت ضرورت ہے، جو انھیں صحت عامہ کے اصول بتلائے اور گھر کے انتظام، حساب کتاب میں مدد دے۔ وہ مخصوص عورتیں جنھیں علوم یا ادبیات کا ذوق ہے اور جو علم صرف علم کی خاطر پڑھنا چاہتی ہوں، مردوں کے ساتھ نصاب کی تکمیل کر سکتی ہیں۔ اور یہ بھی صرف اعلیٰ تعلیم کی حد تک درست ہے وسطانی اور فوقانی تعلیم میں کسی امتیاز کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی مضمون میں کھینچا ہے۔ تعلیم یافتہ مردوں اور جاہل عورتوں کا ساتھ نہ صرف گھر کے انتظام میں بلکہ گھر کی خوشی اور امن میں بھی ہر جگہ خلل انداز ہو رہا ہے۔ جاہل عورت اور عالم مرد کا ساتھ قطعاً صحبت ناجنس ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے سے فطرتاً معذور رہتا ہے۔

ہمارے قدیم تعلیمی طریقے اگر ایسے خستہ اور ناکارہ ہوگئے ہیں کہ ہماری نو پیدا ضرورتوں میں معاون نہ ہوسکیں تو یقیناً ہمیں بیٹی ہوئی لکیر سے ہٹ کر چلنے پر تیار ہونیکی ضرورت ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے مشہور ماہر سائنس سی رامن کو نوبل پرائز کے ملنے اور تیراکی میں ایک حیدرآبادی کی کامیابی کی خبریں سنکر ایک اہل نظر نے فرمایا تھا کہ یہ سال ہندوستان کا سال ہے۔ موجودہ سیاسی دنیا میں مشرقی ممالک کی ہل چل پر نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور مشرقی احیا کا دور ہے۔ آفریقہ کے اس گوشہ سے لیکر چین کی آخری مشرقی حد تک زندگی کی ایک لہر دوڑتی نظر آرہی ہے۔ جس دشوار گزار مرحلہ سے اندنوں مشرقی ممالک گزر رہے ہیں، اور جس قوت برداشت کا یہ ثبوت دے رہے ہیں یہ ان کے شاندار مستقبل کا ایک خاکہ ہے۔

مشرقی ممالک میں صرف جاپان برسوں پہلے اپنی گمنامی کی زندگی ختم کر کے منظر عام پر آچکا تھا۔ مغرب جاپان کی ذہنی اور طبعی قوت کے سامنے بار بار جھکنے پر مجبور ہوتا رہا ہے۔ ابھی ابھی کا ایک اور تازہ واقعہ مغرب پر جاپان کی برتری کے ثبوت میں پیش ہوا ہے۔ قابل احترام مسٹر اڈاٹسی، جو فرانس میں جاپانی سفیر تھے، اب عدالت عالم کے صدر منتخب ہوئے ہیں یہ وہ اعلیٰ ترین رتبہ ہے جس پر کوئی انسان پہنچ سکتا ہے!

دنیا کے مہذب ممالک اپنے قابل لوگوں کی قدر طرح طرح سے کرتے ہیں حکومت اور عوام دونوں کی طرف سے پبلک خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ خطاب انعام یا وظیفے سے حکومت

مساعی کا اعتراف حکومت برابر کر رہی ہے اس طرح کے کام کرنے والوں کی قدر افزائی کے طریقوں پر غور کرنے کے لیئے ہماری حکومت نے بھی بعض اہل رائے بزرگوں کی کمیٹی بنائی ہے - اس کو بھی عرصہ گزر چکا - اس مسئلہ کی ضرورت اور اہمیت کے مد نظر اگر حکومت اس میں زیادہ گہری دلچسپی لے، اور جلد کمیٹی کی سفارشات پر عمل کر سکے تو یقیناً ایک بڑی کمی کی تلافی ہو جائیگی -

---

ایک ترقی کرنے والے ملک میں زبان کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا بجز اس کے کہ وہ ملک گونگوں کا ہو - ہندوستان کی موجودہ تفرقہ پرستی کے جوش نے زبانوں کے ساتھ بھی برا سلوک کیا ہے - ہندوستان کی مشترک زبان کے تصفیہ میں ہزاروں دفعہ اردو اور ہندی کا تصادم ہوا - لیکن پھر بھی یہ مسئلہ جہاں کا تہاں قائم ہے - حقیقت بھی یہی ہے کہ جذباتی امور معقول مباحث سے شاید ہی طے ہوئے ہوں - اس مسئلہ کی نزاکت کو دیکھکر اکثر عاقبت بین بزرگوں نے، ہندوستانی زبان کی تحریک شروع کر دی ہے حقیقت ہمیشہ افراط و تفریط کے درمیان ہوتی ہے - ہندوستانی زبان کوئی خیال کی تراشی ہوئی چیز نہیں ہے - بلکہ یہ ہندی اور اردو کی وہ سادہ اور بین بین شکل ہے جو اٹھارہویں صدی سے عرصہ پہلے ہندوستان بھر میں رائج ہو چکی تھی - اور غالباً انگریزوں نے سب سے پہلے اس کا نام "ہندوستانی" رکھا -

پنڈت جواہر لال نہرو جب حیدرآباد تشریف لائے تھے، موصوف نے کسی ملاقاتی سے دوران گفتگو میں انگریزی زبان کی ہمت شکنی اور ہندوستانی زبان کی ہمت افزائی کرنے کی تلقین فرمائی - شمالی ہند میں بڑے پنڈت اور جید عالم بھی عام بول چال میں جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں ظاہر ہے - پنڈت جی سے ہندوستانی زبان کے متعلق جب سوال کیا گیا تو فرمایا کہ ہندوستانی زبان وہی ہے جس کو میں بول رہا ہوں - پھر پوچھنے والے نے کہا کہ یہ تو اردو ہے - اس پر پنڈت جی نے یہ تصفیہ کن جواب دیا کہ یہی وہ زبان ہے جو ہندوستانی اور اردو دونوں ناموں سے موسوم ہے - یہ ہے ہندی اور اردو کا وہ نازک فرق جس پر کھڑے

اسلامی ادبیات کا اثر

دانتے کی تصنیف

ڈوائن کامیڈی پر

از جناب احمد بدرالدین صاحب

دانتے (اطالوی) کو یورپ کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا شہرۂ آفاق شہ کار "ڈوائن کامیڈی" ہے۔

۱۹۱۹ء میں جامعہ میڈرڈ (اسپین) کے پروفیسر عربی میگائل آسی پلاتیوسی (Miguel Asín y Palacios) نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام "ڈوائن کامیڈی میں امور آخرت کے متعلق اسلامی اثرات تھا"[۵]۔ اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ دانتے کی مشہور نظم (ڈوائن کامیڈی) کا خاکہ اسلامی ادبیات سے ماخوذ اور اسلامی اثرات سے متاثر ہے۔ [۵ط]

---

۵ La Escotologia Musulmana Devina Comedia.

۵ط ڈوائن کامیڈی میں مختصراً دانتے کو ایک "معراج" ہوتا ہے وہ جنت و دوزخ کی سیر کرتا ہے اور بارگاہ الوہیت میں اپنی باریابی کا تذکرہ کرتا ہے۔ نیز عالم مثال سے بھی گزرتا ہے۔

واقعہ معراج جو آنحضرت صلعم کو پیش آیا تھا وہ بھی اسی نوعیت کا ہے اس کے متعلق احادیث میں تفصیلی تذکرے ہیں نیز حضرت ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں ایک خاص باب اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

ابوالعلاء المعری کی کتاب الغفران کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ادیب اور شاعر جنت میں ہیں (چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر) ان سے مکالمے ہوتے ہیں اور ادبی مسائل حل کئے جاتے ہیں

دانتے چونکہ بہت بعد کا ہے اس لئے اس کا احادیث معراج مبارک اور ابن عربی اور المعری کی تالیفوں سے متاثر ہونا ناممکن نہیں اور اسی امکان کو اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو بہت جلد بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی اور اس سے ادبی حلقوں اور علم دوست عوام میں بڑی سنسنی پھیل گئی۔ دانتے کے ہم وطن (اطالوی) بمشکل اس کا یقین کرسکتے تھے کہ نہ صرف ان کے تمدن کے بلکہ قرون متوسطہ کے پورے مسیحی تمدن کے پچو رڈ وائن کامیڈی) کا ماخذ اور بنیاد اسلامی ادبیات ہیں۔ آسی پلاثیوسی کی تصنیف ہر جگہ حیرت سے پڑھی گئی اور سوائے چند گنتی کے اطالوی نقادوں کے (جن کی قومی طرفداری اور تعصب کا بجا طور پر شبہ ہو سکتا ہے) یورپ اور امریکہ کے تمام دانتو یاتیوں (Dantists) اور علماء عربی ورومان نے جو کچھ رائے ظاہر کی ہے اس کا بڑا حصہ آسی کے نظریے کی زبردست تائید کرتا ہے۔ ان لوگوں کی علمی قابلیت اور غیر جانب داری کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ خود اطالوی بھی اس کتاب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے

کتاب اسپینی زبان میں ہے اس کا ترجمہ فرانسیسی میں ہو چکا ہے۔ انگریزی "خلاصہ ترجمہ" میں وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے "جو دستاویزی شہادت اور تنقیدی عمل" کہلا سکتا ہے۔ اس میں جا بجا ڈوائن کامیڈی اور عربی ادبیات کے کثیر اقتباسات بالمقابل دئیے گئے ہیں، ——— انہیں فقط ماہرین خصوصی (Specialists) ہی سمجھ سکتے اور انہیں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، عام ناظرین کے سامنے ایسی تفصیلی شہادت پیش کرنی غیر ضروری ہے ——— جس کو خواہش ہو وہ اصل میں دیکھ لے۔ اس کے علاوہ انگریزی ترجمے میں بعض کم اہم تعلیقیں اور عبارت کے ٹکڑے جو ثبوت کے لئے اصل میں ہیں حذف کر دئیے گئے ہیں۔

آسی پلاثیوسی کے متعلق کچھ اور تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اس نے پچیس برس سے زیادہ عرصہ ان تحقیقات میں صرف کیا کہ یورپ کے قرون متوسطہ میں ہم عصر اسلامی فلسفی و مذہبی افکار و خیالات کیا تھے؟ اس نے چند سال ہوئے سینٹ طامس اکوئیناس (مشہور عیسائی فقیہ) کی دینیات پر ابن رشد کا اور ریمان لُل پر ابن عربی کا اور طور امیدا کے پادری انسیلما پر رسائل اخوان الصفا کے اثرات کا انکشاف کیا۔ نیز دیگر اہم ادبی انکشافات اور تحقیقیں کیں ڈوائن کامیڈی کی اصل کا پتہ لگانا گویا اس کا عالیہ کارنامہ اور شہ کار ہے۔

انگریزی "خلاصہ ترجمہ" ۱۹۲۶ء میں لندن میں (Islam and the Divine Comedy) کے نام سے شائع ہوا ... خلاصہ نگار کے دیباچے سے اس کا تعارف ...

آف برک اینڈ ایلیا نے لکھا ہے اور اسی سے سطور بالا اخذ کی گئی ہیں۔ درانگریزی خلاصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس امور کو خواہ مخواہ اسلام سے منسوب کیا گیا ہو تو اسے ناظرین یہاں نقل کفر نہ سمجھیں۔

(اردو مقتبس)

باب اوّل

خلاصہ

(۱) ڈوانٹی کامیڈی اور اسلامی واقعہ معراج کی مختلف روایتوں انتخابوں اور نقلوں میں جو کچھ مماثلت ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ۔

(۲) منظر دوزخ میں مشابہت۔

(۳) منظر پل صراط میں "

(۴) منظر جنت میں "

(۵) تمثیلی امور میں یکسانی "

(۶) دیگر کم اہم مشابہتیں "

(۷) ابتدائی نتائج۔

(۸) اسلامی روایات پر دیگر مذاہب کے قصوں کا اثر۔

تقابل

(۱) اگر ہم اسلامی دنیا کے مذہبی روایات (متعلقہ واقعۂ اسرا و معراج) کی ابتدا اور ارتقا پر غور کریں اور اس واقعہ کی مختلف روایتوں کی تدقیق کر کے دانتے کی نظم سے مقابلہ کریں تو دونوں قصوں کی باہمی مشابہت کے خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان امور کو مختصراً لکھا جائے جو اسی طرح ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن شریف کے پندرھویں پارے کے ایک رکوع میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزانہ سفر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو عوالم مابعد الممات سے متعلق ہے۔ عوام الناس نے قرآن کے اس تذکرہ پر بے شمار روایتیں گھڑ لیں۔ راویوں نے اس کو افسانہ بنا ڈالا اور نہایت تفصیل کے ساتھ سفر کے دونوں حصوں یعنی دوزخ کے معائنے اور جنت کے مشاہدے کا تذکرہ کیا۔ یہ روایتیں تمام دنیائے اسلام میں نویں صدی عیسوی میں مقبول ہو گئی تھیں بلکہ بعض قدیم تر روایات میں بھی اس واقعے کے دونوں حصوں کو ایک ہی مسلسل روایت بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ڈوائن کامیڈی میں ہے۔

(۲) ان تمام روایتوں میں دانتے کی طرح آنحضرت صلعم ہی چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں ماسوا اس کے دونوں سفر شب میں ہی شروع ہوتے ہیں جب کہ قصہ کے بطل (ہیرو) کو گہری نیند سے بیدار کیا جاتا ہے۔ سفر کے متعلق ایک اسلامی روایت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دوزخ کی سڑک کو ایک شیر ببر اور ایک بھیڑیا روکے ہوئے تھے۔ اس کی تقلید میں دانتے نے اپنی نظم میں ایک چیتے ایک شیر ببر اور ایک بھیڑیے کی مادہ کا ذکر کیا ہے۔ خیطاؤر جنوں کا پیشوا جو مسلم مسافر (آنحضرت صلعم) سے ملاقات کرتا ہے، دانتے کی نظم میں ورجل اس کی نقل ہے۔ چنانچہ قدماء کا پیشوا۔ ورجل دانتے کو لمبو (Limbo) کے باغ تک (جس کا تذکرہ ڈوائن کامیڈی میں ہے) رہنمائی کرتا ہے ورجل دانتے کے روبرو نمودار ہوتا ہے جس طرح کہ آنحضرت صلعم کے سامنے حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ اور سفر میں شروع سے آخر تک ہر ایک رہبر اپنے ساتھی مسافر کے متجسسانہ سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا ہے۔ دونوں قصوں میں دوزخ قریب آنے پر آگاہ کرنا بالکل یکساں ہے۔ چنانچہ ایک مبہم آواز اور دہشت ناک شعلے دوزخ کی نشانیاں ہیں، روایتوں میں دوزخ کے غضب ناک نگہبان، مسافر کو اندر آنے سے روکتے ہیں یہاں تک کہ رہبر کی استدعا پر ملاء اعلیٰ سے احکام صادر ہونے پر ان محافظوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ خوفناک شیطان جو آنحضرت صلعم کا ایک جلتی ہوئی تلوار کے ساتھ آپ کے سفر اسرار (معراج) کی ابتدا میں تعاقب کرتا ہے اس کی نقل ڈوائن کامیڈی میں اسطرح کی گئی ہے کہ ایک شیطان دانتے کا آٹھویں دائرے کے پانچویں غار میں تعاقب کرتا ہے۔ ورجل مختصر الفاظ کہکر شیطان کو بے ہتیار کر چھوڑتا ہے جس طرح کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلعم کو ایک دعا سکھاتے ہیں جس سے جلتی ہوئی تلوار کی آگ بجھ جاتی ہے۔

دانتے کی دوزخ کی عام ساخت مسلمانوں کی دوزخ کی ایک ہو بہو نقل ہے۔ دونوں ایک وسیع قیف یا الٹے ہوئے مخروط کی شکل رکھتے ہیں اور اس میں منزل در منزل عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ہر قسم کے گنہگار الگ الگ درجے میں ہیں۔ علاوہ بریں ہر ایک درجے میں مختلف ذیلی درجے ہیں جس طرح کہ ہر قسم کے گناہ کی بہت سی ذیلی شاخیں ہیں۔ سب سے گہرا حصہ سب سے بڑے گنہگاروں کے لئے ہے اور وہاں سخت ترین اور بے حد المناک سزا دی جاتی ہے۔ اخلاقی نظام بھی دونوں دوزخوں میں بہت مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ سزا بھی مرتکب گناہ کے بالکل ہم شکل یا برعکس ہے۔ "دونوں" دوزخ شہر یروشلم کے نیچے واقع ہیں۔

ان دونوں دوزخوں کے باہمی عذاب کی مطابقت کی مثالیں بھی کم نہیں ہیں۔ مثال کے لئے زناکاروں کو لیجئے جو دانتے کی نظم میں ادھر ادھر ایک دوزخی طوفان کے باعث گھٹے جلتے ہیں مسلم روایتوں میں ایک آتشی طوفان کے ذریعے سے نیچے اوپر اچھالے جاتے ہیں مسلم دوزخ کے پہلے دائرے کا خاکہ شہر دیس کی (جو دانتے کی نظم میں ہے) تصویر کی بالکل ہو بہو نقل ہے۔ چنانچہ شعلوں کا ایک سمندر ہے جس کے کنارے لاتعداد قبریں آگ سے دہکی ہوئی ہیں۔ دانتے کی نظم میں زانیوں کی روحیں اسی حالت میں ہیں جس طرح مسلم روایتوں میں سود خوار۔ چنانچہ ایک خون کی جھیل میں غوطے کھاتے ہیں اور جہنمی شیطان ان کی نگہبانی کرتے ہیں اور ان پر آگ کے پتھر برساتے ہیں۔ دانتے کی نظم میں بسیار خوار اور چور اس حالت میں دکھائے گئے ہیں کہ ان کو سانپ ایذا دیتے تھے۔ یہی حالت مسلم دوزخ میں ظالموں، خائن سرپرستوں اور سود خواروں کی ہے۔ ڈوائن کامیڈی میں جعل سازوں کو پاگل بنانے والی سخت پیاس کی سزا دی گئی ہے۔ یہی سزا اسلامی روایتوں میں شرابیوں کے لئے رکھی گئی ہے۔ دانتے کے بیان کے مطابق جعل سازوں کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں ایک اسلامی روایت میں یہی حشر سود خواروں کا ہے ۔ مزید برآں ازیسٹو کے گریفولینو اور سینیا کے کیوتیو (ڈوائن کامیڈی میں) اپنے جذامی جسم کی کھپلیوں (کھرنڈ) کو کھرچتے دکھائی دیتے ہیں اور اسلامی دوزخ میں جھوٹی تہمت لگانے والا اسی حالت میں نظر پڑتا ہے۔ باغیوں کو جہنمی شیاطین کانٹے ہاتھوں میں لے کر ابلتے ہوئے ڈابر کی ایک جھیل میں روکے رہتے ہیں اور باہر نکلنے نہیں دیتے۔ مسلم روایت میں غیر فرض شناس بچوں کی یہی سزا بتائی گئی ہے۔ چنانچہ وہ آتشی جھیل میں غوطے کھاتے ہیں اور شیاطین کے کانٹوں سے زخمی ہو کر مدد اور رحم کے لئے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ نیز دانتے کی نظم میں بدعتیوں کے لئے ہولناک سزا

رکھی گئی ہے کہ شیطان ان کو چاقوؤں سے مارتے ہیں اور پھر زندہ کئے جاتے ہیں اور یہ عذاب غیر مختتم اور غیر متناہی ہے۔ قاتلوں کے لئے یہی ہولناک عذاب اسلامی دوزخ میں دکھائی دیتا ہے۔

(۳) مسلم مسافر کو ان کا رہبر ہمت دلاتا ہے اور آنحضرت صلعم ایک ڈھلوان پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش فرماتے ہیں اسی طرح دانتے کو بھی ورجل ہمت دلاتا ہے اور وہ اعراف کے پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دونوں روایتوں میں تمثیلی مناظر بکثرت ہیں اور وہ بسا اوقات علامات اور خصوصیات میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر اس عورت کو لیجئے جو اپنی نفرت انگیز بدصورتی کے باوجود دوزخ کے چوتھے دائرہ میں دانتے کو اپنی راہ سے بہکانے کی کوشش کرتی ہے، اسی قسم کا واقعہ آنحضرت صلعم کو پیش آیا تھا حضرت جبرئیل علیہ السلام اور ورجل اس امر میں متفق ہیں کہ یہ منظر دنیا کی جھوٹی دلربائیوں کی ایک تمثیل ہے اسی طرح دونوں جگہوں میں مذکور ہے کہ ایک ندی جنت کو اعراف سے جدا کرتی ہے اور ہر ایک مسافر اس کا پانی پیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوزخ کے معائنے کے بعد دانتے تین مرتبہ طہارت کی غرض سے غسل کرتا ہے۔ ورجل کاتو کے مشورہ پر اپنے ہاتھوں سے دانتے کا چہرہ دھلاتا ہے اور اعراف سے رخصت ہونے کے وقت زائر کو لیتھی اور یونیو کی ندیوں میں ماتلدا اور استاتیوس غوطہ دیتے ہیں اور ان ندیوں کا پانی گناہ کی تمام یاد کو محو کر دیتا ہے۔ اسلامی روایت میں روحیں بھی ان ندیوں میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باغ میں ہیں تین وقت پاک کی جاتی ہیں جس پر وہ گناہوں کے اثر سے پاک اور ان کے چہرے نورانی ہو جاتے ہیں۔

جنت کی پھاٹکوں پر مسلم مسافر سے ایک خوبصورت لڑکی ملتی ہے جو آپؐ کا ادب سے استقبال کرتی ہے اور دونوں مل کر جنت کے باغوں میں پھرتے ہیں یہاں تک کہ آپؐ ایک ندی کے کنارے حوروں کا ایک تعجب انگیز مجمع دیکھتے ہیں جو شاعر امراؤ القیس کی محبوبہ کے حضور میں ہوتی ہیں۔ دانتے بھی جب دنیاوی جنت میں داخل ہوتا ہے تو ایک خوبصورت لڑکی ماتلدا سے ملتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ پھولوں کی کیاریوں میں پھرتا ہے۔ اسی اثنا میں وہ ایک ندی کے کنارے بڈھے آدمیوں اور حسین عورتوں کا ایک عجیب و غریب جلوس دیکھتا ہے جو اس کی محبوبہ بیترس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیترس جنت سے اس سے ملنے کے لئے اترتی ہے۔

(۴) مسلم اور عیسائی آسمانوں کی ساخت اس حد تک ہم شکل ہے کہ یہ دونوں بطلیموسی نظام پر قائم ہیں جب وہ نو آسمانوں میں سے گزرتے ہیں تو ان سے مبارک روحیں ملاقات کرتی ہیں جن کا حقیقی گھر آخری کرہ ہے اور جہاں وہ آخر کار سب مجتمع پائی جاتی ہیں، نو کروں کے نام بھی بعض صورتوں میں یکساں ہیں یعنی بعض کروں

کے متعلقہ سیاروں کے نام دونوں میں ایک ہی ہیں بعض اوقات ان کا اخلاقی نظام بھی ملتا جلتا پایا گیا ہے۔ چنانچہ روحیں اپنی نیکیوں کی نوعیت کے مطابق مختلف کروں (آسمانوں) میں منتشر و منقسم ہیں۔ بسا اوقات دونوں روایتوں میں یہ تقسیم علم ہیئت کے مطابق کی گئی ہے یا ہیئت و اخلاقیات کے مجموعے کے موافق۔

دانتے نے فردوس (Paradiso) کا جو تذکرہ کیا ہے وہ روحانیات سے بھرا ہوا ہونے کے باعث غیر فانی ہو گیا ہے۔ اسلامی واقعے کی بعض روایتوں میں جنت کا جو خاکہ ہے وہ روحانیت میں اس سے کسی طرح کم نہیں ——— نور اور آواز ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے مسافر کرہ ہائے اثیر (Ether) کا سماں کھینچ دیتے ہیں، دونوں ایک ایسے نور سے (جو درجہ بدرجہ چمکدار تر ہی ہوتا جاتا تھا) چندھیا جاتے ہیں۔ اندھے ہونے کے خوف سے وہ اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں، لیکن ان کے رہبر ان کے خوف کو دور کرتے ہیں اور خدا ان کو اس نئے نور کے دیکھنے کی طاقت عطا فرماتا ہے۔ دونوں مسافر بار بار ان مناظر عظیم کا خاکہ کھینچنے سے قاصر رہنے کا اقرار کرتے جاتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ دونوں اپنے رہبروں کے ساتھ ہوا میں اس تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہیں کہ اس کا ہوا اور تیر کی رفتار سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ دونوں رہبروں کے فرائض گوناگوں ہونے میں متفق ہیں، نہ صرف وہ زائروں کی رہنمائی کرتے اور ان کو آرام پہنچاتے ہیں بلکہ وہ ان کی جانب سے خدا کے پاس دعا بھی کرتے ہیں اور ان کو خدا کی غیر معمولی عنایتوں پر شکر ادا کرنے کی ہدایت بھی دیتے جاتے ہیں۔

اور جس طرح جنت کے آخری درجہ پر بیترس دانتے کو چھوڑ جاتی ہے اس طرح حضرت جبرئیل آنحضرت صلعم کو ایک ایسے مقام پر پہنچا کر رک جاتے ہیں جہاں آپ کو ایک نور گھیر لیتا ہے اور حضور الوہیت میں پہنچا دیتا ہے۔

ہر آسمان میں اور مختلف مقاموں میں مسلم مسافر (صلعم) بہت سے ایسے پیغمبروں سے ملاقات فرماتے ہیں جو بائیبل میں مذکور ہیں ان پیغمبروں کو ان کے دنیاوی ساتھیوں کے ارواح گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ دانتے بھی بہت سی اہم شخصیتوں سے جو بائیبل یا اسلامی تاریخ میں مذکور ہیں ملتا ہے۔ اسلامی روایت کی لفظی تقلید میں بہت سے مردوں اور عورتوں سے اس کا تعارف کرایا گیا ہے، اگرچہ کہ وہ مختلف درجوں اور عقیدوں کے ہیں لیکن سب کے سب اسلام کی تاریخ میں اہمیت کے ساتھ مذکور ہیں بہت سے مسافر کے ہم عصر ہیں بعض تو واقف کار لوگ ہیں اور ان کو ان کے ادب کی خاص شاہرخم کے لحاظ سے مختلف

حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس تقلید کی خواہش میں جنت اور دوزخ دونوں ادنیٰ قسم کے لوگوں کی ایک ہی قسم کی جماعت سے معمور ہیں اور یہ ڈوائن کامیڈی کی خاص خصوصیت ہے۔ معراج مبارک اور ڈوائن کامیڈی دونوں کے مناظر میں نئے لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ایک ہی قسم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ یا تو مسافر خود دریافت کرتا ہے کہ فلاں روح کہاں ہے یا اتفاقیہ طور سے کوئی روح آتی ہے اور اس وقت تک نامعلوم رہتی ہے جب تک کہ رہبر یا کوئی اور فرشتہ مسافر کو اس روح کی شخصیت سے واقف نہیں کراتا۔ دونوں روایتوں میں زائرین جنت اور دوزخ کے ارواح کے ساتھ ادبی اور مذہبی مضامین پر گفتگو کرتے ہیں یا مردہ لوگوں کی حیات دنیوی کے حادثات و سوانح پر بحث سے آخر یہ کہ آنے والی روحوں کو مختلف درجوں میں تقسیم کرتے وقت دونوں روایتوں میں رواداری کی روح کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور بسا اوقات دونوں مسافر شخصی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دونوں جب خوشی یا غم کی حالت میں دیکھتے ہیں تو خوشی یا غم ہی کے احساسات کو ظاہر کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ لعنتیوں کے تکالیف کو بغور دیکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ وہ صرف عام خاکہ ہی نہیں ہے جس میں دونوں "معراجوں" میں مطابقت پائی جاتی ہے بلکہ جنت کے مناظر کے متعلق تذکرے بھی بسا اوقات مشابہت رکھتے ہیں گو کہ وہ بالکل یکساں نہیں

تمثیلاً دانتے کو لیجئے کہ وہ مشتری کے آسمان میں ایک عظیم الشان عقاب کو دیکھتا ہے جس کے جلو میں ہزارہا نورانی ارواح پر دار انسانوں کی شکل میں تھے اور آدمیوں کو راستی پر قائم رہنے کی ہدایت کے گیت گاتے تھے اور وہ عقاب اپنے پر پھڑپھڑاتا تھا۔ اور اس کے بعد خاموش ہو جاتا تھا۔ یہ واقعہ اسلامی روایتوں میں اسطرح مذکور ہے کہ حضرت محمد صلعم آسمان میں ایک قوی ہیکل فرشتے کو ایک مرغ کی شکل میں دیکھتے ہیں جو اپنے پھوٹے ہلا کر بنی آدم کو عبادت کرنے کی ترغیب کے گیت گاتا تھا اس کے بعد آرام لیتا تھا۔ آپ دوسرے فرشتوں کو بھی دیکھتے ہیں جن کے بے شمار چہرے اور بازو تھے وہ نور سے جگمگا رہے تھے اور اپنی لاتعداد زبانوں سے حمد کے گیت گاتے تھے، یہ دونوں نظارے ایک ہی نظارہ بن کر دانتے کو آسمانی عقاب کا تخیل سمجھاتے ہیں۔

سیڑھی کے ذریعہ مبارک لوگوں کی روحوں کو اترتی ہوئیں دیکھتا ہے بیتریس (دانتے کی معشوقہ) کے اشارے پر وہ اور اس کا رہبر اس سیڑھی پر اس سے کم وقت میں چڑھتے ہیں جتنا کہ "چراغ پر سے انگلی ہٹانے میں لگتا ہے۔"

حضرت صلعم اپنے معراج مبارک میں ایک سیڑھی دیکھتے ہیں جو یروشلم سے سب سے آخری آسمان تک جاتی تھی۔ فرشتے اس کے دونوں طرف استادہ تھے اس کے چاندی سونے، اور زمرد کے زینوں پر سے ارواح اوپر چڑھتے تھے۔ حضرت محمد صلعم حضرت جبرئیل کے رہنمائی میں اس کے ذریعے سے "طرفۃ العین سے بھی کم وقت میں" اوپر گئے تھے۔

دانتے اپنے ہم وطن پکارہ ا اور پادوا کی کونستیا سے ملتا ہے ان عورتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اسلامی روایتوں میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ مسلم مسافر (حضرت محمد صلعم کے واقعہ معراج کی تقلید میں)[۱] دو عورتوں سے ملاقات کرتا ہے جن سے وہ واقف تھا۔ ایک تو خود اس کے شہر حلب کی ایک عورت .... حمدونہ نامی اور دوسری بغداد کی حسین توفیق نامی، ان دونوں روایتوں میں یہ عورتیں زائر سے خود اپنا تعارف کراتی ہیں اور اپنی شادی کی تکالیف کا اس سے تذکرہ کرتی ہیں اور اپنی بے مثل خوبصورتی سے مبہوت چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

دانتے بھی مسلم مسافر (صلعم) کے مانند آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کرتا ہے اور ان کے ساتھ اس زبان کے متعلق سوال کرتا ہے جو آپ باغ عدن میں بولتے تھے۔

آسمان کے آٹھویں کرے پر مذہبی نیکیوں کے متعلق دانتے جو تفتیش کرتا ہے وہ اس تفتیش سے بالکل مشابہ ہے جو معراج کی تقلید میں لکھی ہوئی ایک تمثیل (Allegory) مردہ لوگوں کی روحوں کے متعلق تحریر کی گئی ہے۔

دانتے کی جنت میں حسن تخیلی گلاب کے پھول پر نورانی چہرے اور برف سے زیادہ سفید جسم والے فرشتے اڑتے تھے وہ اصل میں اس واقعے کی نقل ہیں کہ آنحضرت صلعم نے ایسے فرشتوں کو دیکھا تھا جن کا آدھا جسم آگ کا تھا اور آدھا برف کا۔

جب وہ آسمانوں کی بلندی پر کھڑے ہوتے ہیں تو دونوں زائر اپنے رہبروں کی استدعا پر نیچے کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں تعجب ہوتا ہے کہ عالم آسمانی کے مقابلے میں یہ دنیا کتنی حقیر ہے۔

---

[۱] گویا مصنف کے نزدیک اسلامی روایتوں میں معراج آنحضرت صلعم کے سوا کسی اور شخص کو بھی ہوا شاید المعری کی کتاب الغفران کی طرف اشارہ ہے (مترجم)

دونوں "معراجوں" میں رویت باری تعالیٰ کا تذکرہ بالکل یکساں ہے، ہر ایک قصہ میں حضور الوہیت
میں پیش ہونے کا اعلیٰ رتبہ حاصل ہونے پر تجلی مقدس کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک نہایت تیز نور
کا مرکز شعاع (فوکس) معلوم ہوتا ہے۔ ہزار ہا فرشتہ خصلت ارواح کے "نو ہم مرکز" دوائر اس کو گھیرے ہوئے ہیں
اور آس پاس ایک عجیب و غریب نور پاشی کرتے ہیں۔ مرکز کے قریب ایک قطار میں کروبی (مقرب فرشتے) ہیں۔
مسافر دو باران نو دائروں کے عظیم الشان منظر کو نور ربانی کے گرد لگاتار طواف کرتے دیکھتا ہے ایک بار اس وقت
جبکہ ابھی دوری تھی اور سفر کا اختتام نہیں ہوا تھا اور دوسری بار اس وقت جب کہ وہ خدا کے عرش کے
سامنے کھڑے رہتا ہے۔ تجلی مقدس کے اثرات جو دونوں زائروں کے دلوں میں ہوئے وہ بالکل مطابقت
رکھتے ہیں پہلے پہل وہ نور کی شدت سے چندھیا گئے اور وہ یقین کرنے لگے کہ وہ اندھے ہو گئے ہیں مگر
تدریجاً ان کی بصارت قوی ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بالآخر وہ اس نور کا ثابت قدمی سے دیدار کرنے لگتے
ہیں۔ دونوں تجلی کا سماں کھینچنے سے قاصر ہیں اور صرف اتنا ہی یاد رکھتے ہیں کہ ان پر ایک محویت طاری
ہو گئی جس سے پہلے انہیں ایک اعلیٰ ترین مسرت کا ایک عجیب و غریب احساس ہوا۔

(۵) دونوں سفروں کی باہمی یکسانیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دونوں روایتوں میں ایک
ہی عام روح (اسپرٹ) ساری نظر آتی ہے۔

دانتے نے اپنی ڈوائن کامیڈی میں جابجا جن اخلاقی نتائج کے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کو نالق
میں مسلمان صوفی اور بالخصوص اندلس کے حضرت ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تصانیف میں ظاہر فرما چکے ہیں۔
مسلمان صوفی معراج کے واقعہ کو ایک متنوع المناظر اور ڈرامائی قصہ کی شکل میں (جس میں حضرت محمد صلعم
جنت و دوزخ کی سیر فرماتے ہیں) اس غرض سے بیان کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے اس بات کا ایک نمونہ
بتائیں کہ ایمان لانے اور مذہبی امور خیر کو انجام دینے سے روح کتنی ترقی کرتی ہے ـــــ دانتے نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔
دانتے حضرت ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی تقلید میں یہ خیال کرتا ہے کہ یہ سفر در اصل ایک ایسے انسان کی دنیاوی
زندگی کا نمونہ ہے جسے خدا نے دنیا میں اس غرض سے بھیجا کہ اپنی قسمت آزمائی آپ کرے، اور اس اعلیٰ ترین
مراتب کو حاصل کرے جن کا مقدس تجلی کے ذریعے مظاہرہ کیا گیا ہے، جن کو وہ مذہب کی رہنمائی کے بغیر
انجام نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ عقل اس سفر کے صرف ابتدائی منازل تک ہی رہنمائی کر سکتی ہے جس میں اخلاقی
اور دماغی زندگی کے نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جنت کی شاندار حویلیاں جو مذہبی پارساؤں سے مخصوص ہیں

ان تک صرف مذہب کی ضیاپاش روشنی ہی پہنچا سکتی ہے، چنانچہ اسی بنا پر حضرت محمد صلعم کے معراج مبارک کے واقعات کی (جو حضرت ابن عربی رح وغیرہ لکھتے ہیں) تقلید میں جن لوگوں نے قصہ گھڑ لئے ہیں ان میں نہ تو حضرت محمد صلعم بطل ہیں اور نہ کوئی اور۔ ولی یا سینٹ، بلکہ ایک انسان اور دانتے ہی کے مانند گنہگار انسان ہیں، چنانچہ علی العموم وہ دانتے کی طرح یا تو کوئی فلسفی ہے یا مذہبی پیشوا یا شاعر۔ ضمناً جن دوسرے لوگوں کا تذکرہ ہے وہ واقعی انسان اور گنہگار انسان ہیں اور اکثر تائب کفار۔ اس طرح ڈوائن کامیڈی اور اسلامی واقعۂ معراج دونوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک ہی قصہ میں حقیقت اور تمثیلی تخیل کے متبائن عناصر جمع کر دئے گئے ہیں۔

(۶) پراسرار اور مبہم طرز بیان دانتے کی نظم اور حضرت ابن عربی کے تذکرہ کی مشترک خصوصیت ہے۔ علاوہ بریں، دونوں مصنف اشخاص قصہ کی زبان سے فلسفہ دینیات اور علم ہیئت پر طویل اور مشکل بیانات پیش کرکے اپنی وسیع لیاقت کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں۔

دانتے کی نظم کی طرح واقعۂ معراج کی بھی کثیر مسلمانوں نے تفصیل و تشریح کی ہے اور کوشش کی ہے کہ معمولی سے معمولی واقعہ کے متعدد امور پر معنی خیز روشنی ڈالی جائے۔ جب اس امر کو پیش نظر رکھیں تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ کیوں ابو العلاء المعری نے اپنی تصنیف (کتاب الغفران) محض اس مقصد کے تحت لکھی کہ بغدادیوں کے سامنے فن ادب کا ایک شہ کار چھوڑے اسی بنا پر ابو العلا کی مقفیٰ و مسجع نثر میں ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ اصطلاحی دقتیں پیش آتی ہیں جیسی دانتے کی نظم میں۔ اس کے متعلق شہادت فراہم کرنے کے لئے، مندرجہ ذیل حقایق کو بلا انکار قبول کرنا ہوگا۔

(۷) دانتے کے اپنی عجیب و غریب نظم کو لکھنے کے کم از کم چھ سو برس پہلے مسلمانوں میں ایک مذہبی روایت موجود نظر آتی ہے کہ حضرت محمد صلعم نے عالم آخرت کی سیر فرمائی رفتہ رفتہ آٹھویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک محدثین، فقہا، مفسرین، صوفی، فلسفی اور شعرا سب ابتدائی روایت کی بنیاد پر ایک عظیم الشان مذہبی قصہ کی عمارت تعمیر کرتے ہیں بعض اوقات انہوں نے اصلی واقعہ ہی کو طوالت سے بیان کیا ہے لیکن بعضوں نے اسی کو تمثیل کی صورت میں ڈھال لیا اور بعضوں نے اس کے نمونے پر ادبی قصے لکھے۔

ڈوائن کامیڈی کے ساتھ ان تمام اسلامی روایتوں اور قصوں کا مقابلہ کیا جائے تو بہت سی مشابہتیں

ظاہر ہوتی ہیں اور جن چیزوں میں مکمل یکسانیت پائی جاتی ہے ان میں جنت و دوزخ کی عام بناوٹ اور اخلاقی تشکیل، ثواب اور عذاب کا خاکہ واقعہ کے عام خدوخال، سفر کے حوادث اور واقعات، تمثیلی خصوصیات، قصہ کے اہم یا غیر اہم اشخاص کے کام کا تعین نیز اہم ادبی قیمت شامل ہیں۔

(۸) ان یکسانیوں سے جو دلچسپ مسائل پیدا ہوتے ہیں ان پر کسی آیندہ باب میں غور کیا جائیگا لیکن جو اعتراضات ممکنہ ہیں ان پر چند الفاظ پیش کرنے مناسب ہیں:-

حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ اسرا اور معراج مبارک اسلام میں سب سے پہلے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصلی ماخذ قدیم تر اور دیگر تہذیبوں کے مذہبی روایات معلوم ہوتے ہیں لیکن اس "قصے" کے ماخذ کا سوال محض ثانوی اہمیت رکھتا ہے، صرف اتنا بیان کرنا کافی ہے کہ ممکن ہے کہ اس کی تخلیق میں یہودی ایرانی اور عیسائی قصوں کا اثر پڑا ہو۔ یہ امر کچھ دشوار نہیں کہ اسلامی واقعہ میں اور یہودی عیسائی روایات کے مطابق حضرت موسیٰؑ و ادریسؑ و باروخ (Baruch) اور انبیاء علیہ السلام کے معراجوں میں اور ارداویراف (ایرانی) کے جنت کے فرضی سفر میں یا خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گود میں جانے میں اور آپ کے آسمان پر جانے اور سینٹ پال کے تیسرے آسمان پر جانے میں بہت سی امور مشترک مل جائیں مگر ان سفروں اور "معراجوں" میں سے کسی کو بھی ادبیات میں پھیلایا نہیں گیا ہے جس طرح کہ اسلامی روایت کے متعلق ہمیں نظر آتا ہے۔ بظاہر چونکہ اسلامی روایت مذکورہ بالا "معراجوں" میں سب سے آخر میں پیدا ہوئی اس لئے مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ قدیم روایتوں پر نئی عمارت قائم کرکے قصہ کو ایک مربوط صورت میں پیش کریں اور قدیم واقعات کے ساتھ ساتھ بہت سے جدید امور کو بھی (جو جدت پسند عربی طبیعت کا نتیجہ تھے) شامل کرلیں، علاوہ بریں اسلام میں واقعہ معراج عالم و جاہل ہر قسم کے لوگوں میں بہت وسیع پیمانہ پر پھیلا ہوا تھا کیونکہ وہ معتقدات مذہب کا ایک جزء ہے اور آج تک شب معراج ایک مذہبی تقریب کے طور پر اسلام کے طول و عرض میں منائی جاتی ہے، اور ترکی، مصر اور مراکش میں ایک قومی تعطیل کا دن ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر کا واقعۂ معراج ان میں کتنی جڑ پکڑ چکا ہے اور کس قدر وسیع طور سے ان کے اعتقادات میں راسخ ہو چکا ہے۔

---

[۱] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نہ یہ اصل مصنف خیال ہے (اردو مقتبس)

باب دوم

(۱)۔ مذکورہ بالا مشابہتوں سے کیا عام نتائج نکلتے ہیں۔
(۲)۔ عالم آخرت کا نقشہ کھینچنے میں ابن عربیؒ اور دانتے کی یکسانیت۔
(۳)۔ مقامیاتی تزئین میں یکسانی۔
(۴)۔ تخیل کی یکسانی۔
(۵)۔ متعدد واقعات اور مناظر کی ہم آہنگی۔
(۶)۔ تحقیقات باب اول و دوم کے عام نتائج (اسلامی ادبیات نے دانتے کے معموں پر جو روشنی ڈالی ہے اس کا مقابلہ دیگر تمام ادبیات مل کر بھی نہیں کر سکتے)۔
(۷) باب سوم سے اتصال۔

(۱)۔ ڈوائن کامیڈی کے متعدد تفصیلات اور مقامیات (Topography) کی گو کوئی نظیر واقعہ معراج میں نہیں ملتی لیکن اسلامی ادبیات میں اس قسم کی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن کے لئے قرآن مجید، حدیث شریف، حشر و نشر کے متعلق اسلامی روایات اور عالموں، فلسفیوں اور صوفیوں کی کتابیں کو دیکھنا چاہیئے۔

(۲)۔ اسلامی مفکرین میں ابن عربیؒ ہی وہ شخص ہو سکتے ہیں جن کی تحریرات سے دانتے کو آیندہ زندگی کے متعلق ایک نمونہ ملنا قرین قیاس ہے جہنم کے طبقات، بہشتی آسمان، خیالی گلاب کے پھول کے دائرے، نور ربانی کے مرکز شعاع (فوکس) کے اثرات، فرشتوں کا مصروف حمد ہونا، تین دائروں کا تثلیث کی ترجمانی کرنا، ان سب کا دانتے نے بالکل ویسا ہی تذکرہ کیا ہے جیسا کہ ابن عربی نے اور اس مشابہت سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ان میں اصل اور نقل کی نسبت پائی جاتی ہے۔ ان کا محض توارد ہونا ناممکن ہے۔ تاریخی حقایق یہ ہیں کہ تیرھویں صدی میں دانتے کی پیدائش کے پچیس سال پہلے ابن عربیؒ نے اپنی تصنیف الفتوحات المکیہ میں آیندہ زندگی کے متعلق خاکہ بیان کر دیا تھا۔ یہ خاکہ مذکور بالا کروی شکل کا

اسّی سال بعد دانتے آئندہ زندگی کے متعلق ایک عجیب وغریب شاعرانہ تذکرہ پیش کرتا ہے۔
اس کی مقامیاتی (Topographical) تفصیل اتنی واضح تھی کہ بیسویں صدی میں اس (دانتے)
کے شارحین بآسانی ہندسانہ شکلوں میں اس کی ترسیم کرنے پر قادر ہو گئے اور یہ نقشے فی الحقیقت ان
نقشوں سے بالکل یکسانیت رکھتے ہیں جو ابن عربی نے سات سو برس پہلے مرتب کئے تھے اگر دانتے
کا نقل کرنے غلط ثابت کیا جائے تو اس توارد اور یکسانیت کو یا تو ایک ناقابل حل معمہ قرار دینا پڑیگا،
یا طبعی جدت کا ایک معجزہ۔

(۳) ترتیب کی اس یکسانیت کے علاوہ تزئین میں بھی ایک عجیب وغریب مشابہت ہے، فی الحقیقت
"اعراف" ہی کو (Limbo) کا اور جہنم کو (Inferno) کا "پل صراط" کو (Purgatorio) کا
پل صراط اور دوزخ کے درمیانی میدان کو "دنیاوی جنت" کا اور "آٹھ باغ" کو "خیالی گلاب کے پھول" یا
یا دانتوی جنت کا مترادف سمجھنا چاہیئے

(۴) عمارتی خاکوں میں یکسانیت اور جسمانی یا اخلاقی توازن وتناسب کی خواہش دونوں تذکروں
میں برابر نمایاں ہے، یروشلم ہی وہ محور ہے جس کے اطراف دوسری دنیا گھومتی ہے اس کے نیچے دوزخ ہے،
جس کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ابلیس مقید ہے۔ یروشلم کے بالکل عموداً اوپر جنت ہے جہاں پر خدا اور
خدا کے پسندیدہ بندے رہتے ہیں۔ جنت کے سلسلے میں محلات کی تعداد اور ذیلی تقسیم ویسی ہی ہے جیسی
طبقات جہنم کی اسی وجہ سے دوزخ کا ہر مقام جنت کے مقاموں سے تقابل رکھتا ہے۔

(۵) دونوں کی یکسانیت بہت سی تذکروں اور مناظر تک پھیلتی ہے جن میں سے بعض تو لفظ بلفظ یکساں ہیں
مثلاً (Limbo) کے باشندوں کی تقسیم اور ان کے اخلاقی تکالیف بالکل وہی ہیں جو اعراف کو
کے زانیوں کی سزا کالا کالا طوفان وہی ہے جو قوم عاد کی ہوا ہے۔ لواطت کی سزا میں آگ کی بارش،
نجومیوں کا بطور سزا سر نیچے کر دیا جانا (Caiaphas) کو زمین پر سولی دے کر روندنا چوروں کو
سانپوں کا ڈسنا۔ بدعتیوں کا پیٹ پھول جانا اور ان کے ہاتھ کٹ جانا یا ان کے سر ان کے ہاتھوں
میں بولنا اور جنات کا غیر معمولی قد وقامت رکھنا ـــــ ان سب کا تذکرہ دونوں میں بالکل یکساں ہے۔
برف کے ذریعے سزا پانا (جس کو مسلمان زمہریر کہتے ہیں) غداروں کے لئے مقرر ہے۔

[illegible]

گزرنے والوں کو دھویں کا گھیر لینا اس قرآنی تذکرے سے مشابہ ہے جو روز حساب کے متعلق ہے دنیاوی جنت کی دو ندیوں میں دو دفعہ غسل کرنا اور دانتے کا بتریس سے ملنا اس بات کے مشابہ ہے کہ اسلامی جنت میں ارواح داخل ہوتے وقت دو ندیوں میں غسل کریں گے اور جنتی دلہن (حور) سے ملیں گے۔ تجلی مقدس کا تذکرہ بھی اسی سلسلہ میں پیش ہو سکتا ہے جس سے بیرونی چمک، ذہنی صفائی اور محو کرنے والی مسرت پیدا ہوتی ہے۔

(۶) اگر تعمیر مقامات یعنی ٹوپوگرافی اور ترتیب کی ان یکسانیتوں پر ان امور کا اضافہ کیا جائے جن کا باب اول میں تذکرہ ہوا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اسلام کے مذہبی ادبیات ہی آیندہ زندگی کے متعلق واحد مبحث میں (جس کی معراج کے سلسلہ میں ترقی ہوئی) اور اسی سے متلاشیوں کو دانتے کے خیالات تصاویر، نشانیوں اور تذکروں کے مشابہ امور بہ نسبت ان مذہبی ادبیات کے بہت زیادہ مقدار میں مہیا ہو سکتے ہیں، جس کو دانتو یانیوں نے اب تک مطالعہ کر کے ڈوائن کامیڈی کی پیدائش کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔

(۷) یہاں پر ہمارا مطالعہ ختم ہو جاتا، اگر متلاشی کے دل میں ایک بڑے شبہ کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہوتا۔

دانتے نے اپنی نظم میں جو فن کارانہ ترتیب اور مذہبی و فلسفی تخیل پیدا کیا ہے اس کے متعلق دانتویانی بیان کرتے ہیں کہ انہیں خود شاعر کی جدت پسند طبیعت نے سوچا، البتہ ایک حد تک بعض ان مقبول عام قصوں کی واقفیت نے جو ڈوائن کامیڈی کے شائع ہونے سے پہلے کی صدیوں میں تمام یورپ میں مشہور تھے، اس کے لکھنے میں تحریک کی ہو گی۔ قرون متوسط کے ان قصوں کو اصطلاحی الفاظ میں "ڈوائن کامیڈی کے پیشرو" کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان قصوں میں سے کسی میں بھی ہمیں دانتے کی تصنیف کے متعلق اس قدر کثیر عناصر کی تشریح کرنے والی باتیں نہیں ملتیں جتنی واقعہ معراج میں، اور ان تمام قصوں کا مجموعہ بھی ڈوائن کامیڈی کی ان بہت سی باتوں پر روشنی ڈالنے سے قاصر رہتا ہے، جن پر معراج اور اسلامی ادبیات پوری پوری روشنی ڈال دیتے ہیں۔ نیز ڈوائن کامیڈی اور اس کے پیشروؤں میں مناسبت اتنی خفیف ہے کہ ان میں اصل اور نقل کے تعلقات کا قائم کرنا مشکل ہے۔

ان سب کے باوجود بھی اگر یہ ممکن ہے کہ دانتے کی نظم پر اسلامی اثر کے نظریہ کو نظر انداز کر دیا جائے اور اسی نظریہ کو لیا جائے کہ دانتے کی نظم نے عیسائی ادبیات کی گود میں پرورش پائی ہے اور قرون متوسطہ کے پیشروان ڈوائن کامیڈی میں حشر و نشر کے متعلق جو امور مذکور ہیں ان کی بیجوں سے یہ درخت اگا تو اس نظریہ کو باطل کرنے اور ہمارے خیال کی تائید میں دلائل پیش کرنے کے لئے مزید تلاش ناگزیر ہے۔

ڈوائن کامیڈی کے پیشرو قصوں میں حشر و نشر کے متعلق جو عناصر پائے جاتے ہیں انکی اصلیت دریافت کرنی ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ عیسائی پیداوار ہیں یا خود وہ بھی اسی طرح اسلامی ادبی اجداد رکھتے ہیں جسطرح ڈوائن کامیڈی کے متعلق ہمیں نظر آ رہا ہے۔ .... (باقی)

وجدانیات

از

مولانا احمد حسین امجد حیدرآبادی

نالۂ جانِ خستہ جاں، عرش بریں پہ جائے کیوں؟
میرے لئے زمین پر، صاحب عرش آئے کیوں؟

نورِ زمین و آسماں، دیدہ و دل میں آئے کیوں؟
میرے سیاہ خانے میں کوئی دیا جلائے کیوں؟

دیکھے تجھے جو اک نظر ہوش میں پھر وہ آئے کیوں؟
جس کو ترے قدم ملیں، سجدے سے سر اٹھائے کیوں؟

اس کے نہ یاد کرنے کا شکوہ ہے سر بسر غلط
جو رہے اسکی یاد میں پھر وہ اسے بھلائے کیوں؟

بخشنے والا جب مرا عفو پہ ہے تلا ہوا
مجھ سا گناہ گار پھر جرم سے باز آئے کیوں؟

زیست کے ساتھ ساتھ ہے موت کا ڈر لگا ہوا
جس کا ہو رنگ اڑا ہوا پھر وہ مزے اڑائے کیوں؟

جور و جفائے یار کی کیجئے کیا شکایتیں
عاشقِ عافیت طلب اسکی گلی میں جائے کیوں؟

سیکھو طریقۂ وصال سیدنا حسینؓ سے
ہم نہ اگر گلا کٹائیں کوئی گلے لگائے کیوں؟

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤ؟
نسبتِ ہو کو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ مرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں؟

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیونکر آرزو
دل ہی نہو جب اس کے پاس مطلب دل بر آئے کیوں؟

دست غیب

از

(جناب ام' اسلم صاحب)

ڈاکٹر سے میرے تعلقات بہت دیرینہ تھے۔ وہ ایک بہت شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ گو طبابت اس کا پیشہ نہ تھا تاہم ہم لوگ اسے ڈاکٹر ہی کہا کرتے تھے۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہیں جب ڈاکٹر کے ہاں ملنے جلنے والوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے۔

ڈاکٹر بہت غیور، بڑا اسیر چشم اور پرلے درجے کا فیاض آدمی تھا۔ اس کے ہاں کوئی درجن بھر آدمی مختلف خدمتوں پر مامور تھے لیکن نوکروں کو جھڑکنا یا ناراض ہونا تو اسکے مذہب میں حرام تھا۔ ناداروں اور محتاجوں اور بیماروں کی خدمت تو وہ ان کے گھر جا کر کیا کرتا اور اس طرح مدد کرتا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔

دوست آشنا اکثر اس سے قرض لے جاتے لیکن نہ اسنے کبھی مانگا اور نہ ان خدا کے بندوں نے خود ادا کرنے کا کبھی نام لیا۔ کہتے ہیں کہ اچھے دن ہمیشہ نہیں رہا کرتے۔ جب چرخ ناہنجار نے تیور بدلے تو ڈاکٹر نان و جو کو محتاج ہو گیا۔ لیکن سچ جانئے یہ بھی ان دوستوں کی کرامت تھی جو کبھی دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔

لیکن اس ناگوار سرگذشت کو نہ دہرانا ہی اچھا ہے۔ برے دن آتے ہی یہ لوگ ڈاکٹر سے اس طرح علحدہ ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

لیکن صد آفریں ہے اس مرد خدا پر، نہ کبھی اسنے لب شکوہ وا کیا اور نہ اس کی چتون پر کبھی بل آیا۔ افسوس وہ لوگ جو اس کے قرضدار تھے اس کڑے وقت میں اسکی مدد کرنے کی بجائے اگر اسے دیکھ بھی لیتے تو نظر بچا کر نکل جاتے۔

اب میں خود تلاش کر کے اسے اپنے گھر لے آتا تھا۔ اور جب وہ آجاتا تو پھر بہت دیر تک میرے پاس

اپنے دوست کو خوش کرنے یا اس کے تفکرات کو کم کرنے کی کوشش سے جو خوشی حاصل ہوتی اس سے کچھ فکر بھی ضرور ہوتی اور وہ یہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر میری ان کوششوں کو احسان نہ سمجھتا ہو۔

ایک روز ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ ڈاکٹر باتوں باتوں میں بولا۔

"میں چند روز تک باہر جانے کا ارادہ کر رہا ہوں"

"کہاں جائیں گے آپ"۔ میں نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں جاؤں گا؟ .... اور پھر ہنسکر" یہ تو خود مجھے بھی معلوم نہیں"

یہ کہکر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا:۔

"کیا اچھا ہوتا اگر آپ نے شادی کر لی ہوتی"

"اب ضرور کرونگا" اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے الگ کر کے کہا۔ اور پھر

"میرا ارادہ ہے کہ کل ہی چلا جاؤں"

"لیکن جایئے گا کہاں؟"

"شہر سے باہر"۔

"تو کیا جنگل میں جا کر رہئے گا؟"

"نہیں تو"۔

اتنے میں ایک اور صاحب آ گئے۔ اور یہ گفتگو بند ہو گئی۔

اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شہر سے غائب ہے اور اس کا بوڑھا خادم عیسیٰ بھی اسکے ساتھ ہی چلا گیا ہے۔

عیسےٰ جیسا نمک حلال نوکر شاید ہی اور کوئی ہو۔ جب سب لوگ ڈاکٹر سے علٰحدہ ہو گئے۔ اور تو اور اسکے اپنے عزیز و اقارب بھی اسے ننگِ خاندان کہنے لگے۔ دوستوں کی بے مروتی کی داستان تو آپ سن ہی چکے۔ اس وقت صرف عیسےٰ تھا جو سایہ کی طرح اسکے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا اور ہر ممکن طریق سے خدمت کرتا۔

[illegible]

نہ ہوئی۔ اب اس واقعہ کو ایک سال ہو چکا تھا۔

ایک بار مجھے ساحل سمندر کی طرف سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ماہیگیروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں جو پہاڑ کے دامن میں تھی میرا گذر ہوا۔ اس جگہ ماہی گیروں کے لڑکے سمندر کی خوبصورت کوڑیاں اور مختلف قسم کے گھونگھے وغیرہ بیچتے تھے۔ میں بھی ایک جھونپڑی کے سامنے کھڑا یہ چیزیں خرید رہا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو ڈاکٹر کھڑا مسکرا رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے۔

"آپ یہاں کہاں؟ ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

"قسمت لے آئی"۔

"اور ٹھہرے کہاں؟"

"آج صبح آیا تھا۔ اور آج شام ہی چلے جانے کا ارادہ تھا"

"آیئے گھر چلیں"

بستی سے کوئی دو پونے دو میل کے فاصلہ پر پتھر اور لکڑی کا ایک مکان تھا۔ اسکے چاروں طرف کوئی دو فٹ اونچی دیوار تھی۔ جنوب کی جانب وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ جنکا سلسلہ میلوں تک چلا جاتا ہے۔ اور مشرق کی جانب ایک خونخوار اژدہے کی طرح سمندر پھنکارے مار رہا تھا۔

جب ہم چار دیواری میں داخل ہوئے تو بوڑھا عیسٰے پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھکر بھاگتا ہوا آیا اور ادب سے جھک کر سلام کیا۔

"عیسٰے اچھے تو ہو؟"

"جان ومال کو دعا دیتا ہوں"

"آخر ڈاکٹر کو تم لے ہی بھاگے۔ اور مجھے خبر تک نہ کی"۔

"ان کا حکم"۔ عیسٰے نے اپنے آقا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کے مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک سونے کا۔ ایک کھانے کا۔ ایک کمرہ جس میں ایک عجیب سی

باورچی خانہ اور عیسے کی سکونت کے لئے تھا۔ کھانے کے کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی اور ارد گرد چند کرسیاں تھیں انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ ہم اسی کمرے میں بیٹھ گئے۔

"خوب ملے"۔ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

"یہ تو قسمت تھی جو ملاقات ہوگئی ورنہ آپ نے تو چھپنے میں حد کردی"۔

"سچ پوچھو تو اصل بات یہ ہے"۔ ڈاکٹر سر کھجلاتے ہوئے بولا"۔ اب اس شہر میں میرا رہنا کچھ ٹھیک نہ تھا"۔

"وہ کیسے؟"

"کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مجھے دیکھ کر کھسیانے سے ہو جاتے تھے"

"بلا سے۔ آپ تو کسی کے شرمندۂ احسان نہ تھے"۔

"دوستوں کے احسان کو کون بھول سکتا ہے۔ یہ کیا کم احسان تھا کہ وہ میرے لئے اپنا وقت صرف کرتے تھے"

"لیکن جب آپ کے پاس......."

ڈاکٹر بات کاٹ کر بولا۔

"جب میرے پاس دولت تھی۔ یہی نا؟۔ خدا کی قسم مجھے مفلسی کا نہ افسوس ہے اور نہ غم۔ دولت تو ڈھلتی چھاؤں کا نام ہے۔ لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ روٹی کھانے کو سب چاہتے ہیں........ مجھے صرف اسقدر افسوس ہے کہ میں احباب کی کچھ زیادہ خدمت نہ کرسکا"۔

"معاف فرمائیے۔ وہ احباب بھی کیسے جو مفلسی میں اپنے عزیز کا ساتھ چھوڑ دیں"

ڈاکٹر: "سنئے! اس زمانہ میں قرابتداری اور دوستی کی لوگ پرواہ نہیں کیا کرتے۔ بلکہ جس کے پاس چار پیسے ہونگے سب اسی کے بنیں گے۔ غریب آدمی کو تو ہرگز یہ جتلانا بھی نہیں چاہیئے کہ فلاں فلاں اسکے رشتہ داروں میں سے ہے"

میں: "کہتے تو آپ سچ ہیں۔ خیر چھوڑیئے اس قصے کو۔ کہئے کیسے گذرتی ہے؟"

ڈاکٹر (مسکرا کر) ؎

"اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے۔

میں:۔ "آخر کچھ شغل بھی؟"

"یہ کیڑے مکوڑے دیکھتے ہو۔ بس یہی شغل ہے"

"تو کیا انہیں کھایا کرتے ہیں آپ؟"

"کھاتا تو نہیں۔ بیچتا ہوں۔ ان پہاڑیوں میں ایسے ایسے عجیب حشرات الارض ہیں کہ آپ سے کیا کہوں ایک اخبار کا پرچہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس میں ایک کمپنی کی طرف سے جو کیڑے مکوڑے خریدتی تھی اشتہار تھا۔ میں نے ان سے خط و کتابت کی۔ اللہ نے روزگار کی صورت پیدا کر دی"

"تو گویا آپ سارا دن کیڑے مارتے پھرتے ہیں؟"

"چلو یونہی سہی"۔ ڈاکٹر ہنس کر بولا۔

"اور آپ اس کام کو بہت پسند کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا

"بھئی! روٹی کھانی ہے۔ کافی ٹکے مل جاتے ہیں۔ اور وقت بھی خوب کٹتا ہے"۔ اور پھر "کل ہم نے ایک نہایت خوبصورت گبریلا پکڑا ہے۔ واللہ بالکل سونے کا معلوم ہوتا ہے۔"

"تو لائیے ذرا ہم بھی دیکھیں"

"آپ کل دیکھ سکیں گے۔ ایک شخص مانگ کر لے گیا ہوا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو دکھلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس وقت آپ کو اس کا نقشہ بنا کر دکھلا سکتا ہوں"۔

ڈاکٹر نے جیب میں سے ایک ٹمیالے رنگ کا کاغذ اور پنسل نکال کر ایک کیڑے کی تصویر بنا کر کاغذ میری طرف سرکا دیا اور کہا

"لیجئے دیکھئے گا..... کیوں! ہے نا عجیب چیز؟"

میں اس نقشہ یا تصویر کو کچھ دیر بغور دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر پھر بولا

"کیا خیال ہے آپ کا؟"

"مجھے تو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی۔ ہاں یہ انسان کی کھوپری کا نقشہ بہت خوب ہے"۔

"کیا کہا!" ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "انسان کی کھوپری یہاں کہاں؟"

"خود دیکھ لیجئے"۔ یہ کہکر میں نے کاغذ ڈاکٹر کی طرف سرکا دیا۔

"ڈاکٹر بڑے تعجب سے اس نقشہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ مجھے اونگھ سی آ رہی تھی۔

عیسٰے نے کہا کھانا تیار ہے۔ دو قسم کا کھانا تھا۔ اور خوب مزیدار تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ڈاکٹر ابھی سوتا تھا۔ میں کپڑے پہنکر باہر آیا۔ عیسٰے پھولدانوں کے لئے ادہر ادہر سے پھول فراہم کر رہا تھا۔ مجھے دیکھہ کر بولا۔

"فرمایئے رات کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی"۔

"میں نے تو کروٹ تک نہیں بدلی۔ خدا جانے ڈاکٹر کب آیا تھا"

"کوئی بارہ بجے کے بعد"

"تو کیا ہر روز اتنی دیر سے سوتے ہیں؟"

"نہیں" عیسٰے بولا "کھانا کھانے کے دو گھنٹہ بعد عموماً سو جاتے ہیں"

"اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اور بیلچہ پکڑ کر پھولوں کی کیاریاں درست کرنے لگا۔ میں نے پوچھا "کہیں باہر نہ چلیں گے"

"ضرور" ڈاکٹر بیلچہ سے زمین ہموار کرتے ہوئے بولا "لیکن کھانے کے بعد" اور پھر "ابھی آپ دو چار روز تک واپس نہیں جا سکتے"

"ہاں دو روز تو ضرور ٹھہروں گا"

"دو روز؟ جانے کی بھی کیا جلدی ہے" ڈاکٹر نے پوچھا

"میں آپ کی طرح آزاد تھوڑا ہوں" میں نے سنکر کہا "بیوی بچوں والا ہوں"

کچھ دیر تک اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ لیکن قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کسی گہری سوچ میں ہے۔ چنانچہ کھانے کے بعد میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔ آپ برا تو نہ مانیں گے؟"

"آپ پوچھیں اور میں برا مانوں۔ اچھی رہی"۔

"آپ کچھ فکر مند معلوم ہوتے ہیں؟"

"ہیں۔ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔" میں نے ہنسکر کہا۔
"لیکن آپ نے کیسے جانا؟"
"بس جان لیا۔ آپ کی نگاہوں سے پہچان لیا"
ڈاکٹر کچھ دیر مسکراتا رہا اور پھر بولا۔
"سنئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے دن پلٹنے والے ہیں۔ اور زمانہ آئے گا پہلا پھر ایک بار ابھی۔"
"آمین"
"میں اس وقت آپ سے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن انشا اللہ چند روز تک سب کچھ عرض کردوں گا"
میں چار دن تک ڈاکٹر کے پاس ٹھہرا۔ اور پھر ہم بہت تپاک سے بغلگیر ہوکر ایک دوسرے سے جدا ہوئے رخصت ہونے سے پیشتر میں نے اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ مجھے ہر پندرہ روز بعد خیر خیریت سے مطلع کرتا رہے گا۔

مجھے گھر آئے تقریباً دو مہینے ہونے کو تھے کہ ایک روز صبح صبح عیسٰے آنمودار ہوا۔
"عیسٰے! خیر تو ہے۔ کیسے آئے کب آئے؟" میں نے اسکے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا
"آج رات ہی آیا ہوں" جیب سے ایک خط نکالکر۔ "یہ لیجئے۔"
یہ ڈاکٹر کا خط تھا اسنے لکھا تھا:۔

"میرے دوست!
تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے دن پلٹنے والے ہیں۔
اب آؤ اور دیکھو کہ میری پیشنگوئی کیسے درست نکلتی ہے۔
تاخیر مت کرو اور عیسٰے کے ہمراہ جلدی آجاؤ۔"

میں نے خط جیب میں ڈال لیا۔ اور عیسٰے سے پوچھا
"کب چلو گے؟"
"میں تو آپ کے حکم کا منتظر ہوں"
"[illegible]"

ڈاکٹر مجھکو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے پوچھا۔

"کہئے وہ سنہری کیڑا کے دام میں فروخت ہوا؟"

"ذرا صبر کیجئے۔"

"آپ کس خبط میں پڑے ہیں۔ وطن کو چلئے۔"

"ہاں ہاں وطن چلوں گا تو ضرور۔ لیکن میری واپسی لوگوں کے لئے طلسم ہوش ربا سے کم نہ ہوگی" کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی کوفت کے باعث مجھے سرشام ہی نیند آنے لگی۔ چنانچہ کھانے کے تھوڑی دیر بعد میں سو رہا۔

اگلے روز جب ہم چائے پی کر فارغ ہوئے تو ڈاکٹر مجھے ساحل سمندر کی طرف لے گیا۔ ہم دونوں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اس وقت سمندر کا نظارہ بہت دل آویز تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی سیمابی لہریں رقص کرتی نظر آتیں۔ اور دوسری جانب پہاڑوں کی بے برگ و گیاہ چوٹیاں سونے کی ڈلیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ماہی گیروں کی کشتیاں دور تک بندھی ہوئی تھیں اور ہوا اور لہروں کے تھپیڑوں سے ہچکولے کھا رہی تھیں۔

"آپ نے میرا خط تو پڑھ لیا ہوگا۔" ڈاکٹر نے اپنی لاٹھی سے کنکریوں اور سنگریزوں کو ادھر ادھر بکھیرتے ہوئے پوچھا

"ہاں پڑھ لیا تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو سمجھا خاک بھی نہیں۔"

"آج شب آپ سب کچھ سمجھ لیں گے۔"

"آج شب؟" میں نے ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"ہاں آج شب" اور پھر۔ دو ماہ کی تگ و دو کا حاصل آج معلوم ہو جائے گا۔"

"تو کیا کوئی لہر ساحل پر خزانہ اگل دیگی۔" میں نے ہنسکر کہا

"لہر تو نہیں۔ لیکن زمین ضرور اگلے گی"

ہم بہت دیر یوں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر گھر آکر کھانا کھایا۔ ڈاکٹر آج کچھ خاموش سا نظر آتا تھا۔ وہ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی باغ میں جا کر ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیتا۔

جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو عیسےٰ تین بیلچے۔ ایک ہتھوڑا۔ دو لالٹینیں۔ کمرے میں لایا۔ ڈاکٹر نے میز میں سے ایک پتلی رسی اور وہی سنہری کیڑا نکال کر جیب میں ڈال لیا

"اب کہاں چلنے کی تیاری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صبر کیجئے آپ کو ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ یہ ایک بیلچہ اٹھا لیجئے" اور پھر عیسےٰ سے۔

"دروازے بند کر کے قفل لگا دو۔ اور تم بھی ایک بیلچہ اور ایک لالٹین اٹھا لو۔"

جب ہم گھر سے نکلے تو رات بالکل تاریک تھی۔ گرد و پیش کے مناظر پر خاموشی طاری تھی۔ اور دور فاصلہ پر بحرِ ذخار ایک خونخوار اژدہے کی طرح پھنکارے مار رہا تھا۔

راستہ بہت بیڈھب تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی۔ عیسےٰ نے پوچھا۔

"لالٹین روشن کر لوں"؟

ڈاکٹر: "ہاں ایک لالٹین روشن کر لو۔ لیکن روشنی کم رہے"

کچھ دیر یونہی اندھیرے میں چلنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بہت گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا

"کیا اچھا ہوتا جو صبح یہاں آتے"

"آپ گھبرائیں نہیں۔ اب ہم جنگل میں پہنچ چکے ہیں۔ کوئی گھنٹہ بھر میں منزلِ مقصود تک بھی پہنچ جائیں گے"

اسی طرح جنگل میں چلتے چلتے ہم شاہ بلوط کے ایک عظیم الشان درخت کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت چاندنی بلوط کے پتوں میں سے چھن رہی تھی۔ ڈاکٹر اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ہم بھی بیٹھ گئے۔ عیسےٰ نے دوسری لالٹین بھی روشن کر دی۔ ڈاکٹر بولا۔

"عیسےٰ! تمہیں اس درخت پر چڑھنا ہو گا۔"

عیسےٰ حیران ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا

"آپ بھی غضب کرتے ہیں اس وقت اس درخت پر کون چڑھے گا"؟

"عیسےٰ۔ اور کون"؟ اور پھر عیسےٰ سے "چلو جلدی کرو۔ ایک لالٹین کمر کے ساتھ باندھ لو"

چڑھنے لگا۔

"ذرا رکنا" ڈاکٹر بولا۔ اور پھر جیب سے رسی اور وہی کپڑا نکالا۔ اور اس کو رسی کے ساتھ باندھکر

"یہ لو۔ اسے بھی ساتھ لیتے جاؤ"

"کیا کیا پکڑوں" عیسے بولا

"اور سنو"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "جب ایک شاخ پر قدم رکھو تو اونچے سے ایک کہو۔ سن لیا تم نے"

عیسے بولا

"اور پھر جب دوسری پر قدم رکھوں تو پھر ایک کہوں"

ڈاکٹر: "نہیں پھر دو کہنا۔ اور اسی طرح گنتے جانا۔ چلو جلدی کرو"

عیسے: "جسقدر شاخیں ملیں سب گنتا جاؤں"

ڈاکٹر: "ابے نہیں۔ بائیں ہاتھ کی طرف جسقدر موٹی شاخیں ہیں"

عیسے غریب درخت پر چڑھتا جاتا تھا اور ایک۔ دو۔ تین کہتا جاتا تھا۔ اسی طرح اس نے جب سات کہا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ٹھیک تو گنی ہیں۔ غلطی تو نہیں کی؟"

"گنی تو ٹھیک ہی ہیں۔ اب نیچے آجاؤں؟"

"نہیں۔ اس ساتویں شاخ پر دونوں ٹانگیں ادہر ادہر لٹکا کر گھوڑے کی طرح سوار ہو جاؤ"۔

عیسے: "لیجیے سوار ہو گیا۔ . . . . . . آج بچتا نظر نہیں آتا"۔

ڈاکٹر: "اب آگے سرکنا شروع کرو"۔ . . . . . اور پھر تھوڑی دیر بعد "کیا مر گئے تم؟"

عیسے: "اجی ابھی نہیں۔ بلکہ مرنے کی کوشش کر رہا ہوں"

یہ سنکر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

عیسے پھر بولا

"یہ شاخ تو اب بہت لچکنے لگی۔ نیچے آجاؤں اب"

"آگے بڑھے جاؤ . . . . . بڑھے جاؤ . . . . . سنتے ہو تم"

ڈاکٹر نے پوچھا

"کیا ہوا۔ کیا ہے۔ بولو بولو"

"اجی جناب۔ یہاں تو انسان کی کھوپری پڑی ہے"

"انسان کی کھوپری!" ہم دونوں نے ایکبارگی پوچھا

"ہاں جناب۔ کھوپری۔ شاخ کے ساتھ میخوں سے جڑی ہے۔ لیجئے اب میں نیچے آیا۔"

"خاموش بیٹھے رہو" ڈاکٹر ڈانٹ کر بولا۔ "اب وہی کیڑا اس کھوپری کی بائیں آنکھ کے سوراخ میں سے نیچے لٹکادو"

عیسے رسی لٹکا کر بولا۔

"اب چھوڑدوں"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "ابھی نہیں"

"تو کیا آج رات میں درخت پر ہی رہوں گا"

ڈاکٹر "آہستہ آہستہ رسی نیچے آنے دو...... ٹھیک ذرا اور۔ تھوڑا اور..... بس چھوڑ دو۔ نیچے آجاؤ"

جس جگہ وہ کیڑا زمین سے چھو رہا تھا ڈاکٹر نے مشرق کی جانب مونہ کر کے بیس قدم جگہ ماپی اور ہم سے کہا کہ اب آؤ اس جگہ کو کھودیں۔ ہم تینوں بیلچے پکڑ کر زمین کھودنے لگے۔ کوئی پانچ سات ہاتھ کی گہرائی پر انسان کی ہڈیاں برآمد ہوئی۔ صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ دو آدمیوں کی لاشیں تھیں ہم نے ان کو گڑھے سے باہر نکال کر ایک طرف رکھدیا اور پھر کھودنا شروع کیا۔ اچانک میرا بیلچہ کسی آہنی چیز میں اٹک کر رہ گیا۔ اور پھر ساتھ ہی ڈاکٹر اور عیسے کے بیلچے بھی کسی آہنی چیز پر لگے۔ ہم نے بیلچے چھوڑ کر ہاتھوں سے جگہ صاف کی تو ایک لوہے کا صندوق زمین میں گڑا ہوا نظر آیا۔

اس وقت جو ہم لوگوں کی حالت تھی وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ہم تینوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس صندوق کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر اسے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن یہ بہت بھاری

پورے آدھ گھنٹہ کی لگاتار کشمکش کے بعد ہم صندوق کا ڈھکنا اٹھا سکے۔ یہ صندوق قیمتی جواہرات۔ زیورات اور سونے کی سلاخوں سے لبریز تھا۔ سیم وزر کی چمک سے ہماری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ میں ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔
"مبارک ہو۔ آخر آپ کی نیکیاں پھل لائیں"
اور عیسٰے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔
"شکر ہے۔ میرے اللہ تیرا ہزار ہزار بار شکر ہے"۔ اور پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھکر "یہ خانہ زاد بھی مبارک عرض کرتا ہے"
ڈاکٹر کی پیشانی پسینہ سے تربہ تر تھی۔ خوشی سے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ گرمجوشی سے مجھ سے بغلگیر ہوا اور پھر عیسٰے کو بھی گلے لگایا اور کہا
"آپ دونوں مجھے دیوانہ سمجھتے ہونگے...... خیر فرمائیے اب اسے گھر کیسے لیجائیں"
کچھ دیکے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ عیسٰے تو صندوق کے پاس بیٹھے اور ہم گھر سے تھیلیاں وغیرہ جو کچھ بھی ملے لے آئیں۔
الغرض نصف شب گذر جانے کے بعد ہم نے سب زروجواہر صندوق سے نکال کر تھیلیوں میں ڈال لیا۔ اور پھر خالی صندوق اور لاشیں اسی جگہ دبا دیں۔ اور تھیلے اٹھا کر گھر کی راہ لی۔
جب ہم جنگل سے نکل کر گھر کے قریب پہنچے اس وقت دور مشرق کی جانب آسمان پر ہلکی ہلکی سی سپیدی نمودار ہورہی تھی۔ کسی کسی پیڑ پر سے پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ اور ستاروں کا قافلہ صبح کی منزل کی جانب رواں ہو چکا تھا۔ بحر زخار اسی طرح پھنکارے مار رہا تھا اور بستی کی جانب سے مرغِ سحر سونے والوں کو گرم تقاضا ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔

اگلے روز ہم بہت دیر سے اٹھے۔ جب نہا دھو کر کھانا وغیرہ کھا چکے تو میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔
"لیکن یہ تو بتلائیے آپ کو اس کا علم کیسے ہوا؟"
ڈاکٹر نے "سنئے! ایک روز میں اور عیسٰے ساحل سمندر کی جانب چٹانوں میں کیڑے مکوڑے تلاش کر رہے تھے

نکال کر اس میں اسے پیسٹ کر کے مجھے دید یا۔ آپ کو یاد بھی ہوگا دبی ٹیاہے رنگ کا کاغذ جس پر اس رات میں نے آپ کو کیڑے کا نقشہ بنا کر دکھلایا تھا۔"

"ہاں ہاں مجھے خوب یاد ہے۔"

"تو بس اس خزانہ کا اصلی ذریعہ آپ تھے یا وہ کاغذ تھا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ڈاکٹر: "آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے میرے استفسار پر کہا تھا کہ کیڑا کا نقشہ تو نہیں بلکہ انسان کی کھوپری کا نقشہ بہت خوب ہے"

میں: "ہاں میں نے کہا تھا۔"

ڈاکٹر: آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ لکھنے کے ایسے رنگ بھی ایجاد ہو چکے ہیں۔ کہ جب تک کاغذ کو آگ نہ دکھائی جائے کوئی حرف نظر نہیں آتا۔ اس روز آپ تو بس اتنا کہہ کر کہ یہ انسان کی کھوپری کا نقشہ خوب ہے۔ سو گئے۔ لیکن میں یہ سوچتا رہا کہ کاغذ پر انسان کی کھوپری کا نقشہ بنایا کس نے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ آپ اس وقت انگیٹھی کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے کاغذ آگ کے پاس لے جا کر جو اسے سینک پہنچایا تو اس پر مختلف ہندسے نمودار ہو گئے۔ اب میں ان ہندسوں کے حل کی کوشش کرنے لگا۔ اور مختلف طریق سے حروف بنانے لگا۔ آخر کچھ اوپر ڈیڑھ ماہ کی لگاتار کوشش کے بعد میں نے یہ حروف بنا ہی لئے۔

(۱) ش۔ ن۔ ط۔ ا۔ ی۔ س۔ ر۔ ک۔ ی۔

(۲) پ۔ ڑ۔ ہ۔ ا۔ ی۔

(۳) د۔ ب۔ ر۔ و۔ ی۔ ن۔

(۴) ش۔ ل۔ م۔ ا۔

(۵) ج۔ گ۔ ل۔ ن۔

(۶) ا۔ چ۔ و۔ ا۔ ن۔ خ۔ د۔ ت۔ ر۔

(۷) س۔ و۔ ت۔ ی۔ ا۔ ن۔ ا۔ خ۔ ش۔

(۸) ک۔ ھ۔ و۔ ر۔ پ۔ ی۔

(۱۰) س ۔ خ ۔ ا ۔ و ۔ ر ۔

(۱۱) ر ۔ ی ۔ س ۔

(۱۲) م ۔ ق ۔ ر ۔ ش ۔

(۱۳) ب ۔ س ۔ ی ۔ د ۔ ت ۔ ہ ۔ ا ۔

(۱۴) گ ۔ ا ۔ ہ ۔ ڑ ۔

جب یہ حروف بن گئے تو پھر میں ان کے الفاظ بنانے کی طرف متوجہ ہوا۔ آخر یہ الفاظ بنائے :۔

(۱) شیطان ۔ کرسی ۔

(۲) پہاڑی ۔

(۳) دُوربین ۔

(۴) شمال

(۵) جنگل ۔

(۶) اونچا درخت ۔

(۷) ساتویں شاخ ۔

(۸) کھوپری ۔

(۹) بائیں آنکھ ۔

(۱۰) سوراخ ۔

(۱۱) رسّی ۔

(۱۲) مشرق ۔

(۱۳) بیس ہاتھ ۔

(۱۴) گڑھا ۔

جب یہ الفاظ بن چکے تو پھر میں نے ضروری الفاظ کا اضافہ کر کے ایک اس قسم کی عبارت بنا لی۔
"شیطان کی کرسی والی" پہاڑی "پر بیٹھو۔ اور "دوربین" سے "شمال" کی طرف دیکھو۔ "جنگل" میں جو سب سے "اونچا درخت" ہو۔ اسکی "ساتویں شاخ" پر "کھوپڑی" ہے۔ اس کی "بائیں آنکھ" کے "سوراخ" میں سے "رسی" لٹکاؤ۔ "مشرق" کی سمت "بیس ہاتھ" چھوڑکر "گڑھا کھودو"۔

میں نے کہا
"ڈاکٹر صاحب! واللہ آپ نے تو کمال کر دیا۔
"خیر جو کچھ بھی آپ سمجھیں۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ شیطان کی کرسی کا پتہ کیسے لگے۔ جس کسی سے بھی میں پوچھتا وہ ہنسنے لگتا۔ میں سارا سارا دن ان پہاڑیوں کے آس پاس گھومتا رہتا۔ ایک روز مجھے بستی سے کچھ دور جانے کا اتفاق ہوا۔ رات میں ایک بوڑھے ماہی گیر کا مہمان ہوا۔ باتوں باتوں میں میں نے جو شیطان کی کرسی کا ذکر کیا تو بوڑھا بولا کہ وہ جو سمندر کی طرف دو آگے کو بڑھی ہوئی کالے رنگ کی چٹانیں ہیں انہی کو شیطان کی کرسی کہتے ہیں۔ لیکن جب میں نے اسکی وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہ بتلا سکا۔ اور صرف اسقدر کہا کہ شاید یہ نام اس لئے مشہور ہو گیا ہے کہ کوئی شخص ان چٹانوں تک جا نہیں سکتا۔

میرے لئے یہی کافی تھا۔ واپس آکر میں ان کالے رنگ کی چٹانوں کی تلاش کرنے لگا۔ اور آخر میں نے انہیں پالیا اور پھر دوربین لیکر بڑی مشکل سے اوپر چڑھ گیا۔ ان دو سیاہ چٹانوں کے درمیان ایک صاف سا پتھر تھا۔ اور یہ جگہ پاس سے بالکل ایک کرسی کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اس پتھر پر بیٹھ کر میں دوربین لے کر شمال کی جانب دیکھنے لگا۔ کوئی میل بھر کے فاصلہ پر بلوط کا ایک عظیم الشان درخت نظر آیا۔ جنگل میں اس بلوط کے سوا اور کوئی بلوط کا درخت نہ تھا۔ جب میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تو پھر بصد مشکل میں اس چٹان سے نیچے اترا اور جنگل میں پہنچ کر اس درخت پر چاقو سے ایک نشان لگا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو معلوم ہے۔ لیجئے یہ ہے کل داستان"

میں نے پوچھا

"لیکن وہ دونوں لاشیں کہاں سے آئیں"

ڈاکٹر "میرا خیال ہے کہ جس کسی نے بھی یہ خزانہ یہاں دفن کیا ہوگا ان دونوں سے ضرور مدد لی ہوگی اور پھر اس خیال سے کہ کیا یہ کبھی آکر چرا کر نہ لے جائیں اسنے اپنی کسی ترکیب سے اس جگہ قتل کرکے خزانہ کے اوپر ہی دفن کر دیا ہوگا"۔

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"میرے دوست! دست غیب نے تمہاری راہبری کی ہے۔ یہ دولت تمہیں مبارک ہو"۔

چار مینار

از

جناب ابو الافتخار فخر حیدرآبادی

ای گلستانِ دکن کے سروِ آزاد خزاں
ای قدیم آثار کی تاریخ کے روحِ رواں

رو کشِ اہرامِ مصری تیرا ہر مینار ہے
تیرے آگے سرنگوں گردوں نما کہسار ہے

جب ہمالہ کا فصیلِ ہند موزوں ہے لقب
نردبانِ بامِ گردوں کیوں کہیں تجھکو نہ سب

ہے ہر اک مینار تیرا سقفِ گردوں کا ستوں
یا کہیں شاخِ سرِ گاوِ زمیں ان کو کہوں

کیا کہوں میں تجھکو تو کیا ہے تری کیا شان ہے
سرزمینِ حیدرآبادِ دکن کی جان ہے

ہیں عمارات اور بھی یوں تو دکن میں بیشمار
شان ہے کچھ اور تیری اور ہی کچھ ہے وقار

سکۂ شاہی پہ تیرا نقش کندہ ہو گیا
دل سے عظمت کا تری ہر ایک بندہ ہو گیا

دھوم میں لہرا رہا ہے تیری شہرت کا نشاں
لیتے ہیں تصویریں آ آ کر حسینانِ جہاں

تو ہے قلبِ شہر میں گلدستۂ بزمِ نشاط
تیرا چوراہا ہے گویا تیری عظمت کی بساط

قطب شاہی عہد کی عظمت کی تو تصویر ہے

چارمینار حیدرآباد
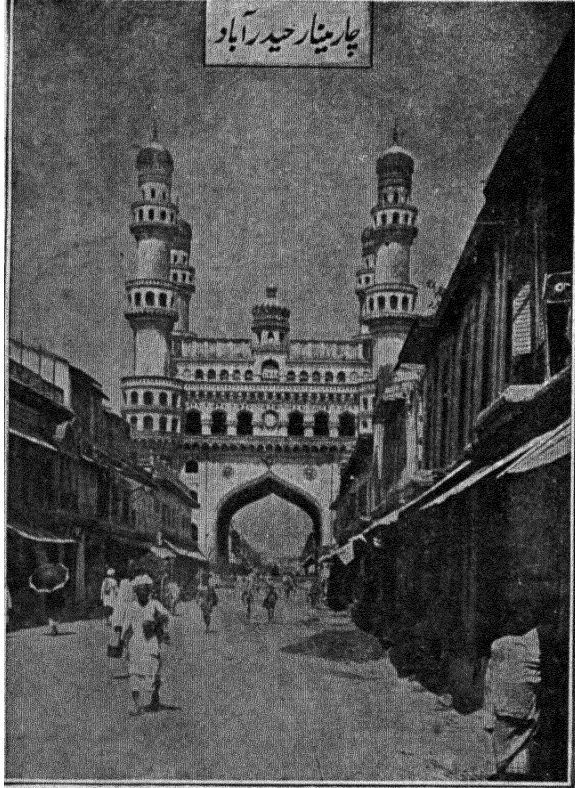
دنیا کی قدیم ترین جامعہ

از

جناب ڈاکٹر محمد عبد الحق صاحب

ڈی۔ایس۔سی (پیرس) اے۔انسٹی ٹیوٹ۔پی (لندن) ڈی الیفاٹ

روم کے بادشاہوں نے یورپ میں عظیم الشان جامعات کی بنیاد رکھی جن میں قسطنطنیہ، اسکندریہ، مارسیلز، اپالونیا اور روم کی نام آور درسگاہیں قابل ذکر ہیں، مگر یہ یاد رہے کہ ان جامعات کا اثر ان مدارس پر بہت کم ہوا جو پادریوں کی نگرانی میں پاپا نے مختلف گرجاؤں میں جاری کر رکھے تھے۔ ان مدارس میں سب سے زیادہ مشہور مدرسہ جامعۂ پیرس تھا۔ ۱۱۶۹ء میں یہ مدرسہ جاری کیا گیا مگر قلیل مدت گذرنے کے بعد اخلاق، حکمت، قانون وغیرہ کے شعبات بھی شامل کر کے اسکو جامعہ بنا دیا گیا۔ تیرھویں صدی کے اخیر میں پاپا نکلس نے اسکو ایک فرمان عطا فرمایا جس کی رو سے صدر جامعۂ پیرس کو یہ اجازت دی گئی کہ فارغ التحصیل طلبا کو معلم بننے کا ڈپلومہ عطا کرے، اس امتیاز کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپ میں یکے بعد دیگرے کئی جامعات معرض ہستی میں آئیں، چارلس چہارم نے ۱۳۴۸ء میں پراگ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، ۱۳۶۵ء میں وینا (Vienna)، ۱۳۶۸ء میں ہائیڈل برگ (Heidelberg.)، ۱۳۸۸ء میں کولون (Cologne)۔ ۱۳۲۳ء میں اورفورٹ (Erfurt)، ۱۴۰۹ء میں لیپزگ (Leipzig) ۱۴۱۹ء میں روستاک (Rostock) وغیرہ یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں تیرھویں صدی میں اور بعض اسکاٹستان کی مشہور یونیورسٹیاں پندرھویں صدی میں قائم ہوئیں۔

اس مضمون سے یہ مراد نہیں کہ میں جامعات کی تاریخ لکھوں بلکہ میں نے مندرجۂ بالا عنین اس لئے

دنیائے علم وفضیلت کے لئے سرانجام دیں۔ اسلام نے علم وہنر کے تاج میں گراں بہا موتی ٹانکے جو ایک ایک کر کے خاک میں مل گئے مگر جامعہ الازہر (قاہرہ)........

مشتے نمونہ از خروارے ایک یادگار باقی ہے جس کی آب وتاب ہنوز قائم ہے۔ محفل سرد ہو گئی، پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے مگر اب تک صبح کے ستارے رات کی ہنگامہ آرائی سے دریائے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

مسیح کی پیشگوئی تھی "اندھیرے میں چلنے والے لوگ ایک روشنی دیکھیں گے، اور وہ روشنی موت کے راہیوں پر اپنا پرتو ڈالیگی" یہ کہا حرف بحرف پورا ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب پر کالی رات چھائی ہوئی تھی۔ عامۃ الناس کے اخلاق قبیح اور افعال شنیع تھے، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، عورت کی کوئی وقعت نہ تھی، ہر شخص ہر ایک کام اپنی رائے کے مطابق انجام دیتا تھا، جہالت کی انتہا ہو چکی تھی۔ ایسے وقتوں میں ایک دو جہاں کا سراج پیدا ہوا جسکے یمنِ قدوم سے شبِ سیاہ روزِ روشن سے بدل گئی، وہ سراج محمدؐ تھا۔

آنحضرتؐ خود تعلیم کی برکات سے بہرہ اندوز نہ ہوئے تھے مگر آپ کو علم وحکمت وسائنس سے دلی محبت تھی چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "عالم کی سیاہی شہید کے خون سے اولیٰ ہے" یا "علم کی تلاش کرو۔ چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" یا "جو وطن مالوف علم کی تلاش میں چھوڑتا ہے وہ خدا کا مجاہد ہے" اسی قسم کے اور بہت اقوال اُن کی علم پرستی کے شاہد ہیں، مثلاً آپ نے ارشاد فرمایا "علم حاصل کرو کیونکہ جو شخص علم کو خدا کے لئے حاصل کرتا ہے۔ وہ جزائے خیر کا مستحق ہوتا ہے۔ جو علم کی باتیں کرتا ہے وہ خدا کی تعریف کرتا ہے، جو تعلیم دیتا ہے وہ خیرات تقسیم کرنے کا ثواب پاتا ہے، اور خدا کے نزدیک متقی قرار دیا جاتا ہے۔ انسان علم کی بدولت نفی واثبات میں تمیز کر سکتا ہے، علم بہشت کے راستے میں چراغ صحرا میں غمخوار، تنہائی میں مونس، صحبت یاراں میں ہمارا زیور ہے، اعدا کی مخالفتوں سے بچانے کے لئے یہ سپر کا کام دیتا ہے، علم کی بدولت انسان نجابت پاتا ہے، جس کو علم ممتاز کرے بادشاہ اُسے اپنے قریب بٹھاتے ہیں" رسولِ خداؐ نے یہ بھی کہا ہے "علم کی عزت سب عزتوں سے برتر ہے، وہ جو علم کی عزت کرتا ہے۔ میری عزت کرتا ہے۔ جو علم کی توسیع میں کوشاں رہتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا"۔

آنحضرتؐ کی شیفتگی علم ہی کا نتیجہ تھا کہ خود اُن کی حیات میں حضرت علی کرم اللہ وجہ مختلف مضامین پر خطبہ فرمایا کرتے، آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ، اُن کے چچا زاد بھائی،

حضرت ابن عباس اور دوسرے ممتاز صحابہ نے علم عروض، علم نحو، تاریخ اور حساب کے دروس جاری
کئے جسمیں کثیر التعداد شائقینِ علم حاضر رہتے تھے، جب اسلامی سلطنت کو وسعت ہوی تو انہوں نے
بغداد، سالرمو، قرطبہ، اور قاہرہ میں رفیع الشان جامعات کی بنیاد رکھی جہاں عالم کے جملہ اطراف
واکناف سے طلباء جوق جوق آتے تھے، اور علم کے پھولوں سے جھولیاں بھر بھر کرلے جاتے تھے، یہاں
اُن تمام عدیم المثال درسگاہوں کا ذکر مقصود نہیں جن کی مدح میں انوری اور دوسرے شعراء
رطب اللسان ہیں۔ ہم صرف جامعہ ازہر کے حالات مختصر طور پر قلمبند کریں گے۔ جو ناظرین کے لئے
خالی از دلچسپی نہیں ہو سکتے۔

۶۴۱ء میں خلیفہ عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عمرو بن العاص نے قاہرہ کو فتح کیا جسکو اسوقت
نو بابلون (New Babylon.) کہا جاتا تھا، اس فتح کے بعد جرنیل عمروؓ بن العاصؓ اسکندریہ کا
رخ کیا۔ راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ جب وہاں سے جانے لگے اور خیموں کے اکھاڑنے کا حکم دیا گیا
تو چوبدار نے حضور میں عرض کی کہ جرنیلی خیمہ میں ایک کبوتر نے آشیاں بنا لیا ہے، اسپر رحمدل سپہ سالار
نے حکم دیا کہ خیمہ (فسطاط) کو ویسے ہی کھڑا رہنے دیا جائے، فتح اسکندریہ کے بعد جب اسلامی لشکر واپس
لوٹا تو خیمہ وہیں موجود تھا، عمرو بن العاص نے اس واقعہ کی یاد میں وہاں شہر آباد کیا اور اُس کا نام
فسطاط رکھا، بعد میں اسکو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔

۹۶۹ء میں ابو محمد عبد اللہ کے پوتے المعز نے فسطاط کو فتح کیا اور مصر میں فاطمیہ خاندان کی بنیاد
رکھی، سارا ملک اسکے سامنے سرنگوں ہوا اور المعز نے اپنی فتح مندی کے شکریہ میں قاہرہ کا شہر آباد کیا،
۹۷۳ء میں جامعۂ ازہر کی بنیاد رکھی اور کئی مدارس اور پبلک لائبریریاں بنوائیں، ان مدارس میں
طلباء علم النحو، حدیث، فقہ، حساب، تاریخ، حکمت، علم النجوم وغیرہ کی تعلیم پاتے تھے، خلیفہ عزیز باللہ
ابن المعز نے اپنے وزیر ابو الفاروق یعقوبی کی رائے سے ان مدارس کو ملحق کرکے جامعہ کی شکل میں تبدیل
کردیا۔ سلطان خالسوہ الغوری کی عنایاتِ خسروانہ سے جامعہ کے مدارس اور لائبریریوں میں اضافہ
ہوا اور مختلف ممالک کے طلبہ کے لئے رہائش کے کمرے بنوائے گئے، اس کے بعد خدیو سعید پاشا
(۱۸۶۳-۱۸۰۴) اور خدیو اسمٰعیل پاشا (۱۸۷۹-۱۸۹۹) نے جامعہ کی عمارات اور مالی حالت میں
قابلِ قدر اضافہ [illegible]

جامعہ ازہر ایک عظیم الشان عمارت ہے، اسکے مغرب میں باب المزین ہے یعنی حجام کا دروازہ۔ زمانۂ قدیم میں طلبا اسجگہ سر منڈایا کرتے تھے، جامعہ کے مشرق میں مسجد طبرسیہ واقع ہے جس کی خوبصورت محراب ۱۳۱۰ء میں تعمیر ہوئی، عمارت کے عین وسط میں صحن ہے، جو بعض مغربی کالجوں کے صحن (Quadrangle) کے مشابہ ہے صحن کے چاروں طرف برآمدے ہیں، جہاں طلبا کے قیام کے لئے کمرے بنے ہوئے ہیں، جامعہ کا بڑا ہال رقبہ میں ۳۶۰۰ مربع گز سے کم نہیں جسمیں ۱۴۰ استون قائم ہیں، عمارت کا باقی حصہ بڑے بڑے کمروں میں منقسم ہے، ہر کمرہ خاص ملک کے طلبا کے لئے مخصوص ہے، مصری اور سوڈانی طلبا بہ تعداد کثیر ہوتے ہیں۔ اسلئے زیادہ حصہ انہی کے لئے مخصوص ہوتا ہے، انگریزی تسلط سے قبل جامعہ میں آٹھ ہزار طلبا، ۱۸۰ پروفیسروں کے زیر اثر تعلیم پاتے تھے دوران تسلط میں تعداد کم ہوگئی تھی مگر حصول آزادی کے بعد طلبا کی تعداد ۵۰۰۰ تک پہونچ چکی ہے، دنیا بھر کی کسی اور یونیورسٹی میں اسقدر طلبا یا پروفیسر موجود نہیں لہذا جامعہ ازہر کو سب سے بڑی اور قدیم ترین جامعہ کہلانے کا حق حاصل ہے، مصری، ہندوستانی، افغان، ایرانی، ترک، تاتاری، مراکوی، جنوب افریقی، عرب، الغرض جملہ ممالک اسلامی کے طلبا اس جگہ تحصیل علوم کے لئے آتے ہیں، اور مساوات، حریت، اور آزادی سے بسر کرتے ہیں۔

عمومی نصاب تین سال میں ختم ہو جاتا ہے۔ مگر بعض طلبا چار سے چھ سال کے بعد فارغ التحصیل ہوتے ہیں، اندھوں کی تعلیم کے لئے خصوصی انتظام ہے، اکثر طلبا جن کی مادری زبان عربی نہیں ہوتی، اپنی تعلیم علم النحو سے شروع کرتے ہیں، اس کے بعد علم الکلام، الہیات کی تعلیم جس میں خدا کے مندرجہ ذیل صفات کی تشریح کی جاتی ہے۔ (۱) وجود (۲) اصل (دنیا کی پیدائش کی وجہ) (۳) عبودیت وازلیت (۴) استقلال (۵) توحید (۶) قدرت (۷) ارادت اللہ تعالیٰ (۸) علم الغیب (۹) حیات (۱۰) بصر جس کی وجہ سے خدا دیکھتا ہے (۱۱) سمیع۔ سننے کی صفت (۱۲) لسان۔ بولنے کی صفت، ہوتی ہے۔

مذہبی تعلیم مندرجہ ذیل عنوان سے دی جاتی ہے۔

(۱) توحید (۲) صلوٰۃ وطہارت (۳) صدقہ وزکوٰۃ (۴) صوم (۵) حج

دوسرے درجہ کی تعلیم مندرجہ ذیل عنوان سے دی جاتی ہے۔

اسکے بعد طالب علم کو اسلامی قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ عدل و انصاف کا عادی ہوجائے
ان علوم کے علاوہ حساب، علم النجوم، سائنس وغیرہ پر اعلیٰ درس دئے جاتے ہیں۔ اور تجویز ہورہی ہے کہ
یہاں وہ جملہ علوم داخل کئے جائیں جو مغربی یونیورسٹیوں میں جاری ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے پروفیسروں اور
شیوخ کی تنخواہ مقرر نہ تھی اور وہ فرصت کے وقت طلبا کو پڑھاکر یا دوسرے فرائض مذہبی کی ادائی
سے گذارہ کرتے تھے، بعض اوقات کوئی صاحب ثروت عطیہ عنایت کرتا جو شیوخ میں تقسیم ہوجاتا تھا
مگر اب مصری حکومت نے ایک کثیر رقم سالانہ وظیفہ مقرر کر دی ہے جو پروفیسروں کی تنخواہوں اور لوازمات
کے لئے کافی ہوتی ہے الشیخ جامعہ کی سالانہ تنخواہ ۱۴۰۰۰ روپیہ مقرر ہے۔

یہ ہے جامعۂ ازہر جس پر ہر مصری مسلمان فخر کرتا ہے۔ مصر میں جا بجا حقیقی درسگاہیں، انجنیری کلب،
دستکاریوں کے کالج، زراعتی کالج، ریشم سازی کے کالج، تجارتی کالج، قائم ہوچکے ہیں، جہاں ٹکنیکل،
برقی قوت، کان کنی، ریلوے و جہاز رانی، انجنیری، نورباتی، علم معدنیات، وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے
تاہم ہر مصری مسلمان جامعۂ ازہر کو مایہ ناز تصور کرتا ہے۔ خدائے عالم اس اسلامی یادگار کو تا ابد قائم رکھے ؎

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مبادی نفسیات

مرتبہ شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی۔ اے

یہ اردو میں نفسیات پر نہایت معقول اور محققانہ تالیف ہے انگریزی میں اس مضمون کی
جو معرکتہ الآرا کتابیں ہیں ان کا مطالعہ اور باہمی مقابلہ کرکے مؤلف نے سلیس اردو میں یہ مجموعہ مرتب
کیا ہے جو نفسیات جیسے دلچسپ اور کارآمد مضمون پر اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ثابت ہوگی۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ

معذرت

از

جناب جوش ملیح آبادی

ہنسا میں اور زمانے کی خوشی کا چڑھ گیا پارا

معاً دنیا نے میرے قہقہے پر قہقہہ مارا

مگر کھینچی جب آہِ سردِ قلبِ ناشکیبا نے

تو غمخواری کجا مڑ کر نہ دیکھا مجھ کو دنیا نے

کہا میں نے کہ اے وہ زلف جو برہم نہیں ہوتی

شریکِ عیش ہوتی ہے، شریکِ غم نہیں ہوتی

یہ سنتے ہی کہا دنیا نے یہ نیچی نگاہوں سے

کہ مجھ کمبخت کو فرصت نہیں خود اپنی آہوں سے

مکالمہ ٹیگور اور رُومن رولینڈ

مترجمہ
جناب صفی الدین احمد صاحب (نظام کالج)

یہ گفت گو جو سرا بندرناتھ ٹیگور اور رومن رولینڈ کے درمیان جنیوا میں ہوئی تھی اور جو رسالہ ایشیا میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ ناظرین کے ذوقِ نظر کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ٹیگور۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ جنیوا بین الاقوامی تعلقات سُلجھانے میں کوئی اہم کام انجام دیگا۔

رُولینڈ۔ شاید! لیکن اِس کا انحصار اُن حالات پر موقوف ہے جو جنیوا کی دست رس سے باہر ہیں۔

ٹیگور۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمیعت الاقوام اُن اکثر انجمنوں کی مانند (جو یہاں کام کر رہی ہیں) صرف ایک انجمن ہے اور موجودہ حالت میں وہ کسی طرح بین الاقوامی تعلقات مستحکم کرنے کی واحد زبردست قوت تو نہیں۔ لیکن سیاسی دنیا میں وہ توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے قابل ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ میں متعدد بین الاقوامی انجمنوں اور سوسائیٹیوں پر اعتماد کرتا ہوں جو فی الوقت یہاں کام کر رہی ہیں اور مجھے یہ قوی اُمید ہے کہ وہ آخر کار جنیوا کو خالص بین الاقوامی اشتغال کا مرکز بنائینگی جن سے ہماری آئندہ سیاسیات کی تشکیل ہوگی۔

رولینڈ۔ جنیوا بین الاقوامی دنیا میں زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ صدیوں سے وہ باہمی محبت اور اعتماد کا مرکز رہا ہے اور یہ اعتماد اور محبت کی وجہ صرف مذہب پر مبنی تھی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں مذہب کو پس پشت ڈالکر محبت اور اعتماد پیدا کرنے کی نہایت ہی شاندار کوششیں کی گئی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں بہائیوں اور صوفیوں اور دوسرے مذہبی فرقوں نے جنگ آزما اقوام کے نمائندوں سے ملنے اور آپس میں محبت اور آشتی کا تخم بونے کی کوشش کی تھی۔

ٹیگور۔ جنیوا نے بین الاقوامی جھگڑوں پر صلح کرانے اور آپس میں اختلاط بڑھانے کی بہترین کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ہم باہمی اعتماد اور امداد کی اُمید ہی کو [illegible]

اور رُوحانی چیز کی بے حد تلاش ہے۔ مشرقی افریقہ میں قومی، نسلی، مذہبی، اور سیاسی جھگڑوں نے بس ناطقہ ہی تنگ کر دیا اور کچھ عجیب ہی فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے۔ ہم اب یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یورپ کا بیشتر حصہ مشرق سے کوئی پیغام سننے کا مشتاق ہے، لہٰذا وہ خیال کرتے ہیں اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ صرف یہی ملک اس زمانہ میں دنیا کو کوئی پیغام سُنا سکتا ہے میں نے جو کتابیں ہندوستان اور اس کے عظیم الشان سپوتوں پر لکھی ہیں خلاف امید بڑے جوش و خروش سے قبول کی گئیں اور یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر بے لوث کوشش جو ہندوستان کی روحانی قوت بتلانے کے لئے کی جاتی ہے صداقت پسند مغربی ذہنیت ہی پر اثر نہیں رکھتی بلکہ آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے سیاست دانوں کے دلوں تک بھی گزر کرتی ہے۔

ٹیگور۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اُنیسویں صدی میں ہندوستان ہی نے پہلے بین الاقوامی ذہنیت رکھنے والے کو پیدا کیا ہے۔ میرا مطلب اس سے راجہ رام موہن رائے ہے۔ رام موہن رائے ایک متعصب برہمن خاندان کے فرد تھے لیکن صداقت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے تمام نمائش اور اوہام کی کڑیوں کو توڑ ڈالا۔ وہ بدھ مت کو سمجھنا چاہتے تھے اس لئے تبت گئے۔ یورپ کا بھی سفر کیا۔ عبرانی۔ یونانی۔ عربی۔ فارسی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں اور برسٹل میں انتقال کیا۔ روحانی صداقت ان کے لئے ایسی چیز نہیں تھی جو خاص خاص مذہبی عمارتوں میں مقید ہے۔ اور نہ اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ پیشہ ور مبلغین جو صداقت کو ایک قانون سمجھتے ہیں غیر مذہب والوں میں نہیں پیدا کر سکتے اُن کا یہ خیال تھا کہ روحانی اتفاق نے نبی نوع انسان کو ایک ہی کڑی میں باندھ دیا ہے اور مذہب انسانی ہمدردی کے بنیادی اصول کے پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے۔

رُولینڈ۔ میں اکثر اوقات ہندوستانی رواداری کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں اس لئے کہ ہم اہل مغرب میں رواداری بالکل ناپید ہے۔ آپ کے مذہب کی جُداگانہ ہیئت اور آپ کی تہذیب کے عجیب و غریب مجموعے نے اِس رواداری کو ممکن کر دیا ہے اور ہندوستان نے تو ہر قسم کے مذہبی اعتقادات کے پھولنے اور پھلنے کی اجازت دے دی ہے۔

ٹیگور۔ شاید یہی ہماری کمزوری بھی ہو اور اس کمزوری کی اصلی وجہ ہماری حد درجہ کی رواداری ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آپس میں ٹکرا گئے اور اب ہمارے روحانی اعتقادات کی اصل بنیاد کو پہچاننا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔ تمثیلاً کسی جانور کی قربانی ہمارے مذہب میں جائز نہیں لیکن بیشتر حضرات اُس کو جائز اس لئے

اِن تمام بدعات کو اکھیڑ پھینکیں اور اُن اعتقادات کو ترقی دیں جو اصل میں ہماری روحانی موروثیت ہے۔

رولینڈ۔ عیسائی کتابوں نے بھی جانور کی قربانی پر بے حد زور دیا ہے اولڈ ٹیسٹیمنٹ (Old Testament) کے تمہیدی باب کو پڑھئے "اللہ نے ایبل (Abel) کو برتری دی چونکہ اُس نے ایک گوسفند قربانی دی تھی"۔

ٹیگور۔ میں اولڈ ٹسٹیمنٹ کے خدا سے کبھی محبت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ڈنڈے باز خدا ہے۔

رولینڈ۔ لیکن نیو ٹسٹیمنٹ (New Testament) میں بھی وہی خیال دُہرایا جاتا ہے۔ عیسیٰ ایک گوسفند ہیں جن کی قربانی بنی نوع انسان کی خاطر ہوئی ہے۔ لیکن اِس بات پر بے جا زور دیا گیا ہے اور یہ مفہوم وسیع معنوں میں زیادہ روحانی بھی نہیں ہے۔

ٹیگور۔ ہمیں ہر وقت وسیع معنوں پر ہی زور دینا چاہئے۔ کیونکہ صداقت بذات خود بُرائی یا جھوٹ کی روادار نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسی تیز دھوپ کی مانند ہے جو زہریلے جراثیم کی زندگی دُشوار بنا دیتی ہے حقیقتاً آج ہندوستان کے اہل مذاہب میں رواداری نہیں ہے اور یہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ہے۔ اگرچہ آج ہندوستان کو دہریت زیادہ فائدہ پہونچا سکتی ہے لیکن یہ ملک دہریت کی اِتباع ہمیشہ کے لئے نہیں کریگا۔ وہ تمام چھوٹے چھوٹے زہریلے پودوں کو جلا دیگا۔ صرف مستحکم اور مضبوط درخت ہی قائم رہینگے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ موجودہ حالت میں یورپ کی دہریت کی بادسموم بھی بہت کچھ ہندوستان کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

رولینڈ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حکیمانہ تخیل (Scientific rationalism) ہندوستان کے مسئلہ کو حل کر سکتا ہے۔

ٹیگور۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان کسی طرح صرف نفسی اِرادوں پر زیادہ عرصہ تک اعتقاد نہیں رکھ سکتا۔ توازن اور ہم آہنگی اُس کو ضرور بخشی جائیگی۔ اسی لئے تھوڑے عرصہ کے لئے ہمارا کسی ایک پلّے کی طرف جُھک جانا بہتر ہے۔ چونکہ اِس سے ہم اپنی مفقود روحانی قوت کو دوبارہ حاصل کرینگے۔ سائنس کو ہماری امداد کے لئے آنا چاہئے۔ اور آخر کار ہم اُس کو اپنے رنگ پر لے آئینگے۔

رولینڈ۔ عہد حاضر میں سائنس سب سے زیادہ بین الاقوامی ہے یعنی اس کی تحقیقات میں باہمی امداد اور اعتماد ہے لیکن افسوس کہ زہریلی گیس سیاست دانوں کے ہاتھوں میں ہے جس کا نتیجہ ہر ایک المناک واقعہ ہے کیونکہ سائنسداں بھی فوجی قوت کے ہاتھوں میں ہیں جو انسانی تخیل اور انسانی تہذیب کی ترقی میں تتمہ برابر بھی دلچسپی

بیداری ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ کو جرمنی اور دوسرے ممالک میں یوروپین نوجوانوں سے گہرے تعلقات پیدا کرنے کے بہترین مواقع ملے تھے۔

ٹیگور۔ میں نے جرمن نوجوانوں میں دو باتیں غور سے دیکھی ہیں۔ ایک تو اُمید و نفس کشی اور دوسری فرض شناسی جو سادگی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور میں یہ خیال کرتا ہوں کہ دورِ حاضرہ کے جرمن نوجوان کی بلند پروازیاں تمام دنیا کو فائدہ پہونچائینگی۔

رولینڈ۔ یہ سب اُن کے مساعی اور محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ ایک حالت سے دوسری حالت کو فوراً اختیار کر سکتے ہیں۔

ٹیگور۔ محنتیں اور مساعی قوم میں بدتر سے بدتر باتیں پیدا کر دیتی ہیں لیکن بعض اوقات بالکل اس کے برعکس، وہ قوم بہترین بھی بن سکتی ہے۔

رولینڈ۔ آج کل کا حل طلب مسئلہ قومی بغض اور عناد نہیں بلکہ اسی قوم کے طبقوں کے باہمی جھگڑے ہیں لیکن یہ جھگڑے بھی کسی طرح جنگجویانہ ذہنیت اور قومی عناد کو کم کرنے یا اُس کے جائز قرار دینے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ خیر اب ہمیں خوشگوار نفسِ بحث پر آنا چاہیئے۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے مصوری شروع کی ہے۔

ٹیگور۔ جی ہاں مصوری کر رہا ہوں۔ میں نے پہلے پہل اپنی تصاویر کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن خلافِ اُمید جب میں نے یہ دیکھا کہ آپ لوگ پسند کر رہے ہیں تو میں خود متعجب ہوا کہ کس چیز نے شروع میں مجھے مصوری کے لئے اکسایا۔

رولینڈ۔ آپ کے باطنی جذبات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بننا کوئی لازمی امر نہیں۔

ٹیگور۔ اشعار جتنے موثر ہوتے ہیں تصاویر اتنی موثر نہیں ہوتیں ہمارے جذبات رنگین پیکر شاعری ہی کے محتاج نہیں ہوا کرتے بلکہ قالب تصویر میں بھی اُن کی جھلک نمایاں ہو سکتی ہے چنانچہ مصوری کا سودا میرے سر میں سمایا ہوا ہے۔"

میری زندگی کی صبح شعر اور نغمہ سرائی سے ہوئی تھی لیکن اب میری شام زندگی میں میرا دماغ مصورانہ خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔

گیری بالڈی

از

جناب محمد باقر کرمانی صاحب

جورف گوسیپ گیری بالڈی۔ بمقام نیس (Nice) ۴ جولائی ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ ڈومینیو گیری بالڈی ایک غریب سوداگر تھا۔ وہ ایک چھوٹی کشتی کا مالک تھا جو اسکی تجارت کا سہارا تھی۔ باپ کا خیال شروع ہی سے لڑکے کی تعلیم کی طرف تھا لیکن گیری بالڈی کا رجحان اسطرف نہ تھا۔ وہ بجائے مدرسہ جانے کے اپنے دوستوں اور ملاحوں کے ساتھ گپ شپ مارنے اور سیر و شکار کرنے میں مصروف رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ابتدا ہی سے وہ سرکش اور منہ زور واقع ہوا تھا جسکے سبب وہ اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھا۔ اسکا ایک پرانا دوست اسکے متعلق لکھتا ہے۔ "اسکی آواز بہت سریلی تھی، اسکو ملاحوں اور کسانوں کے کئی گیت یاد تھے، ہم بچپن ہی سے اسکو اپنا لیڈر خیال کرتے تھے، چھوٹے اور کمزور لڑکے اسکو اپنا محافظ سمجھتے تھے۔ وہ ہم تمام میں سب سے زیادہ قوی تھا پیرنا اسکو خوب آتا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح گھنٹوں پانی میں رہا کرتا تھا۔"

گیری بالڈی دریائی سفر کا بہت شوقین تھا۔ مگر باپ اسکے سخت خلاف تھا۔ ایکبار وہ موقع پاکر جینوا (Genoa.) بھاگ گیا۔ لیکن ایک پادری نے باپ کو اس واقعہ کی بروقت خبر کردی اور وہ گیری بالڈی کو وہاں سے پکڑ لایا۔ اس واقعہ کے بعد باپ نے لڑکے کی طبیعت کا لگاؤ سمجھکر اس کی تعلیم کا خیال چھوڑ دیا اور ۱۸۲۲ء میں جبکہ اسکی عمر صرف پندرہ برس کی تھی ملاح کی حیثیت سے ایک جہاز پر ملازم رکھوادیا۔ گیری بالڈی نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے پہلے ہی سفر میں کئی شہر دیکھے۔ اڈیسا، جبرالٹر اور قسطنطنیہ وغیرہ میں کئی دن تک رہا۔ اسکو اپنے دوسرے سفر میں روما جانے کا اتفاق ہوا۔ روما کے

جاگزیں ہو گئی۔ مرتے دم تک اسکی خواہش تھی کہ روما کو اٹلی کی آزادی اور اسکے اتحاد کے لئے مرکز قرار دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب اسکی زندگی میں ایک انقلاب واقع ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں جبکہ وہ ایک تجارتی کشتی کا کپتان تھا اسکی ایک جینوی سے جسکا نام کینیو (Cuneo) تھا ملاقات ہوی۔ اس نے گیری بالڈی کو بتلایا کہ "نوجوانان اٹلی" جوشیلے نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جسکا مقصد اٹلی کو آزادی دلانا ہے۔ اس جماعت کا لیڈر اور بانی میازینی ہے۔ گیری بالڈی اسوقت کے بارہمیں لکھتا ہے "کلومبس کو بھی 'نئی دنیا' کی دریافت سے اتنی خوشی حاصل نہیں ہوی ہوگی جتنی کہ مجھکو ایک ایسے سچے محب وطن اور آزادی پسند انسان کے وجود سے ہوی۔"

گیری بالڈی اسکے بعد ہی مارسیلز (Marseilles) روانہ ہوا جہاں صاف دل اور عظیم الشان لیڈر میازینی جلا وطنی کی حالت میں رہتا تھا۔ گیری بالڈی ایک جگہ یوں لکھتا ہے: "میں بچپن ہی سے ایک ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو مجھہ جیسے ایک تشنہ کام کی رہبری آزادی کے چشمہ تک کر سکے۔ اسوقت یہی ایک ایسا انسان تھا جو بیدار تھا جبکہ اسکی ساری قوم خواب غفلت میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی قوم کو غفلت کی نیند سے چونکا دے۔ آزادی اور اتحاد کا حامی اور اٹلی کا بہادر ہیرو۔ یہی میرا دوست اور استاد۔ میازینی تھا۔"

گیری بالڈی ایسے نازک وقت مارسیلز پہنچا جبکہ تمام یورپ میں آزادی کی آگ مشتعل تھی۔ 'نوجوانان اٹلی' نے سیوائے (Savoy) پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ سیوآئے پر قبضہ کرنے کا باعث یہ ہوا کہ چارلس البرٹ جو اسوقت سیوائے کا بادشاہ تھا اور جس سے 'نوجوانان اٹلی' کی امیدیں وابستہ تھیں دفعتاً انکا ساتھہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس بغاوت میں گیری بالڈی کے ذمہ جینوا جاکر وہاں کے باغیوں کو اپنی طرف دعوت دینے کا کام سپرد تھا۔ اسکو اپنی پہلی کوشش میں ناکامیابی کا منہہ دیکھنا پڑا کیونکہ ان لوگوں نے بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ میازینی بھی اس کوشش میں ناکام رہا۔ دونوں کو اپنی جانیں بچا کر بھاگنا پڑا۔

گیری بالڈی کسان کے بھیس میں نیس روانہ ہوا۔ پھر وہاں سے فرانس چلا گیا۔ مارسیلز میں اسنے پہلی بار اپنا نام اخبار میں دیکھا۔ لیکن کسطرح؟ جلی حروف میں اسکے نام کے ساتھہ باغی اور مجرم کے الفاظ

اسکو وہاں بھی چین سے رہنے نہ دیا تو وہ ریوڈی جنیرو (Rio de Janeiro) چلا گیا۔

جنوبی امریکہ میں قدم رکھنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اسکی خوش قسمتی سے ریو گرانڈی ڈو سل (Rio Grande do Sul) میں بغاوت ہوگئی۔ گیری بالڈی نے اپنے ملک والوں کو جو اس بغاوت میں باغیوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے قید ہوتا دیکھکر خود بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اس نے ایک کشتی تیار کی اور بارہ آدمیوں کو ساتھ لیکر دریائی ڈاکو کی حیثیت سے برازیل (Brazil) کے ساحل پر سب سے پہلے آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ اسکا نام برازیل والوں کے لئے خوف اور دہشت کا باعث تھا۔ وہ اسیطرح کئی دن تک پانی پر سفر کرتا رہا۔ اس سفر میں اسکو کئی حادثوں کا سامنا کرنا پڑا ایکبار اسکی کشتی الٹ گئی لیکن چونکہ وہ ایک مشاق پیراک تھا اسلئے نہایت پھرتی سے دریا عبور کیا۔ اسکے بہت سے ساتھی ڈوب کر مر گئے۔ اسنے باقی ماندہ ساتھیوں کو ہمراہ لیکر برازیل والوں کے ایک جہاز پر قبضہ کر لیا۔

گیری بالڈی اس نئے جہاز کے ڈک پر کھڑا ہوا خیالات میں منہمک تھا۔ وہ غریب الوطن تھا۔ والدین اور دوستوں سے دور جنگل و بیاباں کی خاک چھان رہا تھا ہر وقت اسکو موت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اسکے بہادر اور جوشیلے ساتھی دریا میں غرق ہو چکے تھے۔ اب اس کا کوئی ہمدم و مونس باقی نہ تھا۔ اسکی طبیعت اچاٹ ہونے لگی تھی۔ زندگی ناقابل زیست معلوم ہو رہی تھی۔
جب وہ انہیں خیالات میں منہمک تھا ایک مرتبہ اسکی نظر مقابل کے پہاڑ پر پڑی۔ اس پہاڑ پر چند مکانات تھے۔ اسنے دوربین کے ذریعہ، جو ہمیشہ اسکے ساتھ رہا کرتی تھی ان مکانوں کو دیکھا۔ اسکی نظر ایک حسین اور جوان لڑکی پر پڑی جو اسکی صورت آشنا معلوم ہوئی۔ اسنے فوراً کشتی پانی میں چھوڑنے کا حکم دیا اور سوار ہوکر اسکی طرف چلا۔ وہاں پہنچکر جب اسنے تلاش کی تو وہ لڑکی نظر نہ آئی۔ آخر کار بہت کچھ جستجو کے بعد جب وہ واپس چلا جانا چاہتا تھا تو اسکی ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اسنے گیری بالڈی کو چاء کی دعوت دی۔
گیری بالڈی اسکے ساتھ اسکے مکان روانہ ہوا۔ مکان پہنچنے پر پہلے جس چیز پر اسکی نظر پڑی وہ وہی لڑکی تھی۔ اس لڑکی کا نام انیتا برائن تھا۔ یہ دونوں پرانے دوست تھے۔ لڑکی کے والدین نے اسکی شادی گیری بالڈی کے ساتھ کرنا نہ چاہا اور لڑکی کو دوسرے شخص سے منسوب کر دیا تھا۔ اس اچانک ملاقات سے دونوں کے دلمیں محبت کی بجھی ہوئی آگ پھر ایکبار بھڑک اٹھی اور دونوں نے [illegible]

کسی کو جرات نہ ہوتی تھی۔ انیٹا خوبصورت، مضبوط اور بہادر عورت تھی۔ سواری اچھی جانتی تھی۔ بندوق چلانا خوب آتا تھا۔ بہرحال گیری بالڈی جیسے بہادر اور پرجوش آدمی کے لئے ایک موزوں بیوی تھی۔ گیری بالڈی اسکو اپنے ہمراہ مانٹی ویڈیس لے گیا جہاں پر دونوں کی شادی ہوی۔ شادی کے بعد انیٹا نے حسن محبت، وفاداری اور جانثاری سے اپنے شوہر کا ساتھ دیا اسکی نظیر پردہ عالم پر بہت مشکل سے ملسکتی ہے۔ اس نے کئی دن اپنے شوہر کے ساتھ گھوڑے پر سفر کیا۔ ایکبار وہ قید بھی ہوگئی۔ جیل میں عرصہ کے بعد اسکو خبر ملی کہ اسکا شوہر مرگیا۔ وہ موقع پاکر اور سپاہیوں سے آنکھ بچا کر جیل خانہ سے فرار ہوی اور شوہر کی تفتیش میں پھرنے لگی۔ چار دن کی فاقہ کشی اور دوڑ دھوپ کے بعد اسنے آخر شوہر کا پتہ لگایا۔

اسکے بعد ہی اسکے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش کے بارہ ہی دن بعد اسکو پھر سفر پر جانے کے لئے تیار ہوجانا پڑا۔ کبھی وہ اس نومولود بچہ کو زین کے اگلے حصہ پر رکھے لیجاتی اور کبھی اسکو سینے سے لگائے سفر کرتی تھی۔ اسیطرح انہوں نے آمریکہ کے مہیب اور خطرناک جنگل کو طے کیا۔ یہاں گیری بالڈی اپنی بیوی کو نیس روانہ کرنے کے بعد خود بھی نیس پہنچ گیا۔

بارہ سال کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد ۱۸۴۸ء میں آزادی کا جوش پھر ایکبار یورپ کی فضا میں پھیل گیا۔ فرانس ریپبلک ہوگیا۔ سسلی (Sicily) نے بغاوت کردی۔ میلان (Milan) میں بھی بغاوت شروع ہوگئی۔ آسٹریا والوں کو انہوں نے نکال باہر کیا۔ نیس نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرلیا۔ آسٹریا بھی اندرونی نفاق اور جھگڑوں کے باعث کمزور ہوچلا تھا۔ اسوقت گیری بالڈی کی بےغرض اور بےلاگ خدمات کی سخت ضرورت تھی۔ وہ نہایت عجلت کیساتھ ۲۱ جون ۱۸۴۸ء کو نیس پہنچا۔ رابرٹ اور پوپ نے اسکی سخت تحقیر کی وہ یہاں سے برگام (Bergam) پہنچا جہاں وہ رفتہ رفتہ ۳۰۰۰ جوانمرد احرار کا لیڈر بن گیا۔ اسی اثنا میں رابرٹ اور پوپ نے آسٹریا کو مدد دیکر اپنی قوم اور اپنے شہر والونکی دشمنی مول لی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر گیری بالڈی نے ایک جھنڈا "خدا اور اسکی مخلوق" کے نام سے بلند کیا اور تین ہفتہ تک آسٹریا کے خلاف کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس لڑائی میں اسنے ثابت کردیا کہ وہ کسی مالی غرض یا سلطنت کی طمع اور لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کو غلامی کے پھندے سے آزادی دلانے اور انکی بہبودی کے لئے لڑرہا تھا۔ اسکی بہادری اور جوش حب الوطنی کا سکہ تمام لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا

روانہ ہوا۔ اسکا ارادہ روماگنا (Romagna) جانے کا تھا لیکن وہ وہاں گرفتار کرلیا گیا اور اسکو مجبوراً ٹسکنی جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے اسیوقت روما میں بغاوت ہوگئی اور وہ عہدہ دار جسنے اسکو گرفتار کیا تھا مار ڈالا گیا اور نیا پوپ بھی اپنی جان بچاکر بھاگ نکلا۔

وہ اب روما روانہ ہوا۔ ۸ فبروری ۱۸۴۹ء میں روما میں ریپبلک قائم ہوگئی۔ میازینی اس کا صدر قرار دیا گیا جس نے نہایت رحمدلی اور انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ افسوس کہ یہ حکومت زیادہ دن برسر اقتدار نہ رہی۔ چارلس البرٹ نے روسیوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اسکے بعد ہی آسٹریا، فرانس، اسپین، اور نیپلس میں معاہدہ ہوگیا۔ یہ معاہدہ اٹلی کی آزادی کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ فرانس نے پوپ کی مدد کے لئے دس ہزار سوار روما روانہ کئے۔ صورت حالات کو دیکھتے گیری بالڈی کو جو نیلپس میں فرڈینانڈس سے مقابلہ کررہا تھا بلالیا گیا۔ روما میں اسکو کوئی فوجی اقتدار حاصل نہ تھا پھر بھی اسنے نہایت بہادری اور استقلال سے فرانسیسی فوج سے لڑتا رہا۔ آسٹریا سے اور فوج پوپ کی مدد کے لئے آئی۔ فوج کی زیادتی کے باعث گیری بالڈی کو پسپائی ہوی۔ لیکن اسنے اس سے قبل کئی موقوں پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ آخر کار وہ دو رجمنٹوں کو ساتھ لیکر غنیم پر حملہ آور ہوا۔ وہ اسکے بعد کا حال یوں لکھتا ہے۔ "اسوقت میرے دلمیں صرف ایک آرزو تھی اور وہ یہ کہ آزادی کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دینے کی۔ میں اپنے ان قلیل ساتھیوں کے ہمراہ آسٹرین فوج پر حملہ آور ہوا۔ حملہ کے بعد کیا ہوا مجھے اسکی خبر نہیں۔ جب صبح نمودار ہوی تو میرے کپڑے خون میں بھرے ہوئے تھے لیکن میرے جسم پر ایک بھی کاری زخم نہ آیا تھا۔" ابھی یہ لڑائی ختم ہونے نہ پائی تھی کہ وہ پھر اسمبلی کی طرف سے واپس بلایا گیا۔ اسمبلی میں روما کی آیندہ قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے "نوجوانان اٹلی" جمع تھے۔ میازینی بھی شریک تھا۔ اسمبلی میں ووٹ کے لئے تین صورتیں پیش ہوئیں:

(۱) اپنے آپ کو فرانس کے حوالہ کردینا۔

(۲) آزادی کے لئے انسے مقابلہ کرکے مرجانا۔

(۳) حالات پر غور کرتے ہوئے فی الحال یہاں سے بھاگ جانا

گیری بالڈی نے تیسری صورت قبول کی۔ اتنی مصیبتیں برداشت کرنا اور اتنے مراحل طے کرنے کے

انکی تعداد فرینچ کے مقابلہ میں بہت کم تھی یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہ تھی تو اس صورت میں ان سے لڑکر مرجانا صرف حماقت ہی نہیں بلکہ اٹلی کو آزادی سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دینا اور آیندہ امیدوں پر پانی پھیر دینا تھا۔ اسلئے اسنے کہا "بہتر ہے کہ ہم فی الحال راہ فرار اختیار کریں کیونکہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں اٹلی کا خیال ہمارے دل سے مٹ نہیں سکتا"۔ وہ یہہ کہکر اسمبلی سے چلا گیا۔ اسمبلی میں پہلی صورت یعنے اپنے آپ کو غنیم کے سپرد کر دینے پر ووٹ مل گئے۔ میازینی نے بھی اسکی مخالفت کی اور روما کے عزت و وقار کو اسطرح اپنے ہاتھوں برباد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میازینی بھی وہاں سے نکل کر سوٹزرلینڈ (Switzer-land.) میں پناہ لی۔ گیری بالڈی اپنی فوج جسکی تعداد پانچ ہزار تھی ہمراہ لیکر روما سے نکل کھڑا ہوا۔ فرانس کی فوج جسکی تعداد پچاس ہزار تھی اسکے تعاقب میں بھیجی گئی۔ وہ بھوک پیاس لڑائی اور موت کا سامنا کرتا ہوا سان مارینو (San Marino) جو ایک جمہوری سلطنت تھی پہنچا۔ مخالف فوج نے آکر اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ آسٹرین جنرل نے جو وہاں کا حاکم تھا گیری بالڈی سے اپنے آپ کو فرینچ کے سپرد کر دینے پر اسکی جان بخشی اور آزادی کا بھی وعدہ کیا۔ اس اثنا میں اسکے نو سو سپاہیوں نے اس کا ساتھہ چھوڑ کر جنرل کے ساتھہ ہو گئے۔ لیکن گیری بالڈی ارادہ کا پکا انسان تھا۔ اسکو کبھی گوارا نہ تھا کہ جس چیز کے لئے اس نے اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالا تھا پھر اس سے دستکش ہو جائے۔ وہ اپنے ارادہ پر قائم رہا اور اپنے باقی ماندہ سپاہیوں کے ساتھہ وہاں سے چل نکلا۔ اسوقت اسکے سر کے لئے انعام مقرر ہو چکا تھا اور اسکو مدد پہنچانے والے کے لئے سزا کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس بے سر و سامانی اور خطرناک دوڑ دھوپ میں اسکی بیوی انیٹا بھی شریک کار تھی۔ آخرکار یہ لوگ سسانا ٹیکو (Cesenatico.) پہنچے یہاں پر انہوں نے تیرہ[۱۳] کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور پھر یہاں سے وینس روانہ ہوئے۔ بدقسمتی سے آسٹریا کی فوج نے جو گورو پر متعین تھی انکو دیکھہ لیا اور گیری بالڈی کا تعاقب کر کے ان کی نو کشتیاں چھین لیں۔ گیری بالڈی اپنے ساتھیوں کو لیکر قریب کے ہی ساحل پر پناہ گزین ہوا۔ انیٹا کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اسکو ہاتھوں پر اٹھا کر لیجانا پڑا۔ کشتیوں پر سوار ہونے کے وقت ہی اسکو تختہ پر لٹا کر سوار کیا گیا تھا۔ گیری بالڈی نے اپنے ساتھیوں کو اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگ جانے کی اجازت دیدی اب صرف اسکے ساتھہ ایک دوست لگیرو (Leggiero) اور اسکی قریب المرگ بیوی تھی۔ اپنی بیوی کو ہاتھوں پر اٹھائے اور لگیرو کو ساتھہ لئے اس گھنے اور خوفناک جنگل میں داخل ہوا۔

ساتھیوں کو جو اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے قتل کر ڈالا۔ لگیریو کے پاؤں میں ایک گولی لگی۔ گیری بالڈی کی اسوقت جو حالت ہوگی وہ آپ خیال کر سکتے ہیں۔ اپنی نیجان رفیق حیات کو ہاتھوں پر اٹھائے اور لنگڑے دوست لگیریو کو سہارا دئے ایسی نازک حالت میں اِدہر سے اُدہر بھاگتا پھرتا تھا۔ آخر کار ایک مہربان کسان عورت نے انکو اپنے مکان میں پناہ دیا۔ یہاں اس کی محبوبہ بیوی انیتا جس نے نہایت وفاداری دلیری اور استقلال کیساتھ اپنے پیارے شوہر کا ساتھ دیا تھا نہایت بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں دنیا کے بکھیڑے سے نجات پاگئی۔ اسوقت کا حال وہ یوں لکھتا ہے "میں نے اسکو مرنے سے باز رکھنا چاہا..... آمادہ پرواز روح کو روکنا چاہا ـــ آخر کار..... میں نے اون بے جان ہونٹوں اور ہاتھوں کو بوسہ دیا اور مایوسی کے آنسو بہایا کیا" اسوقت گیری بالڈی کی حالت اسقدر نازک تھی کہ وہ خود اپنی بیوی کو دفن نہ کر سکا۔ اتنا وقت نہ ملا اور اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنی رفیق زندگی اور شریک حیات کے آخری فرائض انجام دیتا۔ لاش کو انہی کسانوں کے حوالہ کرکے وہ نہایت افسردہ دل وہاں سے بھاگا۔ چالیس دن تک اسی طرح بے یار و مددگار جنگل میں گھومتا رہا۔ آخر کار بمقام کالا مارٹینا (Cala Martina ـ) ایک کشتی جسکو اسکے دوستوں نے فراہم کیا تھا سوار ہوکر "اٹلی زندہ باد" کے نعرہ مارتا ہوا دوبارہ نیس پہنچا۔

گیری بالڈی حقیقت میں صبر و استقلال کا مجسمہ تھا۔ ارادہ کا دھنی، عزم کا پکا، مصائب و آلام سے ہمت نہ ہارنے والا اور اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے جان کو جوکھوں میں ڈالنے والا انسان تھا۔ آفریں ہے اسپر کہ ایسے وقت جبکہ اٹلی غلامی کے پھندے میں گرفتار تھا، مختلف حصوں میں منقسم اور مختلف اقوام کے منہہ کا نوالہ بنا ہوا تھا، اسنے اپنی جان پر کھیل کر اور کسی مصیبت کی پرواہ نہ کرکے، اٹلی کی آزادی کے نعرہ سرباز اراس دلیری سے مارے کہ لوگ اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوگئے لیکن ہر سلطنت اسکے جان کی خواہاں تھی اور اسکو وہاں سے مجبوراً چلا جانا پڑا۔ جب وہ اپنے بن ماں کے لڑکے کو دیکھنے کے لئے گیا تو اسکو اجازت نہ ملی وہ وہاں سے تیونس (Tunis) روانہ ہوا لیکن فرانس گورنمنٹ نے وہاں بھی چین لینے نہ دیا اور جب وہ جبرالٹر (Gibraltar) پہنچا تو انگریزی گورنمنٹ نے بھی وہاں امان نہ دی۔

۴۶۲۴

وہ آخر کار امریکہ روانہ ہوا۔ یہاں پر چراغ بنانے والے کی حیثیت سے رہنے لگا۔ ۱۸۵۰ء

اور اپنے لڑکے کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔

۱۸۵۹ء میں گیری بالڈی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک اور موقع ملا۔ ٹورین (Turin) میں کیور (Cavour) نے جو ایک اعلیٰ مدبر اور سیاست داں کے نام سے مشہور تھا وکٹر امانیل (Victor Emmanuel) کو رائے دی کہ اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش کرے۔ اس نے کہا کہ اٹلی کو آزادی اسیوقت نصیب ہوگی جب وہ دیگر اقوام کا میدان جنگ میں مقابلہ کر کے فتحیابی حاصل کرے۔ گو وکٹر اور دیگر مدبرین کو کیور کی رائے سے اختلاف تھا لیکن اس نے وکٹر کو مجبور کر کے چھوڑا۔ کیور نے فرانس سے دوستی بڑھائی اور نپولین سے جو اسوقت فرانس کا شہنشاہ تھا، مدد دینے کا وعدہ لیا۔

اب ان لوگوں کو گیری بالڈی کی ضرورت محسوس ہوی۔ اٹلی کے لئے ایک ایسے پرجوش اور جاں نثار لیڈر کی سخت ضرورت تھی۔ گیری بالڈی ٹورین بلایا گیا اور اس نے خوشی سے دعوت قبول کی۔ اگرچہ اسکو کیور سے محبت نہ تھی لیکن چونکہ وہ اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش کر رہا تھا جو گیری بالڈی کا نصب العین تھا اس لئے وہ خوشی سے کیور کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا۔

پہلے آسٹریا سے چھیڑ ہوی۔ وکٹر نے اپنی اور فرانس کی متحدہ فوج کی مدد سے آسٹریا کی فوج کو دو مقاموں پر فاش شکست دی۔ لیکن عین اس موقع پر آسٹریا اور فرانس کے مابین صلح ہوگئی۔ نپولین نے اٹلی کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔ نپولین کے دل میں خوف پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں اٹلی آزاد ہونے کے بعد ایک زبردست مدمقابل نہ بن جائے۔ اسی خیال سے اس نے آسٹریا کے بادشاہ سے صلح کی تھی۔ کیور اور گیری بالڈی اس خبر سے بہت رنجیدہ ہوئے۔ وکٹر کو مجبوراً فرانس کے فیصلہ سے متفق ہونا پڑا اور اس مدد کے صلہ میں جو انہیں فرانس کی طرف سے گذشتہ لڑائی میں دی گئی تھی وکٹر کو نیس جو گیری بالڈی کا وطن تھا، فرانس کے حوالہ کر دینا پڑا۔

اس فرانس و آسٹرین معاہدہ کے باعث گیری بالڈی کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اسی وقت سسلی میں فرڈیننانڈس کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوی۔ گیری بالڈی کو اٹلی کی آزادی کے لئے ہاتھ پیر مارنے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ سسلی والوں نے اسکو اپنی امداد کے لئے دعوت دی۔ گیری بالڈی

روک دے۔ وکٹر نے یہ جواب دیا: "اسکو روکنا مناسب نہیں۔ ہم بظاہر اسکی مدد نہ کرینگے اور نہ ساتھ دینگے۔ اسطرح ہمارا کوئی نقصان نہوگا۔ اگر وہ کوئی نمایاں کام اٹلی کی آزادی کے سلسلہ میں انجام دے تو اسکے ساتھ ساتھ ہمارا مقصد بھی بر آئیگا۔" پس گیری بالڈی بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے "ہزار" سپاہیوں کیساتھ جنہوں نے روئے زمین پر اپنی بہادری کا لوہا منوا دیا تھا اور جنکا ذکر تاریخ میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہیگا سسلی پہنچا۔

اس نے سسلی پر حملہ آور ہونے سے قبل ایک خط وکٹر امانیل کے نام لکھ رکھا۔ خط میں لکھتا ہے :-

"میں خدا پر بھروسہ کرکے اس زبردست مہم کے سر کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہوں تو مجھے امید ہے کہ یورپ اور اٹلی یہ فراموش نہ کرینگے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ کسی خود غرضی اور نفس پرستی کے تحت نہیں بلکہ محض حب الوطنی کی خاطر تھا۔ اور اگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھکو آپکی سلطنت میں ایک بیش بہا اضافہ کرنے پر فخر حاصل ہوگا۔ لیکن آپ سے خواہش ہے کہ اسکو بھی نیس کی طرح اور قوموں کے حوالہ نہ کریں۔"

اسکے بعد اسنے اپنے "ہزار" بہادر سپاہیوں کو ساتھ لیکر مارسالا (Marsala) پہنچا۔ بغیر کسی روک ٹوک کے شہر میں داخل ہوگیا۔ وہاں کی رعایا نے نہایت خوشی سے اسکا خیر مقدم کیا اور اس کو اپنا نجات دہندہ تصور کرنے لگے۔ اب اسکی فوج کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے نیو پالیٹن (Neapolitan) فوج کو بمقام کیٹالا فیمی (Catalafimi) شکست دی اور شہر پالرمو (Palermo) پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اسطرح اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں شہر پر شہر فتح کئے اور اٹلی کا ایک بڑا حصہ اسکے زیر حکومت ہوگیا۔ اسکی ہمت بڑھگئی اور وہ شہر نیپلس میں دشمن پر حملہ آور ہوا۔ کیوراور وکٹر اسکا راستہ روکنا چاہتے تھے لیکن اس نے انکی پروانہ کی اور برابر لڑتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ آخرکار اسکی شجاعت اور بہادری کے آگے فرنیانڈس نہیں ٹھہر سکا اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ گیری بالڈی نے اس شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیا جنکے ظلم و تشدد اور قید خانوں کو دیکھکر گلاڈسٹون (Gladstone) نے انکو "قہر خدا" کے نام سے منسوب کیا تھا۔

ستمبر کی ساتویں تاریخ تھی جسدن گیری بالڈی نہایت شان و شوکت کے ساتھ شہر نیپلس میں داخل ہوا۔ اس نے وعدہ جو وکٹر کے خط میں کیا تھا پورا کیا اور پرسانو (Persano) کو وکٹر کا قائم مقام قرار دیکر نیپلس اس کے سپرد کر دیا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ وکٹر اور کیوُر نے اسکی بے لاگ محنتوں کی قدر نہ کی۔ جب اس نے فتوحات ختم کئے اور اپنے سپاہیوں کے ہمراہ وکٹر سے ملنے کے لئے "شاہ اٹلی زندہ باد" کے نعرہ مارتا ہوا آیا تو وکٹر نے اسکا اور اسکے بہادر سپاہیوں کا جن کے سبب سے اٹلی کو خودمختاری نصیب ہوئی تھی استقبال تک نہیں کیا بلکہ نہایت سرد مہری سے پیش آیا۔ جب گیری بالڈی کے سپاہیوں نے وکٹر کو اس طرح کا برتاؤ کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا۔ قریب تھا کہ وہ وکٹر کے خلاف بغاوت کر دیتے اور اسپر حملہ آور ہو جاتے مگر گیری بالڈی نے انکو یہ کہکر روک دیا۔ "نہیں! نہیں! بہادر سپاہیو! مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں وہی کرونگا جو موقع اور محل کے مناسب ہوگا۔"

آخرکار وکٹر کو گیری بالڈی کا خیر مقدم کرنا پڑا۔ اس نے گیری بالڈی کے فتوحات کی تعریف کی۔ اور اسکو ساتھ لیکر دوبارہ شہر نیپلس میں داخل ہوا۔

گیری بالڈی نے اسکے بعد ہی وکٹر کے عطا کئے ہوئے اعزازات و خطابات کے قبول کرنے سے انکار کر کے اپنے مقام کیاپریرا کو روانہ ہوا۔ اس نے جاتے وقت وکٹر سے یہ خواہش کی کہ اسکے "بہادر سپاہیوں کو فراموش نہ کرے"۔ جب وہ اپنے سپاہیوں سے جنہوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں اکھیڑ دی تھیں 'خدا حافظ' کہہ رہا تھا تو انکو روتا ہوا دیکھکر خود بھی بھرآئی ہوئی آواز میں کہنے لگا "میرے قدیم اور بہادر سپاہیو! تمہارا شکریہ۔ تم لوگوں نے قلیل عرصہ اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بہت کچھ کام کیا۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اب تمکو میرا آخری سلام"۔

کیوُر اور وکٹر گیاری بالڈی ہی کے بنائے ہوئے نقش قدم پر چلکر منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ گیاری بالڈی ہی کی ہمت تھی کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنی رفیق زندگی کو قربان کر کے اور ہر طرح مصائب برداشت کر کے اس کی بنیاد ڈالی جسپر اٹلی کی آزادی کی عمارت قائم ہوئی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے دلی مقصد کو پورا کرتے ہوئے اور دلی مراد کو برآتے ہوئے دیکھ لیا۔ اٹلی کو متحد بنانے میں اور روما کو اسکا پایہ تخت قرار دینے میں کامیابی حاصل کی۔

اس نے پچہتر برس کی عمر میں ۱۸۸۲ء میں بمقام کاپریرا انتقال کیا۔ اسوقت اسکے کمرہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اسکی نگاہیں نیلے سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔

فخر کی بات ہے کہ آج ہندوستان بھی اسکے پچاس سال بعد ایک ایسی ہستی پیدا کر سکا کہ جو اٹلی سے کہیں بڑھی ہوئی قوم اور اٹلی سے کہیں بڑے چڑھے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے چھڑوانے اور غیر قوم کے ظلم سے نجات دلانے میں

محرومِ تمنا

(افسانہ)

جناب راز قاسمی حیدرآبادی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

سنسان بیابان لق ودق صحرا میں ایک غریب بیکس تشنہ لب پڑا ہوا ہے۔ پیاس سے غریب کی زبان میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ اٹھہ کر دو گھونٹ پانی کی جستجو کرنی تو بڑی بات ہے پہلو بدلنے تک کی طاقت نہیں۔ غریب نے ہزاروں کوششیں اور لاکھوں جتن کئے لیکن بے سود۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے تشنہ لب مرنا پڑیگا اور مجھے تشنہ لب ہی مرنا چاہیئے۔ اُس نامرادِ تمنا کی امیدیں ٹوٹ گئیں اور ارمانوں کے گلے پر ناکامی کی چھری پھر گئی۔ نہ اُسکو حصولِ آب کی توقع تھی اور نہ اب وہ پانی کا منتظر تھا وہ ہمہ تن زندگی کے اُس انجام کا منتظر تھا جسکو موت کہتے ہیں۔ ایسے میں خلافِ توقع پردۂ غیب سے ایک صورت نظر آئی۔ دور سے ٹھنڈے پانی کا گلاس دکھایا اور اپنی چشم و ابرو کو کچھ ایسے پُرمعنی انداز میں جنبش دی جسکا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پانی تیرے ہی لئے لایا گیا ہے لیکن غریب تشنہ لب افتاں و خیزاں دیوانہ وار اُس طرف بڑھا تو اس رحمدل ظالم نے وہ آبِ حیات ایک معنی آفریں زیرلب تبسم کے ساتھ ایک اجنبی شخص کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

ارے دیوانے ہوش میں آ کدھر بڑھا چلا آرہا ہے۔ پیاس کے مارے اب تو کوئی دم کا مہمان رہگیا ہے اور ہر اعتبار سے تو اس کا مستحق ہے۔ تو جو اِس پانی کی قدر کریگا اور تجھے اس کے حصول سے جتنی مسرت ہوگی وہ اور کسی کو نہیں ہوسکتی مگر اسکو کیا کیجئے کہ یہ آبِ حیات تیرے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ یہ تو جسکی تقدیر کا تھا اسکو مل گیا تو تشنہ لب محرومِ تمنا مرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور تجھے تشنہ لب ہی مرنا چاہیئے۔

دور سے تجھے آبِ حیات دکھانیکی وجہہ یہ تھی کہ تو اُس چیز کو ایک بار دیکھ جس کے لئے جان دے رہا ہے اور تجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ مقدر سے زیادہ آرزو کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

غزل

از
جناب صفیؔ اورنگ آبادی

اُس بزم سے پُر ملال آئے
کیسے کیسے خیال آئے

رُو کر کھویا ہے صبر۔ گویا
نیکی دریا میں ڈال آئے

اپنی حالت سُنا دی اُن کو
دل کا کانٹا نکال آئے

فرہاد بھی جوئے شیر لایا
انسان کو کچھ کمال آئے

یا اُس کی کوئی نظیر دیکھوں
یا ذہن میں کچھ مثال آئے

ملنے جُلنے کا پھر مزا کیا
آپس میں جب ملال آئے

یہ سوانگ نیا بھی کوئی دیکھے
آئے لیکن نڈھال آئے

محتاج نہ کر غنی کو یا رب!
ہے ہے! جس پر زوال آئے

کس منہ سے ادا ہو شکرِ ساقی
بے حال گئے بحال آئے

اب چھوڑ صفیؔ سیاہ کاری
ڈاڑھی میں سفید بال آئے

چینیوں کے مذاہب اور اُن کے مختصر حالات

الفہرست کے نویں مقالے، دوسرے فن کے ایک حصہ کا ترجمہ

از

مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل عدالت عالیہ

یہ واقعہ بخرانی راہب نے جو چین سے آیا تھا ۳۷۷ھ میں مجھ سے بیان کیا۔ یہ شخص اہل بخران سے تھا جاثلیق نے اس کو اور اس کے ساتھ پانچ نصاریٰ کو جو مذہب کے پابند تھے تقریباً سات سال پہلے چین کو بھیجا تھا اس جماعت میں سے یہ راہب اور ایک شخص چھ سال بعد واپس آئے۔ میں نے کنیسہ کے پیچھے دار روم میں اس سے ملاقات کی اور اس کو نوجوان، خوبصورت، کم گو (بجز اس کے کہ اوس سے کچھ دریافت کیا جائے) پایا۔ میں نے اس کے نکلنے کی وجہ اور اتنی طویل تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ اس نے وہ امور بیان کئے جنہوں نے اس کو راستہ میں روکا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ جتنے نصاریٰ چین میں تھے وہ سب بعض وجوہ سے ہلاک ہوگئے اور چین کے تمام ملکوں میں اب بجز ایک مسیحی کے اور کوئی باقی نہ رہا۔ یہاں ایک گرجا تھا اس کو بھی ویران کر دیا گیا جب میں نے دیکھا کہ کوئی بھی مسیحی باقی نہیں رہا جس کی میں دینی خدمت کرتا تو جتنی مدت چین جانے میں گزری تھی اُس سے بہت کم مدت میں واپس بھی ہوگیا۔ اس کے بعض بیانات حسب ذیل ہیں:—

اس کا قول ہے کہ دریائی مسافتیں مختلف ہوگئی ہیں اور دریائی راستہ کا حال خراب اور اس کے جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں نیز اس راستہ میں خوف اور آفتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اکثر جزائر نمودار ہوگئے ہیں جنہوں نے مسافتوں کو توڑ دیا ہے۔ جو شخص اپنی ہلاکت قبول کرے وہی اس راستہ سے گزر سکتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس سرزمین کے شہر کا نام طاجویہ ہے جہاں بادشاہ رہتا ہے یہاں کی بادشاہت دو شخصوں میں منقسم تھی ان میں کا ایک فوت ہوگیا۔ دوسرا زندہ ہے۔ یہاں قابل فخر چیز نشان ہے جس کو خدام بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بادشاہ نے اس رسم کو موقوف کر دیا۔ اب خدام بجائے اس کے سونے یا اس کے مماثل چیزوں کے بگلوس لگا کر دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے نشان کی قیمت گھٹ گئی اب اس کا ایک اوقیہ سونے کے ایک اوقیہ کے مماثل یا اس سے کم ہوتا ہے۔ راہب کا بیان ہے کہ میں نے اس سینگ کے متعلق دریافت کیا۔ فلاسفہ اور علماء چین نے کہا کہ جس جانور کا یہ سینگ ہے وہ جب بچہ جنتا ہے تو رحم سے نکلتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے اوسی چیز کی تصویر سینگ میں اتر آتی ہے اور اکثر اس میں مکھی اور مچھلی کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سینگ گینڈے کا ہوتا ہے راہب نے کہا کہ گینڈا نہیں بلکہ کوئی اور جانور ہے جو انہی شہروں میں پایا جاتا ہے اور کہا کہ بعض نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا کہ یہ جانور ہندوستان کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ نیز اس نے بیان کیا کہ چین کے ہر شہر میں چار قسم کے امراء رہتے ہیں۔ (۱) ایک کو لانجون کہتے ہیں جس کے معنے امیر الامراء کے ہیں۔ (۲) دوسرے کو صراصد جس کے معنی سپہ سالار کے ہیں جس موضع میں کہ بڑا بت ہے جس کی صورت بغبور کی سی ہے اوس موضع کا نام بغران ہے جو مملکت خانقون کے حدود میں ہے چین کے شہروں میں سے جنجون۔ صیبون۔ جنبون ہیں۔ بغبور کے معنے چینی لغت میں آسمان کے بیٹے کے ہیں یعنے جو آسمان سے اترا ہو ۲۶۳ھ ہجری میں جنکی چینی نے بھی مجھ سے اسی طرح بیان کیا تھا۔ میں نے راہب سے مذہب کی نسبت پوچھا تو اس نے کہا کہ اکثر لوگ ثنوی و سمنی مذہب کے ہیں اور عوام بادشاہ کی پرستش کرتے اور اس کی تصویر کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس تصویر کا شہر بغران میں ایک بڑا مکان تقریباً دس ہزار مربع گز ہے جو اقسام کے پتھر اینٹ اور سونے چاندی سے بنایا گیا ہے۔ اس مکان کی طرف جانے والے کو وہاں پہنچنے سے پہلے راستہ میں اقسام کے بت۔ مجسمے۔ تصاویر اور خیالی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور اوس شخص کی عقل کو مبہوت کر دیتی ہیں جو ان چیزوں کی حقیقت اور ان کی غرض وضعی سے ناواقف ہے۔ راہب نے کہا کہ اے ابو الفرج خدا کی قسم اگر نصاریٰ، یہود اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص اللہ جل شانہٗ کی ایسی تعظیم کرے جیسی کہ یہ لوگ اپنے بادشاہ کے علاوہ صرف اوس کی تصویر کی کرتے ہیں تو اللہ اوس کے سر پانی برسائیگا کیونکہ یہ لوگ جب تصویر کو دیکھتے ہیں تو ان پر خوف اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اکثر دفعہ وہاں تک بعضوں کی عقل گم رہتی ہے میں نے کہا کہ یہ سب کچھ ان پر اور ان کے شہروں پر شیطان کے مسلط ہونیکی وجہ سے ہے وہ ان کو بہکاتا ہے تاکہ یہ خدا کے راستہ سے گمراہ ہو جائیں تو راہب نے کہا کہ شاید یہی وجہ ہو۔

راہب کے سوا دوسروں کی روایات

ابودلف ینبوعی نے بیان کیا کہ چین کے ملک اعظم کے شہر کا نام حمدان اور تجارہ وغیرہ کے شہر کا نام خانفو ہے جس کا طول چالیس کوس ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے راہب نے اس کے سوا بہت سارے شہروں کا حال بیان کیا ہے راہب کے علاوہ ایک اور شخص کا بیان ہے کہ چینیوں کے تین سو شہر ہیں جو تمام کے تمام آباد ہیں اور ہر پچاس شہروں پر یغبور کی جانب سے ایک بادشاہ مقرر ہے انہی کے شہروں میں سے درصنوا اور بانصوا ہے اور ایک شہر جس کا نام ارتایل ہے یہاں سے بانصوا تک دو مہینہ کی راہ ہے اور بانصوا تبت۔ ترک۔ تغزغز کی سرحد سے ملا ہوا، ان کے اور چینیوں کے مابین معاہدہ ہیں اور تبت سے خراساں اور ساحل چین تک تقریباً چھ ہزار کوس کا دور ہے چین میں شہر سیلا بڑا بہترین شہر ہے یہاں سونا بمقابل دوسرے شہروں کے زیادہ ہے چین میں نہر رل اور اوس پہاڑ تک جس کے پیچھے سے افتاب طلوع ہوتا ہے اکثر مقامات جنگل اور پہاڑیاں ہیں۔ اندلسیوں کی ایک جماعت نے مجھ سے کہا کہ اندلس اور چین کے مابین اکثر ایسے مقامات ہیں۔ چین کو ارض کبیرہ بھی کہا جاتا ہے۔ اندلس شمال میں ہے اس لئے اس کو مشرق اور بلاد چین سے قریب سمجھا گیا ہے۔ بلاد چین کا مسافر خواہ وہ ہم میں سے ہو یا اون میں سے جب سفر کرتا ہے تو اپنی منزل مقصود کو پہنچنے تک کی مدت کے لئے اپنا نسب۔ حلیہ۔ سن۔ غلام۔ ساتھی اور سامان جو اس کے ساتھ سفر میں ہے لکھدیتا ہے اس خوف سے کہ اگر علاقہ چین میں اس پر کوئی حادثہ ہوجائے تو بادشاہ کے لئے بدنمائی ہوگی۔

چینیوں میں سے اگر کوئی مرجائے تو میت کو لکڑی کے ڈھانچہ میں رکھ کر اس کو ایک سال تک گھر میں رکھا جاتا ہے پھر بغیر لحد کے بغلی قبر میں دفن کردیا جاتا ہے اور تین سال، تین مہینہ، تین دن، تین گھنٹہ تک میت کے اہل وعیال اور اس کے پس ماندوں کو اظہار رنج وملال کرنا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی غمگین نظر نہ آئے تو لکڑی سے اوس کے سر پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو ہی متوفی کا قاتل ہے۔ متوفی جس مہینہ۔ دن اور ساعت میں پیدا ہوا تھا اسی مہینہ دن اور ساعت میں اس کو دفنایا جاتا ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی وہاں کی عورت سے شادی کرلے اور پھر وہاں سے واپس آنے کا ارادہ کرے تو اوس سے کہا جاتا ہے کہ عورت کو چھوڑ دو اور اولاد کو ساتھ لیجاؤ۔ اگر کوئی پوشیدہ طور سے عورت کو اپنے ساتھ لیجائے تو معلوم ہوتے پر اوس کو قید کی سزا دیجاتی ہے اور ایک مقررہ تعداد میں اوس سے جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔

میت جس روز قبر کی طرف لیجائی جاتی ہے اوس دن میت کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کے لحاظ سے راستہ کو اقسام کے دیبا و حریر سے آراستہ کیا جاتا ہے اور میت کے ساتھی واپسی میں ان کو لوٹ لیتے ہیں چینیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ قوم تغزغز سے ہیں بلادِ تغزغز چین کی سرحد پر ہے ۔ تبت اور چین کے مابین ایک گہری ہولناک اور ہیبتناک وادی ہے جس کے مغربی کنارے سے مشرقی کنارے تک پانسو گز کا فاصلہ ہے اس پر چین کے حکماء اور صناعوں نے ایک پل باندھا ہے جس کا عرض دو گز ہے اس پر سے بڑی احتیاط کے ساتھ بدقت چوپائے وغیرہ گزر سکتے ہیں کیونکہ پل پر سہولت سے ٹھہرنے کی گنجایش نہیں اکثر چوپایوں اور انسانوں کو ایک ٹوکرے میں ڈالتے ہیں اور جو لوگ اس پل پر سے عبور و مرور کے عادی ہیں وہ اس ٹوکرے کو کھینچتے ہوئے اوس پار پہنچا دیتے ہیں ۔ چینیوں کی سنت، بادشاہوں کی تعظیم اور اون کی پرستش کرنا ہے اکثر عوام کا یہی مذہب ہے البتہ بادشاہ اور اکابر قوم کا مذہب ثنوی یا شمنی ہے ۔

از

جناب میر تقی علی صاحب

بارش کا موسم تھا۔ اور مطلع بالکل صاف۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ نازنین چاند کی "سنہری زلفیں" دوش عالم پر بکھری ہوی تھیں۔ نور کی بارش ہو رہی تھی۔ روپہلی دریا موجیں لے رہا تھا "لیکن"
"کائنات عالم پر ایک "عظیم سکوت" چھایا ہوا تھا"
میں اپنی روح میں ایک "سکون" پاتا تھا اور قلب میں "طمانیت" مجھے ایک "ناقابل بیان مسرت" حاصل تھی "وہ" جسکی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔

ہاں، میرا ماہ پیکر اور مہ جبین "چاند" اپنی پوری آب و تاب سے میری آغوش میں اپنے حسن کی ضیاء پاشیاں" کر رہا تھا۔

حسن خرد سوز کی سحر کاریوں میں میں نے اپنے آپ کو فراموش کر رکھا تھا۔
"بے نور اور بے رونق" مجھے آسمانی چاند "پھیکا" معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ میرا "چاند" میرے پہلو میں تھا اور...... میں ایک" والہانہ جذبہ" سے اپنے "ماہرو" پر نثار ہو رہا تھا۔
ناگہاں۔ آسمان کی" خاموش فضا" میں ایک قہقہہ کی آواز گونجی...... اور کسی نے طنزیہ کہا: "دیوانے" ناقابل برداشت۔ اف وہ مجھ پر یہ طعن" اچھا" میں نے بھی چبھتے ہوئے لہجہ میں فخریہ جواب دیا:
ہاں۔ ہاں۔ میں بھی ایک" چاند" کا مالک ہوں۔ میرا جواب پھر ایک" قہقہہ" تھا اور پھر اسکے بعد
آہ۔ میری گزشتہ راتیں!

دو بہادر

آنرز

جناب شیخ محمد سرفراز علی صاحب نیوکشس

کیا کہا؟- جی ہاں جو کچھ ہیں بس دنیا میں خانصاحب ہی ہیں۔ مان سنگھ کی قسم آپکا اور" کمانڈنگ" صاحب کا یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ چھتری اور راجپوت پہلے جوانمرد اور شجاع ہوتے تھے۔ اب کمزور اور بزدل ہو گئے۔ اگلے غیور اور خود دار تھے۔ اب بے غیرت اور" داسی" ہیں۔ پہلے ارجن اور بھیم ہوتے تھے۔ اب ذلیل نرے سپاہی اور چوکیدار رہگئے ہیں۔ کیا اُنکی اور پرسویر کی" ڈبل ڈیوٹی" سے ہم ڈر گئے۔ یا اُنکے وقت اور بیوقت کے" بگل" سے ہم چین بول اُٹھے۔ بجلی کیطرح تلواریں سر پر چمک رہی ہوں۔ عقاب کیطرح موت سر پر منڈلا رہی ہو۔ خون کا سیلاب پیروں سے گذر رہا ہو۔ یا آسمان پھٹ پڑے۔ زمین ٹکڑے ہو جائے۔ مگر چھتری کو آپ ہلتا ہوا نہ پائیں گے۔ سمندر کے سکوت سے اُسکے جوش وخروش اور طوفان خیز موجوں کا خیال دل سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہاتھی اگر لاکھ بھی لٹ جائے تب بھی لاکھ ٹکے سے کم کا نہیں ہوسکتا۔ چھتری اور بہادر چھتری اپنے خون سے میدان کارزار کو لالہ زار بناتا ہے۔ خون کی پیاسی تلوار کے لئے کشتوں کے پشتے ڈالدیتا ہے۔ منہہ دکھا کر کبھی پیٹھ دکھانا اِسکو منظور نہیں ہوا۔ ہماری راجدہانی تباہ ہوگئی۔ عزت و وقار ہم سے اوٹھ گیا۔ جاہ و حشم ملیامیٹ ہوگیا۔ تو کیا ہماری رگوں میں ان سورما چھتریوں کا خون نہیں ہے۔ ہماری فلاکت وعسرت اسقدر باعث ذلت ہے۔ ہیرا جب تراشا جاتا ہے تب ہی اسکے پہلو نکلتے ہیں۔ تلوار کے جوہر بہادر کے ہاتہہ بتلاتے ہیں۔ خدا کی شان! ذلیل دو کوڑی کا آدمی اور یوں ہماری قوم کو نام رکھے۔ تیرا سنگھ اب دوبارہ ایسے دلخراش الفاظ نہیں سن سکتا۔ اسکا تو عہد ہی کرلیا ہے۔ یا تو وہ بزدل مغرور ہی نہ ہوگا۔ یا یہہ بدنصیب ہی فنا ہوجائے گا۔

خداداو کرم سنگھ مرحوم کو بیکنٹھ باش کرے: ہم لوگوں کے ہاتھ میں جب کبھی بندوق دیکھتے۔ تو غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتے۔ اور بزدل نامرد سے مخاطب ہوتے۔ کہتے بیٹا۔ بہادری تو ہمارے زمانے میں تھی۔ نہ تو وہ جوش خروش تم لوگوں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ وہ فنون جنگ کے دلکش نظارے ہی نظر آتے ہیں۔ اپنے زمانیکا واقعہ یوں بیان کرتے۔ کہ صبح کا وقت ہوتا تھا۔ امرا اور سرداروں کے لڑکے۔ قیمتی پوشاک پہنے ہوئے۔ چار آئینے سے سجے۔ غربا اور متوسط طبقے کے نوجوان لڑکے سب فنون جنگ کی تعلیم پا رہے ہیں۔ سب میں جنگ آزمائی کا جوش اور بہادری کی آن بان پائی جاتی تھی۔ کوئی "پٹہ" سیکھ رہا ہے۔ کوئی "لکڑی" کہیں پر "بنوٹ" اور "بانکہ" ہو رہی ہے۔ کوئی "تیغ زنی" اور "تیر" اندازی" کی مشق کر رہا ہے۔ ٹھاکر جنگ بہادر جو اکھاڑے کا استاد ہوتا تھا۔ عجب عجب طریقوں سے دل بھی بڑھاتا تھا۔ اور بانکپن بھی سکھاتا تھا اسطریقے سے کہ ایک پان کی گلوری رکھتا۔ اور آٹھ بانسوں میں سے باریک تاگہ میں آٹھ چھوٹے لیمو لٹکا دیتا اور شرط یہہ ہوتی کہ سب لیموں کو بیچ سے اسطرح دو ٹکڑے کر دے کہ تاگہ بھی نہ ٹوٹنے پائے اور سولہ ٹکڑے کٹکر گر جائیں۔ وہی اس گلوری کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ نوجوان گھوڑے دوڑاتے۔ کسی کا گھوڑا آگے نکل جاتا۔ کوئی وار بھی نہیں کرنے پاتا۔ کسی نے تاگہ ہی کاٹ ڈالا۔ کسی نے لیمو کاٹا مگر ساتھ ہی تاگہ بھی کٹ گیا۔ اور کوئی چابکدست ایسا بھی ہوتا کہ گلوری کھا کر ہی اکھاڑے سے نکلتا۔ بیٹا۔ یہہ بہادری اور ایسی شہسواری تھی۔

(۳)

گل خاں۔ ارے یار ہیرا سنگھ۔ آج تو تم بالکل اُدھار ہی کھائے بیٹھے ہو۔ ٹھاکر جی۔ یہہ نوکری ہے سب ہی سخت و سست سنتا اور سہنا پڑتا ہے۔

ہیرا سنگھ۔ جی ہاں خانصاحب سنئے وہ جو کسی کا ذیل اور غلام ہو۔ محنت کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

گل خاں۔ ٹھاکر جی تب بولو۔ یہہ نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ حساس طبیعت اور غیور طبایع کے دل و دماغ کبھی اپنے آپکو زنجیر غلامی میں نہیں جکڑاتے۔ وقت جو گذر گیا اُسکا رنج ہی کیا۔ موجودہ پر نظر کرو اور اپنے بیوی بچوں پر رحم کرو۔

ہیرا سنگھ۔ بہادر کبھی بہادروں کو چاپلوسی اور بزدلی کی رائے نہیں دیتے۔

اجی مہاراج وہ زمانہ اور تھا۔ اور یہہ اور ہے" - کہنے اور کرنے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔
آپ ہی کی قوم کے ایک غیرت مند۔ شریف۔ اور حساس منچلے بہادر کا سچا واقعہ سناتا ہوں۔

(۴)

میرے نانا فیروز خاں اور ٹھاکر جے رام سنگھ میں نہایت دوستی اور بے حد اُنست و محبت تھی۔
اگر مذہب اور لباس کا فرق نہوتا تو کسی کو بھی حقیقی بھائی ہہنے میں ذرہ برابر بھی شک و شبہہ نہوتا۔
تھے دونوں بزرگ بڑے رنگیلے۔ سرے شام سے مادھو رام کلوار کی دوکان میں روز جاتے اور آدھی
رات گئے گھر واپس آتے۔ موضع جلال پور کے اس پار ایک ندی تھی۔ اور ندی کے گھاٹ سے
گنجان جھاڑی شروع ہوگئی تھی۔ کئی کوس تک مہندی کا زبردست بن تھا۔ وہ حصہ بالکل غیر آباد
اور درندوں کا مسکن کہلاتا تھا۔ اُسی زمانے میں ڈاکوؤں نے اپنے ظلم ستم سے دنیا سر پہ اٹھالی تھی۔
بے حد کوشش و مصیبت سے "سات" ڈاکو گرفتار ہو کر آئے تھے اور "سا توں" کو پھانسی پر لٹکایا
گیا تھا۔ مردودوں کی نعشیں وہیں جھاڑی میں پھینکوادی گئی تھیں۔ اس تازہ واقعہ سے عوام میں
نہایت سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک رات میرے نانا خدا اُنکو جنت نصیب کرے۔ حقیقت میں بڑا دلیر
شیر تھا۔ شراب سے جام کو بھرتے ہوئے کہنے لگے۔

(۵)

فیروز خاں۔ کیوں ٹھاکر جی کچھ ہمت ہے۔ جو اُن نعشوں کی اُنگلیوں میں مہندی لگا کر آئے۔
جے رام سنگھ۔ کہو کیا شرط باندھتے ہو۔
فیروز خاں۔ سو روپیہ کی نقد تھیلی۔
جے رام سنگھ۔ منظور۔
یہہ کہکر جے رام سنگھ پیش قبض لینے کے لئے گھر گئے۔ اور اُدھر ہی سے جنگل کا راستہ لیا۔
ایک رات میں جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صرف جھینگروں کی آواز کامل سکوت میں ہلچل پیدا کر رہی
تھی۔ نعشیں بے ترتیب اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ جے رام سنگھ نے مہندی توڑ کر پیسی۔ آسمان کے جگمگاتے
ہوئے تاروں کی روشنی میں اور ٹوٹنے والے تاروں کی چمک سے رات کی تاریکی میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ

(۶)

دو نعشوں کی انگلیوں میں مہندی لگائی گئی تھی کہ چوتھی نعش نے تیسری پر اپنا پیر رکھدیا۔ ٹھاکر جی نے پلٹ کر پیر اتارا۔ اور اُسکو اپنی جگہ پر رکھدیا۔ تیسری نعش کی جب باری آئی۔ تو پانچویں نعش کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہوا نظر آیا۔ ٹھاکر جی کو اُسکی اس بے صبری پر غصہ آگیا۔ اور ایک بھرپور ہاتھ پیش قبض سے اُسکے ہاتھ پر مارا۔ پیش قبض ہتھیلی کے آر پار تھی۔ جب سب کو مہندی لگا چکے تو گھر روانہ ہوے۔ ندی کے قریب پہونچے تھے کہ میرے نانا فیروز خاں ملے۔

فیروز خاں۔ کیوں ٹھاکر جی خیریت تو ہے۔

جے رام سنگھ۔ (غصہ کی تھرائی ہوی آواز سے) کیوں خانصاحب کیا آپ نے مجھکو ڈرپوک اور بزدل سمجھ لیا۔ جو یہاں لینے کے لئے آے۔

فیروز خاں۔ نہیں بھائی حقیقت میں تم نہایت دلیر اور زبردست شجیع ہو۔ یہہ لو روپوں کی تھیلی تم شرط جیت گئے۔

جے رام سنگھ۔ (تھیلی پھینک کر) خوب خانصاحب آپکو دوسروں کی عزت کا خیال رکھنا چاہئے۔ میں حریص اور بزدل لالچی نہیں ہوں۔ جب آپ نعشوں کو دیکھ بھی نہیں چکے ہیں۔ آپکو یقین کیونکر ہوا کہ میں مہندی لگا کر وہیں سے آرہا ہوں۔

فیروز خاں۔ ٹھاکر جی۔ غصہ میں مت آیئے۔ یہہ دیکھو میرا خون آلود ہاتھ اور۔ یہہ مہندی لگی ہوی انگلی۔

جے رام سنگھ۔ پرمیشور۔ یہہ کیا واقعہ ہے "کیا مردہ خانصاحب کی صورت میں۔ یہاں آگیا ہے"۔ میں خود وہاں جاکر اطمینان کرونگا۔ چلئے جناب "مردے خانصاحب میرے ساتھ چلئے"۔

(۷)

صبح کاذب کا نہایت دلفریب سماں تھا۔ مہندی کے پھول ہر طرف کھلے ہوے تھے۔ چڑیاں درختوں پر چہچہا رہی تھیں۔ جے رام نے مردوں کو گنا تو وہاں چھ تھے۔

جے رام سنگھ۔ خانصاحب میرا دماغ معطل ہو رہا ہے۔ وہ زخمی مردہ کہاں غائب ہوگیا۔

فیروز خاں۔ پیارے بہادر ٹھاکر واقعہ یہہ ہے کہ جب تم پیش قبض لانے کے لئے گھر گئے تھے میں دوڑتا ہوا

ہاتھ بھی میرا تھا۔

جے رام سنگھ۔ میرے زبردست شیر بہادر تو تم ہوئے۔ بلا کسی ہتیار کے مردوں میں جا کر لپیٹ جانا۔ یہہ دل تو تمہارا تھا۔ میں کہاں سے بہادر ہوا۔

فیروز خاں۔ نہیں۔ نہیں۔ بہادر تم ہو۔ مردوں کو پیٹھ پر اٹھا کر سلسلہ وار جانا۔ بلا کسی خوف کے اپنے وار کرنا تمہارا ہی کام تھا۔

جے رام سنگھ۔ نہیں۔ نہیں۔ یہہ بالکل غلط ہے۔ یہہ کہکر جے رام دوڑا اور خانصاحب کے سینے سے لپٹ گیا۔ آفتاب کی سنہری کرنیں سب سے پہلے ان دو بہادروں پر پڑیں۔ اور دونوں بیساختہ چلا اٹھے:۔

"دو بہادروں کی جے"

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد ہشتم)

نوائے راز	راز (چاندپوری)
غزل	حبیب الدین صغیر
تجلیات فروغ	محمد حنیف فروغ مرحوم
غزل	″
″	حکیم آزاد انصاری
سچائی	″
غزل	″
تسکین قلب	شید احمد شیدا
خانہ برباد	علی شبیر
وفور اضطراب	جمیل احمد خاں کوکب
غزل	″
قدر وفا	″
غزل	قادر محی الدین ارمان
انجام غم	سید علی اختر
پندار غلط	″
مشاہدات	″
رباعیات	عباس علی قاصر
غزل	علامہ ضیا یار جنگ ضیا
″	″
″	″
زندگی	فخر (حیدرآبادی)
سفینۂ بحر آرزو	″
قند پارسی	حکیم وحید الدین عالی
لطف تغزل	″
غزل	ضمیر الدین احمد عرش
	عبدالحمید خاں خیالی
جدائی	بادشاہ علی نقش
علامہ سر اقبال سے	عبدالحمید شوق
غزل	ابوالضیا رگل
″	قادر حسین قادر

۵۔ تنقید

کتاب	کتاب
دنیائے راز	تاریخ نثر اردو حصہ اول
سالگرہ نمبر صبح دکن	خزینۂ تاریخ حصہ دوم
دیوان اثر	تحریر النساء
تاریخ مغربی یورپ	سرگذشت وزیر خاں لنکران
الکشافہ	پطرس کے مضامین
کانفرنس گزٹ	ہندستانی
منتخبات ہندی کلام	رہنمائے تعلیم جوبلی نمبر
سیرت نبوی اور مستشرقین	چیدن
بچھڑی بیٹی	حریم
تذکرہ سیفی	ادبی اور اسلامی ادارۂ خلاقی
سفر انگلستان	یاد شمسی
طائر خیال	حیدری جنتری
قافیہ مینول	پیام حق

۶۔ تصاویر

حضرت امجد (حیدرآبادی)	محمد سراج الدین بی ایس سی (آنرز)
میر حسین علی خاں بی اے بی ایس سی (آنرز)	نواب بہادر یار جنگ بہادر
ابوالفاضل راز (چاندپوری)	ایم اسلم
سید علی اختر	علامہ عبدالجبار خاں آصفی مرحوم
حکیم وحید الدین عالی مرحوم	حکیم عمر خیام
شوکت بلگرامی	قمر محمود گاواں

مطبوعہ
امداد باہمی
مطبع برقی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن

دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن
کا
ماہوار علمی و ادبی مجلہ
مکتبہ
مدیر
عبدالقادر سروری ام اے۔ ال ال بی
شرکاء
سید محمد ام اے
عمر یافعی

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵) ۷۸۶ رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلستیہ (۰۰۰۰۰)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۷) بابت ماہ تیر ۱۳۴۰ ف م مئی ۱۹۳۱ء شمارہ (۲)

فہرست مضامین

شذرات

انجمن اساتذہ حیدرآباد کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے اجلاس اس دفعہ ۲، ۳ و ۴ امرداد ۱۳۴۲ ف کو حسب معمول سٹی کالج کی عمارت کے وسیع ہال میں منعقد ہوئے۔ کانفرنس کی صدارت اس دفعہ ملک کے مشہور مفکر صدر مجلس عدالت العالیہ نواب [illegible] یار جنگ بہادر نے فرمائی۔ کانفرنس کی تقریباً اکثر مفید تحریکات میں بعض بہت اہم تھیں۔ ان میں مدرسین کے سالانہ گریڈ کی تحریک، امدادی مدرسوں کے انتظام کے لئے باضابطہ مجلس کے قیام کی تحریکیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خطبہ صدارت میں مروجہ تعلیم کے اکثر مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اور تعلیم کو ملک اور قوم دونوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے پر خوب زور دیا گیا تھا۔ نواب صاحب کے خیالات محکمہ تعلیمات کی خاص توجہ کے شایان ہیں۔

انجمن کی مقبولیت اور وسعت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور جتنے کام انجمن کر رہی ہے، وہ یقیناً قابل تحسین ہیں۔ کتنی ایسی مفید تحریکیں انجمن کی اجتماعی آواز کے ذریعہ عوام اور عہدہ داران مقتدر تک پہونچائی گئیں۔ اور بڑی کامیابی یہ ہے، ان میں سے اکثر تحریکوں کا محکمہ کی طرف سے بے حد ہمدردانہ خیر مقدم کیا گیا۔ انجمن درحقیقت ریاست حیدرآباد کے معلمین اور بہی خواہان تعلیم کی مساعی کا مجموعہ ہے۔ انجمن کے کاروبار کا حیدرآباد کی آئندہ شائستگی کی تعمیر میں بڑا حصہ ہوگا۔ اس لئے اس کی کارروائیاں عوام اور خواص کی خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ اس کی تحریکات کا اثر بظاہر تو تعلیمی ادارے ہی تک محدود نظر آتا ہے، لیکن یہ ہے کہ یہ وہ اصول ہیں کہ یہ بالواسطہ ملک کی مجموعی حالت پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

ملک کے تعلیمی نظام کو ایک صحت بخش معیار پر لانا، انجمن کا بنیادی مقصد ہے۔ اور بڑی مسرت کی بات ہے کہ معلمین کی فلاح اس دفعہ کانفرنس کا قابل قدر مطمح نظر تھا۔ معلمین کا افلاس مشہور ہے کانفرنس کی اس تحریک کی کامیابی اس تنگدست طبقہ کے لئے کم سے کم آسایش ضرور پہنچا سکیگی۔

انجمن نے اپنی اس کم عمری میں ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی ستایش کئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔

اس دفعہ کے مضامین میں ایک مضمون اس جوانمرگ کا بھی ہے جس نے اپنا خاتمہ بخیر کرنے سے چند روز پہلے، یہ مضمون مکتبہ کے لئے لکھ بھیجا تھا۔ اور بڑا مستحکم وعدہ کیا تھا، کہ آئندہ "مکتبہ" کے لئے برابر لکھتے رہینگے۔ لیکن افسوس

عمر بھر کا اس نے پیمان وفا باندھا تو کیا   عمر کو بھی تو نہیں ہے استواری ہائے ہائے

خدا غریق رحمت کرے شبیر علی، کالج کے محنتی اور سمجھ دار طالب علموں میں سے تھے۔ جماعت میں ان کی محنت کو دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے پہلو میں ایسا بودا دل ہوگا کہ امتحان کی ناکامی کے صدمے سے وہ جان بر ہو سکیں گے۔ "شیر شاہ سوری" پر انھوں نے خاص طور پر کام کیا تھا۔ جس کا کچھ حصہ "مجلۂ عثمانیہ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ "شیر شاہ سوری" جس محنت اور چھان بین سے لکھا گیا ہے، اس کو دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ حیدرآباد ایک ادیب مورخ کی ترقی پذیر کوششوں سے محروم ہو گیا۔

"مکتبہ" کے ایک اور مضمون نگار، صفی الدین احمد صاحب، جو نظام کالج کی جماعت بی، اے میں پڑھتے تھے، چند روز کی علالت میں چل بسے۔ ان کا ایک مضمون "ٹیگور اور رومین رولینڈ کا مکالمہ" کسی ماقبل کی اشاعت میں شایع ہو چکا ہے۔ انھیں مضمون نگاری کا بڑا شوق تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

[illegible]

تجربیت اور عقلیت

(از)

جناب محمد معجز علی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

(۱)

تاریخ فلسفہ کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تجربیت و عقلیت کے مسالک نے کس قدر فلاسفہ کو اپنی طرف کھینچا، کس طرح ان کی وجہ سے فلاسفہ میں تفریق پیدا ہوئی، کس طرح ایک مسلک کا حامی دوسرے مسلک کی تردید کے لئے کمربستہ رہا۔ تجربیت اور عقلیت کا باہمی تضاد اور تصادم کوئی عارضی اور چند روزہ نہیں تھا بلکہ اس کے عناصر ہمیں تاریخ فلسفہ کے ابتدائی دَور، قرون وسطیٰ اور دَورِ جدید میں ارتقائی شکل میں ملتے ہیں۔ یہ دو طریقے علمیات کی تشکیل اور تکمیل میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں، نیز علمیاتی ماخذ اور حدودِ علم کی ابتدا اور اصل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

عام طور پر اہل یونان علم کا مدار ان اشیاء پر رکھتے ہیں، جو ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں کیونکہ یونانی لفظ "واڈا" (Oida) یعنی میں جانتا ہوں کا مصدر "یڈ" (ED) جس کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ اس عام تصور کا ایک دلچسپ ثبوت یہ ہے کہ ہومر اپنے ایک عظیم الشان کارنامے کے آغاز میں "دیوتیوں" (Muses) سے امداد چاہتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ اس لئے وہ تمام اشیاء جان سکتی ہیں۔ بالکل اسی قسم کا خیال قدیم یونانی فلاسفہ میں سرایت کر گیا تھا، کہ علم صرف مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جب مشاہدہ ہی علم کا ماخذ ٹھہرا، تو ان ہی آلات کی قدر و قیمت ہونے لگی جو مشاہدہ کے لئے اہم اور ضروری ہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ انسان کبھی اپنے حواس سے مستغنی ہو کر مشاہدہ نہیں کرتا اور نہ اس کا امکان ہے۔ مشاہدہ کے لئے [illegible]

اعتماد کرے اور وہ جو مواد ہمارے لئے مہیا کریں، علم کی عمارت کے لئے کافی سمجھیں۔ سوفسطائیہ[1] کے امام اعظم پروٹاگورس نے حواسی علم پر، ایلیائیہ[2] کے خلاف میں زور دیا۔ ایلیائیہ حواس کو دھوکہ دہ اور فریب والتباس میں مبتلا کرنے والے قرار دیتے تھے۔ اس کے برخلاف پروٹاگورس نے یہ ثابت کیا، کہ کلی صداقتوں کا امکان نہیں۔ یہ محض عقل کی گمراہ کن چال ہے۔ جتنے ذہن ہوتے ہیں، اتنی صداقتیں ہوتی ہیں۔ بالکل یہ ہی حال جمالیاتی نقطہ نظر کا ہے۔ ملک چین میں جو خوبصورتی کا معیار ہے، وہ ہرگز جاپان میں قائم نہیں کیا جاتا اور جو معیار جاپان میں قابل قبول ہے اس کا اطلاق یورپ کے کسی ملک پر نہیں ہوسکتا۔ مختصر یہ کہ ایک حبشی اپنے بچے کو دنیا کے حسین ترین بچوں میں خیال کرتا ہے اور اپنے نزدیک صرف اس کو ہی انعام کا مستحق قرار دیتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوا، کہ وہ ہی شئے قابل تیقن ہے جو حواسی معیار پر پوری اترے، کیونکہ "خرد ہر شئے کا معیار ہے"۔

(۲)

احساسات اور ادراکات حواسی کی شکل زمانہ جدید میں، لاک اور ہیوم کے ہاں تجربیت کے مستقل مسائل میں تحویل ہوجاتی ہے۔ ایک فرانسیسی عالم — کون ڈی لاک (۱۷۱۵ — ۱۷۸۰) نے دور جدید میں حواسی علم کی صداقت کے ثبوت کے لئے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وقف کردیا اس مشہور عالم نے حواس کے وجود کی اہمیت کو اچھی طرح آشکار کردیا اور بتلایا کہ انسانی علم کا دارومدار صرف ہمارے حواس پر ہے۔ فکر بھی ہمارے احساس ہی کی پیداوار ہے۔ اس کے ثبوت میں بڑی ذہانت پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرض کرو کہ ایک بت ہے، جو ذی اعضا اور زندہ ہے؛ لیکن اس کی جلد سنگ مرمر کی ہے۔ اس لئے وہ باہر سے احساسات کے تہیجات حاصل نہیں کرتا۔ جوں جوں اس سنگیں خول کے مختلف حصے ہٹتے جاتے ہیں، اس

---

[1] یہ سقراط کے زمانہ میں تھے۔ اخلاقیات کی عمارت منہدم کرنا چاہتے تھے۔ سقراط نے ان کے برخلاف اخلاقیات کی بنیاد مستحکم کی۔ سوفسطائیہ کا خیال ہے کہ کلی صداقتوں کا وجود نہیں بلکہ جزی صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مدعی عقل کہلاتے ہیں۔ "خرد ہر شئے کا معیار ہے" ان کا بڑا اصول تھا۔

[2] ایلیا جنوبی اٹلی میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں زنوفز، پرمیانڈس اور زینو رہتے تھے۔ ان کے فلسفہ کو ماننے والے

زندہ بت کی ذہنی اور اخلاقی زندگی ترقی کرتی جاتی ہے۔ پہلے آلۂ شامہ پر سے سنگ مرمر کا پردہ ہٹا دیجئے، اب اس کو صرف بُو کا احساس ہوگا۔ بو کے سوائے وہ کسی اور چیز کا ادراک نہیں کرسکیگا۔ امتداد، شکل، رنگ اور آواز وغیرہ کا تصور بالکل نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یکے بعد دیگرے سنگ مرمر کے پردے ہٹا ڈالیں تو اس کو ذوق، سمع، بصر اور لمس وغیرہ کا علم ہونے لگتا ہے اس طرح ذہنی زندگی میں بڑی کثرت اور پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اب ہمیں بخوبی پتہ چلا کہ سارا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ حواس سے ماورا، کوئی علم نہیں۔ اس کی کوشش مابعد الطبیعاتی تجریدات میں مبتلا کرتی ہے، جو تضیع اوقات کے سوائے کچھ نہیں۔

اک اور ہیوم زمانہ جدیدہ میں تجربیت کے حامی گذرے ہیں۔ ہر ایک نے اپنا سارا زور اور ساری زندگی اس مسلک کی حمایت میں صرف کردی۔ ان کا خیال ہے کہ حقیقت کا علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ مسلک عقلیت کے بالکل متضاد ہے۔ اس کی رو سے جیسا کہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ حواس اور مشاہدہ وغیرہ علم کے اساس ٹھہرتے ہیں۔ تجربیت کا اساسی تعقل یہ ہے کہ علوم کے دو حصے ہوتے ہیں جو بہ لحاظ ماہیت اور طریقہ کار ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں،

(۱) پہلی صنف علوم عقلیہ مثلاً ریاضیات۔

(۲) دوسری صنف علوم خارجیہ مثلاً طبیعات و نفسیات وغیرہ۔

عقلیت کی غلطی یہ ہے کہ وہ صرف ایک حصہ کی قائل ہے یعنی ریاضیات کی۔ اور وہ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ دوسرے علوم اسی طرز پر ڈھالے جائیں؛ لیکن یہ ناممکن ہے۔ ریاضیات کا تو یہ خاصہ ہے کہ وہ حقیقت کے وجود اور اس کے طرز عمل کے متعلق کچھ نہیں کہتی، بلکہ تعقلات کے استخراج سے بحث کرتی ہے۔ اقلیدس سے یہ منشا، نہیں ظاہر ہوتا، کہ یہ شکل دائرہ ہے، بلکہ دائرے کی تعریف سے یہ نتائج صادر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس تعریف کو تسلیم کرے تو لازماً اس کے نتائج بھی ماننا پڑینگے۔ یہ اقلیدس سے خارج ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز حقیقت میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔

دوسری صنف سے جن علوم کا تعلق ہے، ان کا طرز بالکل جدا ہوتا ہے، نفسیات اور طبیعات

علٰحدہ ہیں تجربیت کا کہنا ہے کہ ان کا علم ہم کو صرف تجربے سے مہیا ہوتا ہے۔ نفسیات میں ہم محض نفس یا ذہن کے تعقل سے نفسیاتی اعمال واحوال کی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ طبیعیات میں ہم جن نتائج پر پہنچتے ہیں وہ صرف اختیار و مشاہدہ کا ثمرہ ہوتے ہیں، مثلاً ہم صرف تفکر اور تصور سے یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہر وہ شے جو اوپر پھینکی جائے یا تو وہ اوپر ہی اوپر گردش کرے گی یا کوئی خاص سمت اختیار کرے گی ہم صرف تجربے ہی سے یہ بتلا سکتے ہیں کہ اوپر پھینکی ہوئی شے قانون کشش کے تحت ضرور نیچے واپس ہوگی۔ ہم صرف تجربے سے ہی یہ بتلا سکتے ہیں کہ سورج کی کرنیں اثیر سے گذر کر اتنے عرصہ میں زمین تک پہونچتی ہیں۔ تصور و تفکر سے ہمیں کسی قسم کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ روایت حسب حال ہے کہ ابتداءً ابنائے آدم اپنی عقل سے نہیں بتلا سکتے تھے کہ مردے کو کہاں اور کس طرح دفن کرنا چاہئے! یا یہ کہ ان کی عقل یہ نہیں بتلا سکتی تھی کہ برف کے چھونے سے کیا اثرات پیدا ہونگے!

(۳)

تجربۂ جدیدہ کی شہرت کا سہرا جان لاک کے سر رہا ہے۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سارے تصورات تجربہ سے مستخرج ہیں۔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فہم انسانی" میں اس نے واضح طور پر بتلادیا۔ انسان وہبی یا حضوری تصورات لیکر نہیں پیدا ہوتا۔ ڈیکارٹ جس کو آدم فلسفہ جدید کہا جاتا ہے؛ اس نے 'انا' کے اثبات کے بعد، تصورات کی سہ گونہ تقسیم کی:۔

(۱) اول تو وہ تصورات جو ہمارے ذہن کے آفریدہ ہیں۔ مثلاً شاعرانہ تخیلات۔

(۲) دوسرے وہ جو خارج سے ماخوذ ہوتے ہیں مثلاً محسوسات۔

(۳) تیسرے ایسے تصورات جو ذہن کے آفریدہ ہیں اور نہ خارج سے حاصل کردہ بلکہ پیدائش سے ہمارے ذہن میں پائے جاتے ہیں مثلاً اپنی ذات کا تصور۔ اسی صنف میں ڈیکارٹ نے خدا کا تصور شامل کیا۔ ان ہی کو وہبی یا حضوری تصورات کہا جاتا ہے۔

لاک ان ہی حضوری تصورات کا منکر ہے اس کا خیال ہے کہ اگر حضوری تصورات کا وجود ہوتا تو یہ تمام بنی نوع انسان کے ذہن میں پائے جاتے مگر بچوں اور وحشیوں کے ذہن میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ہم قوانین اخلاقیہ کو بھی حضوری تصورات میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ بعض

ہاں اچھی ہی وہ دوسرے کے ہاں مذموم ہے۔ ڈیکارٹ نے خدا کے تصور کو ایک اولی تصور ثابت کیا ہے مگر لاک یہ کہتا ہے کہ کسی طرح یہ اولی تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ کئی جماعتیں اور قومیں ایسی ملینگی جہاں خدا اس کے مرادف کوئی لفظ نہ ملیگا۔ بفرض محال یہ تصور عام اور کلی بھی ہو تو لازم نہیں آتا کہ حضوری ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور آفتاب وغیرہ کے تصورات کو کلی طور پر پائے جاتے ہیں اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں، محض ان کی کلیت اور عمومیت کے باعث وہبی تصورات کہیں تو سخت غلطی ہوگی۔ اگر ہم وہبی تصورات کے مالک ہوتے تو اس کا اظہار ایک نوزائیدہ بچہ میں بھی ہونا چاہیے۔ لیکن بچوں میں حضوری تصورات کا نام نہیں ہوتا۔ اگر ہم وہبی تصورات مان بھی لیں تو ان کے عود کرنے کے لئے ایک عرصہ کی کیوں ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ وہبی تصورات مان کر ان کے نمو و ظہور کے لئے ایک عرصہ کی ضرورت ماننا خالی از اجتماع النقیضین نہیں۔

جان لاک کا منشا یہ ہے کہ تمام تصورات حصولی اور اکتسابی ہیں۔ تمام علم تجربے سے حاصل ہوا ہے۔ ذہن ایک لوح سادہ ہے، جو ہر قسم کے نقوش اور حروف سے معرا اور تمام تصورات سے خالی ہے۔[1] اب اس کا ساز و سامان کس طرح مہیا ہوا؟ وہ تمام ذخیرہ جو انسان کے بے پایان تخیل اور بے انتہا تنوعات کے ساتھ فراہم کر رکھا ہے کیسے فراہم ہوا؟ مختصر یہ کہ عقل و علم کا مواد کس طرح جمع ہوا؟ اس کا جواب میں ایک لفظ میں دیتا ہوں، کہ تجربے سے! ہمارے علم کی بنیاد ہی تجربہ ہے۔ ہمارا سارا علم بالآخر تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ وہ چیز ہے، جو ہماری فہم کے لئے مواد فکر مہیا کرتا ہے۔ پس یہ ہی دو چشمے ہیں جہاں سے وہ تمام تصورات جو ہم میں موجود ہیں یا جو فطرتاً موجود ہوتے ہیں، ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک میں دریافت کر سکتا ہوں، یہ ہی وہ منافذ ہیں جن کے ذریعے اس تاریک کمرے میں روشنی جا سکتی ہے، کیونکہ میرے خیال میں فہم انسانی اس کمرے سے زیادہ غیر مشابہ نہیں ہے، جس میں روشنی کا گذر نہیں اور جس میں چند ایسے روزن ہیں جو خارجی اشیا کے تصورات کو اندر داخل ہونے دیتے ہیں"۔

"ذہن کی رسائی کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اور افکار عالیہ کی وجہ سے کتنا ہی رفیع اور بلند کیوں نہ نظر آئے تاہم ان پر ان کے تصورات سے ذرہ برابر آگے نہیں جو حس اور تامل کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں"۔ الحاصل تمام علم کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ ہی کی تکمیل کا نتیجہ ہے۔ عقل میں کوئی چیز ایسی

---

[1] یہ عبارت فلسفہ کی پہلی کتاب (باب ۱۴ بعنوان علمیاتی مسائل یا نظریہ علم) سے لی گئی جس کے مترجم پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

نہیں جو پہلے حواس میں نہ تھی"۔ اس سے واضح ہوا کہ عقل کا وصف عورت کا سا ہے، جو علم کا مواد بذاتِ خود پیدا نہیں کر سکتی۔

ہیوم نے لاک کے ان ہی خیالات کی تکمیل کی ہے، اور ان کو اپنے منطقی نتائج تک پہونچایا۔ چونکہ عقلیت کے حامی ہمیشہ قانون علیت وغیرہ کے حضوری اور اولی ہونے کو اپنی حمایت میں بطور آلات کے استعمال کرتے تھے۔ اور تجربیت کے خلاف یہ ثابت کرتے تھے کہ تجربہ سے ہمیں مندرجہ بالا قوانین کا علم نہیں ہو سکتا۔ یہ حضوری تصورات ہیں۔ لہذا عقل ہی اہم اور اصل شے ہے۔ مگر ہیوم یہ چاہتا ہے کہ عقلیت کے آلاتِ کار چھین لیں اور اس کے حامیوں کو بے دست و پا کر دیں۔ اس نے بڑی حد تک اپنے نصب العین میں کامیابی حاصل کی۔

ہیوم کے ہم خیال ہوتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام علم جزئیات سے شروع ہوتا ہے۔ ہیوم کی ساری طاقت قانون علیت کو اکتسابی اور تجربی ثابت کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم روزمرہ کے مشاہدے سے اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ ایک شے اور اس کے اثرات و نتائج میں تعلق و ربط قائم کریں۔ شعلے کے دیکھنے کے بعد ہم اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ حرارت ہوگی۔ ہم برف کے چھونے کے ساتھ ہی سردی کی امید رکھتے ہیں۔ بلیرڈ کے ایک گولے کو حرکت دینے کے بعد ہم متوقع ہوتے ہیں کہ دوسرے گولے میں حرکت ضرور ہوگی۔ اسی طرح کئی چیزوں کو یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم فطرتاً یہ نتائج نکالتے ہیں کہ دونوں میں ربط علیت ہے۔

ہیوم نے اپنے عظیم الشان نظام فلسفہ میں اس بات کو بالکل واضح کر دیا کہ علت و معلول کے باہمی ربط و علاقہ کا علم ہمیں مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے کہ مماثل اشیا ایک ساتھ ملتی ہیں۔ ایک قسم کے واقعہ کے اظہار کے ساتھ دوسرے واقعات کا انکشاف پاتے ہیں۔ دو چیزوں کے دائمی اجتماع کی وجہ سے ہم عادتاً ایک کے ظہور کے بعد دوسرے کے ظہور کی توقع کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اشیا کے دائمی ربط کا تجربہ ان کے باہم تعلق کا یقین پیدا کرتا ہے۔ یہ یقین نفس انسانی کا ایک ضروری امر ہے۔ ایک فطری جبلت ہے۔

اس طرح تجربیت کے حامی تجربہ کی پرستش کرتے رہے اور عقل کا کچھ دخل سمجھنا اپنے مسلک کی

(۴)

فلسفہ اپنے ابتدائی دور ہی میں حواس کو علم کا مبدء ماننے سے گریز کرتا رہا۔ حواس کا اعتماد محض اس وجہ سے اٹھ گیا کہ اس نے انسان کو دھوکے اور التباس میں مبتلا کر رکھا۔ یہ اعتقاد عام طور پر پھیل گیا کہ اشیا کی اصلیت و حقیقت ان کے ظاہرا دکھاوے میں نہیں بلکہ ان کے اصل وجود کا پتہ مجرد تصورات ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ تصورات کسی طرح حواس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ذہنی اعمال کا نتیجہ ہیں محض یہی وجہ ہے کہ عقلیت کا آغاز فلسفہ میں بہت جلد ہوتا ہے۔

اس سے پہلے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایلیائیہ کا یہ خیال تھا کہ حقیقت کا علم ہمیں صرف تصورات سے حاصل ہوتا ہے۔ فلاطون ایلیائیہ کے طرز پر چلتا ہے اور اس میں اس خیال کا اضافہ کرتا ہے کہ روح جسم میں مقید ہے اور جسمانی اثرات کی وجہ سے بلند پروازی سے قاصر ہے۔ اور حقیقی علم کا امکان اسی وقت ہوتا ہے جبکہ جسمانی ضروریات کو پوری طرح سے مغلوب کر دیا جائے۔ سینٹ آگسٹائن نے فلاطون کے اصول پر سختی سے پابندی کرتے ہوئے بتلایا کہ ہمارا ذہن کسی اور شے کو اتنے تیقن اور بداہت کے ساتھ نہیں جان سکتا جتنا کہ وہ خود اپنے کو۔ اور کوئی شے اتنے تیقن کے ساتھ نہیں پیش کی جا سکتی جتنی کہ خود اپنی ذات۔

جس طرح یونان کے فلسفیانہ مذاہب اور ان کے بانی ___ ہرقلیطوس، ایلیائیہ، دیمقراطیس اور فلاطون سب کا یقین تھا کہ عقل نہ کہ حواس ہمیں صداقت تک پہنچا سکتی ہے اسی طرح فلسفہ جدیدہ کے مذاہب عقلیہ ہیں۔ چنانچہ ڈیکارٹ، ہابس، اسپنوزا اور لائبنٹز سب اپنے فلسفیانہ مسائل میں عقلی ہیں۔ لہٰذا عقلیت سب سے پہلا حکیمانہ نظریہ علم ہے۔ تجربیت بعد کی پیداوار ہے۔ اس کا وجود مابعد الطبیعاتی نظام اور ان کی علمیات کا ایک ناقدانہ تبصرہ ہے۔ اسی قسم کی تنقید سے یہ ظہور پذیر ہوا۔

عقلیت کی رو سے حکیمانہ علم 'عقل' کا پیدا کردہ ہے۔ حواس کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ غلطی اور دھوکے کا سبب ہے حواس غلطی اور التباس میں مبتلا کرتے ہیں۔ حواس کی وساطت سے آفتاب ہمیں بالشت یا ڈیڑھ بالشت کا ایک چھوٹا سا مدور جسم نظر آتا ہے۔ اور یہ متحرک بھی نظر آتا ہے۔ مگر عقلی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس مدور جسم کا قطر (۸۶۲۳۰۰) میل ہے اور اس کی جسامت زمین سے بقدر (۳۴۵۰۰) کے زائد ہے۔ کوپرنکس کی تحقیقات نے اور بھی حواس کے عطا کردہ علم کی قلعی کھول دی۔ اب تک مرکز عالم زمین سمجھی جاتی تھی مگر اس نے قدیم نظام بطلیموسی کے خلاف یہ بتلایا کہ مرکز عالم آفتاب ہے جس کے گرد ہماری زمین اور دوسرے سات سیاروں سمیت چکر لگا رہی ہے۔ حواس کے فریب کی وجہ سے آفتاب متحرک نظر آتا ہے۔

[illegible]

دیکھیں تو چلنے پھرنے والے انسان بونے نظر آتے ہیں۔ مگر نیچے اتر کر مشاہدہ کریں تو وہ ہرگز بونے نہیں معلوم ہوتے بلکہ پانچ یا ساڑھے پانچ فیٹ قد والے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں جہاں ہمارے حواس ہم کو دھوکہ دیتے ہیں، اور التباس کا باعث ہوتے ہیں۔ اسلئے ہمارا اعتماد حواسی علم اور تجربے سے اٹھ جاتا ہے۔ الحاصل علم و یقین کا حقیقی معیار عقل و فہم ہے نہ کہ محض احساس و تجربہ۔

لہٰذا کسی شے کی حقیقت و اصلیت کے جاننے کے لئے حواسی علم کافی نہیں بلکہ عقل کی تصحیح و تنقیح کی سخت ضرورت ہے۔ تجربے سے تو ہمیں جزوی اشیاء کا علم ہوتا ہے جس میں کلیت اور وجوب مفقود ہوتے ہیں۔ درحقیقت علم منتشر پراگندہ خیالات کا نام نہیں بلکہ ایک مربوط اور منتظم شکل کا نام ہے اس لئے عقل ہی ہمیں حقیقی علم سے مستفید کرتی ہے۔ ڈیکارٹ اسپنوزا اور لائبنز وغیرہ دور جدید کے مشہور مفکرین ہیں، انھوں نے اپنا سارا عظیم الشان فلسفہ عقلیت کے حمایت میں لکھ ڈالا۔ ان کے مسائل اس بنیاد پر رکھے گئے ہیں کہ جس چیز کا ہمیں واضح اور غیر مشتبہ طور پر علم ہوتا ہے، وہی حقیقی ہوتی ہے۔ ریاضیاتی حقایق کا مدار بھی اسی جلی اور واضح تصور پر قائم ہوتا ہے۔ ریاضیاتی حقایق جو اٹل اور مستحکم ہیں کسی طرح حواس سے حاصل شدہ نہیں بلکہ ہمارے وہبی تصورات اور عقل کا نتیجہ ہیں۔

(۵)

اب ہمیں یہ واضح ہو چکا ہے کہ تجربیت اور عقلیت کا دائرہ عمل کیا ہے۔ اور یہ کن کن اصول پر کاربند ہیں۔ عقلیت و تجربیت کا مناقشہ ایک پرانا مناقشہ ہے۔ ان مسلکوں کے حامی حد اعتدال سے متجاوز ہو چکے ہیں۔ اس نقص کو کانٹ نے اپنی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے رفع کیا۔ اس نے تجربیت اور عقلیت سے وہ عناصر لئے جو اس کے نزدیک صحیح ثابت ہوئے یعنی اول الذکر سے یہ کہ حواس ہم کو منتشر تصورات یا عقل کا مواد خام فراہم کرتے ہیں اور آخر الذکر سے یہ کہ ہم میں حضوری تصورات موجود ہیں، زمان و مکان وجدان کی صورتیں ہیں اور فہم اپنے مقولات رکھتی ہے۔ جب یہ مواد خام، فہم کے مقولات اور زمان و مکان کی صورتوں میں ڈھل جاتا ہے تو تب جاکر کہیں ہمیں صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ حواس جو ہمیں باہر سے مواد خام بہم پہنچاتے ہیں، فہم کے رنگ میں رنگے جانے کے بعد علم کے مقولات کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کانٹ نے احساسات اور تعقلات دونوں کو قبول کیا۔ اس کا مشہور قول یہ ہے کہ "ادراکات بغیر تعقلات کے کور ہوتے ہیں اور تعقلات بغیر ادراکات کے تہی"۔۔۔ اس سے کانٹ کے طرز عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اسلامی ادبیات کا اثر

دانتے کی تصنیف

ڈوائن کامیڈی پر

(از)

جناب احمد بدر الدین صاحب

باب سوم

ڈوائن کامیڈی کے مزعومہ عیسائی ماخذ — عالم آخرت کے متعلق عیسائی قصوں کا مواد بھی اسلامی ادبیات سے ماخوذ ہے — باب چہارم سے اتصال۔

ڈوائن کامیڈی کے پیشرو عیسائی قصّے جو قرون متوسط میں زبان زد تھے، ان کی اسلامی خصوصیتوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے[1]

پہلی قسم میں وہ اسلامی خصوصیتیں ہیں جو قرون متوسط کے قصّوں کے بعد مکرر دانتے کی

---

[1] بلا شبہ عیسائی قصوں کے متعلق مفصل بحث نہیں ہو سکی۔ امور مذکورہ کے علاوہ (D'Ancono.) دانکونو اور (Graf.) گراف ان قصوں کو نقل کرتے ہیں جو سیاسی، مزاحی اور لطائف کے متعلق ہیں چنانچہ دیکھو کتب "صدور" اور "تذکرہ"

نظم میں ظاہر ہیں اور جن کو باب اول و دوم میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے - یہ اور وہ عیسائی قصے جن میں ان کا تذکرہ ہے مختصراً گنائے جاتے ہیں :-

(۱) دوزخ کا سات حصوں میں تقسیم ہونا -
(۲) دوزخ میں آٹھ درجے ہیں -
(۳) دوزخ کے خاص عذاب جیسے آتشی لباس
(۴) آتشی مقبرے -
(۵) پگھلی ہوئی دھات اور گندھک -
(۶) گناہگاروں کا ایک تالاب میں غوطے کھانا -
(۷) آگ کی تدریجی شدت -
(۸) شیاطین کا ہاتھوں میں کلنٹے لئے ہوئے ہونا -
(۹) بھوت کے ذریعہ عذاب
(۱۰) بھوت کا سانس کے ذریعے سے گیہ وگزاشت کرکے تکلیف دینا -
(۱۱) گناہگاروں کا نیچے سر کرکے لٹکانا -
(۱۲) زمین پر سولی دینا -
(۱۳) سانپوں کا ان کو نگل جانا -
(۱۴) بوجھ سے لاد دینا -
(۱۵) ناجائز کمائی کو نگلنے پر مجبور کرنا -
(۱۶) برف کے ذریعے تکلیف دینا -
(۱۷) جن کی تصویر جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا -
(۱۸) ابلیس کا دوزخ کے سب سے نچلے حصے میں قید ہونا [1]

---

[1] (۱) St. Macarius, Edda. (۲) Barid of Regio Emilia.
(۳) St. Patrick (۴) St. Patrick

دوسری قسم میں وہ اسلامی خصوصیتیں ہیں جو عیسائی قصوں میں تو نظر آتی ہیں لیکن ڈوائن کا کامیڈی میں نہیں ہیں۔ ان خصوصیتوں کا گذشتہ حصوں میں تذکرہ نہیں ہوا اس لئے ان کا تفصیلی تذکرہ اس حصے میں ہوا ہے۔ ان میں سے اہم تر یہ ہیں:۔

(۱) توازن کی وہمی شخصیت۔
(۲) پھسلنا پل۔
(۳) عذاب قبر۔
(۴) قیامت کے دن شفاعت اور سفارش۔
(۵) گناہگاروں کا برہنہ ہونا۔
(۶) دیوانی گائے کے ذریعے سے عذاب۔
(۷) گناہگاروں کو جنت کی جھلک دکھانا تاکہ ان کی تکلیف میں اضافہ ہو۔
(۸) سو ہاتھوں والا شیطان۔
(۹) لعنتیوں کا سیاہ رنگ کے پرندوں کی صورت میں مسخ ہونا
(۱۰) نیک ارواح اور فرشتوں کا سفید پرندوں کے قالب میں آنا۔
(۱۱) حضرت آدم علیہ السلام کا جنت میں بوقت واحد ہنسنا اور رونا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)
(۵) St. Patrick & Tendal
(۶) St, macarius, St, Patrick & Alberic.
(۷) St. Paul.
(۸) Tendal.
(۹) Tendal.
(۱۰) Tendal & St, Patrick, & St, Paul.
(۱۱) St, Patrick, Alberic & St. Paul.
(۱۲) St, Patrick.
(۱۳) St, macarius, St, Patrick & Alberic,
(۱۴) Edda,
(۱۵) Turcill,
(۱۶) Tendal, St, Patrick & Alberic.
(۱۷) St. Macarius.
(۱۸) Alberick.

(۱۴) اچھی زندگی کوشاہانہ یا مذہبی تقریب سمجھنا علہ

نیز آخری چار ابواب میں جو خاص خصوصیتیں ہیں وہ قابل ذکر ہیں مثلاً سینٹ براندن کا سفر اور اس کے مناظر جیسے دسترخوان پر غذا اور بڑے بڑے انگور کا ہونا، یوداس کو (جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غداری کی تھی) عذاب دیا جانا، بحری راہب کا تذکرہ، وہیل مچھلی کا جزیرہ، سونے والوں کا قصہ، عذاب سے تھوڑی دیر آرام ملنا، روح کے متعلق بحث کرنے کے قصے، نیکیوں اور برائیوں کو مجسم شکل عطا کرنا، اور اعضاء جسم کا ملامت کرنا۔

دانتے کے قبل کے عیسائی قصوں میں اسلامی خصوصیتوں کا بکثرت پایا جانا صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کرسکتا ہے وہ یہ کہ دانتے کے پہلے یورپ میں آیندہ زندگی کے متعلق جو شاعرانہ خیالات پھیلے ہوئے تھے وہ اسلام کے اتصال کے باعث پیدا ہوئے تھے نہ یہ کہ خود یورپ نژاد۔ کیونکہ اُن شاعرانہ وہمی قصوں اور ان کی تفصیلی خصوصیتوں میں سے متعدد ایسی ہیں جن کا

علہ (۱) Ch. V.

(۲) Tendal, st. Patrick, st. Paul, Abbot joachin.

(۳) Hugh of Brandenburg, st. Brandan.

(۴) Ch. V.

(۵) Ch. V.

(۶) Tendal.

(۷) Tendal

(۸) Tendal.

(۹) Edda other in ch. IX.

(۱۰) St. Macarius, st. Brandan.

(۱۱) Turcill.

عیسائی مذہب میں کوئی وجود اور بنیاد نہیں ۔ وہ اصل میں مشرقی مذاہب سے ماخوذ ہیں اور اسلامی توسط نے ان کی صورت شکل میں چار چاند لگا دیے ہیں ۔

دوسرے باب کے آخر میں جو شبہات دل میں پیدا ہوتے تھے وہ غالباً دور ہو چکے ہونگے ۔ اس باب کے آخر میں ہم نے اپنی تحقیقات سے جو فطرتی نتیجہ اخذ کیا تھا وہ یہ تھا کہ ڈوائن کامیڈی اور اسلامی ادبیات متعلق حشر و نشر میں جو کثیر التعداد امور مشترک پائے جاتے تھے ان کے باعث دانتے کی نظم اور اسلامی ادبیات میں کسی تعلق کو مانا جائے ۔ اس نظریے پر دانتو یا تیوں کی جانب سے یہ اعتراض ممکن تھا کہ ڈوائن کامیڈی کے تصنیف میں شاعر پر دراصل صرف پیشرو عیسائی قصوں سے (اور وہ بھی غیر صریح طور سے) اثر پڑا ہو، لیکن یہ اب واضح کر دیا گیا ہے کہ ان عیسائی قصوں میں بھی بلا شبہ و شک اسلامی اثر کارفرما نظر آتا ہے ۔ اب وہ ممکنہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے اور ہم دانتے کو اسلام کے ساتھ دہرا رشتہ رکھا پاتے ہیں :۔ عیسائی پیشرو قصوں کی اسلامی خصوصیتوں کا بالواسطہ تعلق اور اسلامی عناصر کا جو ڈوائن کامیڈی میں ہیں، براہ راست تعلق ہے ۔

ہماری تحقیقات کے اس آخری موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دانتے کو آئندہ زندگی کے متعلق اسلامی تخیلات کا علم بھی تھا اور اگر تھا تو وہ کس ذریعے سے حاصل ہوا؟ اس سوال کا جواب ہمارے استدلال کی آخری کڑی ہے ۔
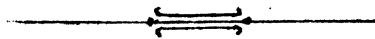
باب چہارم

(اقتباس کی جگہ اس باب کا پورا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔)

یورپ پر اسلامی اثرات

(۱) تجارت، مقامات مقدسہ کو عیسائی زائروں کی آمد و رفت، صلیبی محاربات، اسلامی ممالک میں عیسائی تبلیغ کے مشن۔

(۲) صقلیہ پر نارمن حملہ اور فتح اور بعد ازاں عیسائی دربار صقلیہ کی جانب سے اسلامی تمدن کی سرپرستی۔

(۳) اسپینی تعلقات (ذمی، غلام، یہودی اور دیگر ذرائع اتصال)

(۴) عیسائی حکومت میں اسلامی رعایا۔ اسلامی علوم و فنون کے تراجم اور عیسائی مدرسوں میں مسلمان اساتذہ۔

(۵) اسلامی عہد کے مدرسوں میں عیسائی طلبا کا تعلیم پانا۔

(۶) حاصل کلام (دانتے کے مضمون کا حل ابن عربی رح کی تحریرات اور عالم آخرت کے متعلق اسلامی عقائد و ادبیات میں ملتا ہے)۔

---

(۱) عرب کے آس پاس کے ممالک کو فتح کرنے کے بعد اسلام تیزی کے ساتھ شمالی آفریقہ، اسپین، جنوبی فرانس اور جنوبی اطالیہ میں پھیل گیا۔ اور اس کا اثر جزائر بالیاریک اور صقلیہ (سسلی) پر محیط ہو گیا۔ جنگ کے زمانہ میں متحاربین کا ایک دوسرے کے متعلق گہری واقفیت حاصل کرنا سب جانتے ہیں، لیکن زمانہ صلح میں بھی اسلام اور عیسائی تمدنوں میں مشرقی و مغربی سرحدوں پر

آٹھویں سے گیارھویں صدی تک مشرق کے اسلامی ممالک اور روس وغیرہ شمالی یورپ کے ممالک میں مستقل طور سے تجارتی تعلقات قائم رہے۔ بحیرۂ کیا سپین سے تجارتی جماعتیں مسلسل طور سے روانہ ہوتی تھیں اور براہ والگا خلیج فین لینڈ اور بحیر بالٹک سے ہوتی ہوئی ڈنمارک، برطانیہ بلکہ آئس لینڈ تک پہنچتی رہیں۔ مختلف مقامات میں اس وسیع تجارتی کاروبار کے باعث کثیر مقدار میں عربی سکوں کا دستیاب ہونا اپنی اہمیت کا آپ شاہد ہے[1]

گیارھویں صدی میں تجارت دریا کے آسان ذرائع سے بحر متوسط (میڈیٹرینین) میں ہوتی تھی۔ یہ خاص کر جینوا اور وینس والوں اور مسلمانوں کے جہازوں سے ہوتی تھی۔ بحر متوسط کی تمام اسلامی بندرگاہوں میں اطالوی تاجروں کی بڑی بڑی نوآبادیاں بس گئیں۔ جانباز سیاح اور نئی چیزوں کے متلاشی ہر وقت اس کے راستے سے سفر کرتے تھے۔ طلیطلہ (Toledo) کے بنیامین نے بارھویں صدی کے اپنے سفر کے متعلق ایک معتبر شہادت چھوڑی ہے جس سے اس وقت کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے گہرے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

تجارتی ترغیب کے علاوہ مغربی تخیل کی تشویق قابل ذکر ہے۔ ممالک مقدسہ (بیت المقدس وغیرہ) کو اسلام نے بہت ہی ابتدا میں فتح کرلیا تھا۔ عیسائی زائرین کا وہاں جانا جو بند ہوگیا تھا وہ از سر نو شروع ہوگیا، چنانچہ مشرق میں جتنے عیسائی گرجے تھے ان پر شارلمان کے زمانے میں فرانسیسی حمایت تسلیم کرلی گئی اور معاہدات کی رو سے انھیں اطمینان دلایا گیا اور اسلامی ممالک میں قیام گاہوں اور راہب خانوں کی تعمیر سے انھیں مدد دی گئی نویں، دسویں اور گیارھویں صدیوں میں زائرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ بعض بعض اوقات ان کی تعداد بارہ بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ حروب صلیبیہ کی بنیاد تھی[2]

---

[1] Cf. Babelon, Du Commerce des Arabes dans le nord de l'Europe avant les croisades pp. 33-47, and Passim.
یعنی کتاب "شمالی یورپ میں صلیبی جنگوں کے پہلے عربی تجارت" صفحات ۳۳-۴۷، از مصنف بابلون۔

[2] Brehier, L'Eglise et l'Orient au moyen age pp. ...

حروب صلیبیہ کا جو اثر اسلام اور عیسائی یورپ کو ایک دوسرے سے متصل کرنے میں پڑا اس کا تذکرہ غیر ضروری ہے کیونکہ اس سے سب واقف نہیں۔ پہلی جنگ صلیب کے بعد جو عیسائی مملکتیں قائم ہوئیں وہ اسلامی ممالک کے وسط میں دریائے فرات اور مصر کے مابین عیسائی نوآبادیوں سے مشابہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ ان مملکتوں کا انتظام اور فوج کی تنظیم بالکل اسلامی اصول پر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ فرانسیسی امراء، عادات، غذا اور لباس میں بالکل مشرقی ہو گئے تھے۔ یہ لوگ شام میں حروب صلیبیہ کے دوران میں یورپ کے تمام ممالک سے یہاں تک کہ اسکنڈنیویا سے آتے تھے[1]

اسلام کو تلوار کے ذریعے تباہ کرنے کی کوشش جب ناکام ہوئی تو یہ خیال پیدا ہوا کہ روحوں کو مصالحانہ ذرائع سے فتح کیا جائے، چنانچہ تیرھویں صدی میں اسلامی ممالک میں تبلیغی جماعتیں بھیجی گئیں۔ فرانسسکن اور ڈومی نی کن فرقوں کے پادری جو اس نئے روحانی اتصال کا باعث ہوئے، اسلام کے مذہبی ادبیات زبان کو مکمل طور سے سیکھنے پر مجبور تھے، نیز برسوں تک مسلمانوں میں قیام ناگزیر تھا[2]

(۲) اس سے زیادہ اہم اور دلچسپ اتصالی ذریعہ یہ تھا کہ دونوں تمدن صقلیہ اور اسپین میں بالکل ہمسایہ ہو گئے۔ نویں صدی میں نارمنڈی کے باشندوں نے بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) اور بحر متوسط کے سواحل پر جو چھوٹے چھوٹے حملے کرنے شروع کئے اس کے باعث رفتہ رفتہ انھوں نے اسلامی شہروں میں (مثلاً لسبن، اشبیلیہ، اوری ہیلا، باراباسترو) اور سقلیہ میں نوآبادیاں بسا لیں[3]

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کتاب "گرجا اور مشرق قرون متوسط میں" ص ۲۰۰–۲۰۵ مصنفہ بریئے۔

[1] Brehier کی کتاب مذکورۂ صدر۔ صفحات ۸۹ — ۱۰۰ نیز ۳۵۴۔

[2] ایضاً ایضاً صفحہ ۲۱۱۔

[3] Dozy, Recherches, II, 271. cf. Amari, Storia dei Musulmani di Sicilia, III, Part 2, 385, 445 et seq.

جزیرۂ صقلیہ پر اسلامی اثرات حد سے زیادہ محیط ہوگئے تھے ۔ اس کو گیارھویں صدی میں نارمنڈی کے بادشاہوں کا ایک خاندان فتح کر کے تیرھویں صدی تک حکومت کرتا رہا ۔ اس پورے عرصے میں صقلوی آبادی میں ہر قوم، ہر مذہب اور متعدد زبانیں بولنے والے موجود تھے ۔ نارمنڈی کے بادشاہ روجر دوم کے دربار یں شہر پالرمو میں مسلمان اور عیسائی دونوں مذہب کے امراء موجود تھے اور یہ سب کے سب عربی ادبیات اور یونانی علوم کے ماہر تھے ۔ نارمنڈوی امراء اور سپاہی، اطالوی اور فرانسیسی معززین اور پادری، اسپین، افریقہ اور دیگر ممالک مشرق کے مسلمان علما سب مل جل کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور یہ سب ایک مستقل اور خودمختار تنظیم میں منتظم تھے جو کہ ہر امر میں اسلامی درباروں کی ایک ہو بہو نقل تھی ۔ خود بادشاہ عربی لکھ پڑھ سکتا تھا ۔ اس نے اسلامی اصول پر ایک حرم سرا قائم کی تھی اور بالکل مشرقی طرز کا لباس پہنتا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ خود پالرمو کی عورتوں نے اپنی اسلامی بہنوں کے لباس، نقاب اور زبان کو اختیار کر لیا ۔

جس زمانہ میں پالرمو اسلامی درباروں کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا وہ تیرھویں صدی کا نصف اول ہے جبکہ فریڈرک شاہ صقلیہ و شہنشاہ جرمنی حکمران تھا ۔ یہ بادشاہ فلسفی المزاج، آزاد خیال اور تعدد ازدواج پر عامل تھا ۔ اس کے پیشرو جس طرح رزم و بزم میں مسلمانوں میں گھرے رہے اس نے بھی ایسا کیا مسلمان اس کے استاد، ہم سبق، درباری اور عہدہ دار اور وزیر تھے ۔ وہ انہیں ممالک مقدسہ کے سفروں میں ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا ۔ اس نے صقلیہ میں ایک اور اٹلی میں ایک حرم سرا بنوائی تھی جس میں خواجہ سرا متعین کیے گئے تھے حتیٰ کہ اس کے زرہ بکتر پر جو اس کو پہنا کر دفن کیا گیا ایک عربی کتبہ تھا ۔ پوپوں اور عیسائی بادشاہوں نے بادشاہ کو اس حرکت پر علی الاعلان سخت لعنت و ملامت اور فضیحت کی کیونکہ یہ بادشاہ قرون متوسط میں گو حد سے زیادہ با اقتدار تھا لیکن محض برائے نام عیسائی تھا ۔

ادبیات اور علم کے اس مربی نے عربی مخطوطات کا ایک بے نظیر کتب خانہ جامعۂ نیپلز میں (جو ۱۲۲۴ء میں قائم ہوئی) قائم کیا ۔ اس نے ارسطو اور ابن رشد کے تصنیفات کا ترجمہ کرایا اور

اہل نجوم، اور ریاضی داں جمع کئے بلکہ اس نے اپنے ہمعصر تمام ممالک کے اسلامی علماء سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم کیا۔

فریڈرک ہی کے دربار میں صقلوی شاعری کا مکتب شروع ہوا اس سوقی زبان کی سرپرستی نے موجودہ اطالوی ادبیات کی بنا ڈالی، مسلمان مغنی (Troubadours.) جو اس کے دربار میں تھے عیسائیوں پر ہر طرح فوقیت رکھتے تھے۔ اس مثال سے اچھی طرح واضح ہوگا کہ اسلامی اور عیسائی ادبیات کا اتصال یہاں بھی تھا۔[۱]

(۴) اگرچہ صقلیہ اسلامی تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا لیکن اس بارے میں قرون متوسط کے اسپین کے مقابلے میں اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسپین میں بھی وہی نظارے نظر آتے ہیں جو صقلیہ میں ہیں لیکن اس سے بڑے پیمانے پر اور صدیوں کی تاریخ کے ساتھ، کیونکہ عیسائی یورپ کا سب سے پہلا خطہ جس نے اسلام سے گہرا اتصال پیدا کیا وہ اسپین ہی ہے۔ یہاں پانسو برس تک (آٹھویں سے تیرھویں صدی تک) مسلمان اور عیسائی آبادیاں جنگ اور امن میں بالکل ملی جلی رہیں۔ (دانتے تیرھویں صدی میں پیدا ہوا)۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتصال پیدا کرنے میں سب سے پہلے ان عیسائیوں کا تذکرہ کرنا چاہیئے جو اسلامی حکومت میں رہتے تھے اور ساتھ ہی عیسائی مذہب پر بھی باقی تھے۔ نویں صدی ہی میں قرطبہ کے عیسائیوں نے رہنے سہنے میں اسلامی طرز اختیار کر لیا بلکہ بعضوں نے حرم سرائیں قائم کیں اور ختنہ کو رواج دیدیا۔ ان لوگوں کو عربی شاعری اور قصوں سے جو دلچسپی تھی اور اسلامی فلسفیانہ اور دینی مسائل و عقائد کے سیکھنے کا جو شوق تھا اس کے متعلق قرطبہ کے مشہور عیسائی مصنف الباروا نے اپنی کتاب (Indiculus Luminosus.) میں پرجوش طور سے اپنے حزن و ملال کا اظہار کیا ہے۔

اسلامی فتوحات کا ابتدائی صدیوں میں اس طرح جو اتصال قائم ہوگیا وہ رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔ باہمی جنگ و جدال میں جو وقفے ہوتے تھے ان میں آبادی کے ان دونوں عنصر کا

اختلاط برابر جاری رہا، چنانچہ ہم طلیطلہ کے (جو ایک قدیم مشہور پایہ تخت ہے) کے عیسائی باشندوں کو عام طور سے اپنے کاروباری دستاویزوں میں عربی زبان اور اعداد کو استعمال کرتے پاتے ہیں اور یہ طرز عمل بارھویں صدی تک باقی رہا۔ اس کے بعد اس شہر کو عیسائیوں نے فتح کرلیا۔ یہ امر کہ ان نیم عرب شدہ عیسائیوں نے شمالی اسپین اور دیگر یورپی ممالک کے عیسائی بھائیوں کو اسلامی تہذیب کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی بالکل قرین قیاس ہے۔ اس نظریہ کی تقویت و تائید میں یہ امر یاد رہے کہ اندلس سے (جہاں اسلامی حکومت قائم تھی) عیسائی ہمیشہ شمالی حصوں کی جانب ترک وطن کرتے رہتے تھے۔[1]

اسلامی مملکت میں رہنے والے عیسائی باشندوں کے اثر پر ایک عامل قوت کا اضافہ کرنا چاہئے جس کے ذریعے سے اسلامی تہذیب کے پھیلنے میں مدد ملی —— یعنی مسیحی الاصل غلام شمالی اسپین اور دیگر تمام اقطاع یورپ سے جس میں روس کا سا دور و دراز ملک شامل ہے کثیر تعداد میں غلام لائے جاتے تھے اور قرطبہ کے بادشاہوں کی فوج اور دربار میں خدمات پاتے تھے۔ بے شبہ بہت سے اسی ملک میں رہ جاتے تھے جہاں انھیں عزت اور دوستی میسر تھی لیکن یہ ناقابل یقین نہیں کہ بہت سے اپنی آخری عمر کے حصہ میں اپنے اصلی وطن کو لوٹتے تھے۔[2]

مسلمانوں اور عیسائی یورپ میں تعلقات کے جو ذریعے تھے ان کو گنانے کے قبل ہمیں اپنے تخیل میں اس زمانے کے مسلمانان اسپین کے معاشرے یعنی سماج اور سوسائٹی کا عجیب و غریب نقشہ کھینچنا چاہیے۔ یورپ کے مرکز تمدن کی حیثیت سے اسلامی اسپین یورپ کے وحشی باشندوں کے لئے

---

[1] سائمانٹ اپنی کتاب (صفحات ۲۱۶ —— ۲۱۹، ۲۵۲، ۲۷۳، ۲۹۲، ۳۴۶، ۳۶۸، ۳۸۴، ۶۹۰) میں لکھتا ہے کہ دسویں صدی میں شروع سے آخر تک عرب ہوئے راہب اور سپاہی لیون میں بہ تعداد کثیر آتے رہے کیونکہ یہ بہت مہذب ہوتے تھے اس لئے شاہی دربار میں مذہبی خدمات میں اور ملکی انتظام میں انھیں بڑے بڑے عہدے ملتے رہے ہیں۔ اس کی تائید کے لئے دیکھو (Gomez Moreno) کی کتاب (Iglesias Mozarabes) مطبوعہ میڈرڈ ۱۹۱۶ء شائع کردہ (Centro de Estudios Historicos, pp ۵، ۱۰، ۱۵)

[2] (Ribera, Discurso Acad. Hist. pp. 40 – 45)

اروکسے (Aldea hermosa) دلکشی رکھتا تھا۔ یورپ کے ہر حصے سے مسافر وہاں آتے تھے۔ ان کا مقصد تعلیم اور تجارت ہوتا تھا۔ نیز مشرق کے اس جدید مگر بہترین تمدن کے عجائبات کا مطالعہ کرنا ان کی ایک بڑی خواہش رہتی تھی۔

اس تصویر کے مکمل کرنے کے لئے یہودی تاجروں کو بھی شامل کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ بھی ایک ذریعۂ اتصال تھے کیونکہ ان کی بین الاقوامی تجارت سرسبز تھی اور انھیں علوم والسنہ کی تحصیل کا خاص چسکا تھا اس لئے ان کے ذریعے اسلامی اسپین اور عیسائی یورپ کے بڑے شہروں کے درمیان مادی اور روحانی سلسلۂ اتصال قائم ہوگیا۔ ہمیں جنگی قیدیوں کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ یہ کئی کئی برس کے بعد اپنے وطن کو لوٹتے تھے۔ اور نہ ہمیں اس اثر کو بھولنا چاہیئے جو عیسائی سفیروں کے بار بار اسلامی ممالک کو جانے سے پڑ رہا تھا[1]

(۴) جوں جوں عیسائی بادشاہوں کی افواج نے اسپین کو دوبارہ فتح کرلیا تو ان کی تابع اسلامی رعایا وہی کام کرنے لگی جو پہلے اسلامی دور میں عیسائی رعایا کرتی تھی۔ اس تہذیب کو جو ناقابل انکار فوقیت حاصل تھی اس کے باعث عیسائی اس کی عزت کرتے تھے اور بادشاہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ماتحت اسلامی رعایا کو اپنی جانب رغبت دلائیں تاکہ بہ آسانی و بسرعت اسلامی تمدن سے امتزاج کرلیں۔ علاوہ براں شادی کے ذریعے سے قسطیلہ یا "اراگون" کے شاہی خاندان اور حکمران اسلامی خاندانوں میں سیاسی اتحاد بکثرت ہوتا تھا، چنانچہ الفانسو ششم فاتح طلیطلہ نے اشبیلیہ کے عرب بادشاہ کی لڑکی زبیدہ سے شادی کی تھی۔ اس کا پایہ تخت ہو بہو ایک اسلامی دربار کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ یہ طریقہ بہت جلد عوام الناس میں بھی پھیل گیا۔ عیسائی عربی لباس پہننے لگے اور قسطیلہ کی ابھرتی ہوئی زبان میں کثیر عربی الفاظ کی دولت شامل ہونے لگی۔ تجارت، فنون لطیفہ، کاروبار، بلدی تنظیم اور نیز زرعی کاروبار میں ماتحت اسلامی رعایا کا اثر غالب تھا۔ اسی طرح اس عام ادبی حملے کا

---

[1] (Ribera, Disc., 46, Note I.)

راستہ تیار ہوا جو الفانسو دہم کے دربار میں اپنی حد کو پہنچ گیا[۱]

بارھویں صدی میں شروع سے آخر تک شہر طلیطلہ اسلامی علوم اور انشا کو عیسائی یورپ میں پھیلانے کا ایک اہم مرکز بنا رہا۔ اس صدی کے حصۂ اول میں مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن جانے کے بعد آرک بشپ ریمان نے چند اہم عربی کتب کا ترجمہ شروع کیا۔ اس طرح ارسطو کی پوری انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) کا عربی سے ترجمہ کرلیا گیا جس کے ساتھ ہی ساتھ کندی فارابی ابن سینا غزالی اور ابن رشد کی شرحوں کا بھی ترجمہ کرلیا گیا۔ نیز اقلیدس، بطلیموس، جالینوس اور بقراط کے شہ کاروں کا ترجمہ کیا گیا جس کے ساتھ مسلمان علما مثلاً الباطنی (؟) (Albatenius) ابن سینا، ابن رشد، رازی اور (؟) (Alpetrogius) کی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ ماتحت مسلمان رعایا اور یہودیوں کی مدد سے قسطیلہ کی زبان میں کتابوں کے ترجمے ہوئے جن کا بعد میں عیسائی ممالک کے ڈاکٹروں یعنی عالموں نے لاطینی میں ترجمہ کرلیا[۲]

(۵) الفانسو ششم نے عربی تہذیب کے اسی ماحول میں تعلیم پائی۔ تخت نشین ہونے پر اس نے بشخصی طور سے تراجم کا انتظام کیا اور اس کے دربار میں تینوں مذاہب (اسلام، عیسائیت، یہودیت) کے علما جمع ہو کر امداد باہمی کرنے لگے۔ طبیعات اور علم ہئیت پر جدید تصانیف کے علاوہ اس نے خاصی توجہ ان علوم کی طرف مبذول کی جو عوام الناس کو پسند آتے۔ اس کے باپ فرڈی نان نے (Libros de los doce sabios) نامی کتاب اور (Flores de Filosofia) نامی کتاب کی تالیف کی ہمت افزائی کی۔ ان کا مشرقی اثرات سے متاثر ہونا پہلی نظر میں ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ الفانسو نے اسی قسم کی

---

[۱] (Ribera, Origenes Justicia, 19-84; Fernandez y Gonzalez, (Mudejares, 224, et Passim.)

[۲] (Jourdain, Recherches sur les anciennes Traductions latines d'Aristote, pp. 96-140) یعنی ارسطو کے قدیم لاطینی تراجم کے تحقیق صفحہ ۹۶ تا ۱۴۰

دوسری کتابوں مثلاً کلیلہ و دمنہ (Bocados de oro)، اور (Poridad de Poridades)
کا ترجمہ کرایا اور مشرقی دل بہلائی کے متعلق کتابیں تالیف کرائیں ۔ عربی ماخذوں کی مدد سے اس نے
اپنی بڑی اور عام تاریخ (Grande general Estoria.) لکھی نیز اس نے
طلمودی (Talmudic.) اور قبلائی (Cabbalistic.) تصانیف کا اور سب سے
زیادہ قابل ذکر یہ کہ قران شریف کا ترجمہ کرایا۔ ۱؎

اسپین کی دوبارہ فتح نے کارگزاریوں کے لئے ایک نیا میدان مہیا کر دیا اور مرسیہ اور اشبیلیہ
(کے شہر) فلسفے اور ادبیات کے مرکز بن کر شہر طلیطلہ کی ہمسری کرنے لگے ۔ الفانسو اپنے باپ کے
دور حکومت میں مرسیہ کا گورنر تھا ۔ اس نے وہاں ایک مدرسہ خاص اس غرض سے بنایا کہ مشہور مسلمان
عالم محمد الرقوتی مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک ساتھ تعلیم دیں ۔ ۲؎

۱۲۵۰ء کے قبل ایک اور مسلمان عبداللہ بن صہلوح مسلمان اور عیسائیوں کو شہر بیضاء
(Baeza.) میں ریاضی اور فلسفے کی تعلیم دیتے تھے ۔ ان کے مدرسے میں مذہبی امور پر
عیسائی پادریوں سے مباحثے ہوا کرتے تھے ۳؎

ان نظائر سے ہمت پاکر شاہ نے سرکاری طور سے اس بات کی منظوری کا اعلان کرنے کا
فیصلہ کر لیا کہ اسلام اور عیسائیت دونوں تمدنوں کا اختلاط عمل میں آئے شہر اشبیلیہ میں ایک عام عربی اور
لاطینی کلیہ قائم ہوا جہاں طب اور سائنس کی تعلیم عیسائی پروفیسروں کے دوش بدوش مسلمان بھی دیتے تھے۔ ۴؎
یہاں تک تو اس بات کا تذکرہ ہوا کہ یورپ نے اسلام سے بہت کچھ سیکھا ۔ اب خصوصیت سے

۱؎ (Jourdain, P.P. 149-151. Fernendez y gonzalez. 154-159. Amador de los Rios. (Hist. crit de la liter) esp III ch 9-12)
۲؎ (Al-MakKari, (Analectes) II 510 cf. Ghata II fol 153 r°
۳؎ (Ghata III. fol. 85.)
۴؎ (Amador de los Rios III 496 Ballesteros, (Sevilla en el siglo XIII) docs nos. 67 & 109 La

دانتے کے متعلق غور کرنا ہے۔

دانتے کی تحریرات میں اس کے اسلامی تہذیب کی جانب میلان رکھنے کے جو متعدد علامات پائے جاتے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نمونوں سے متاثر ہونے سے نفور نہ تھا بلکہ ان سے اخذ کرنیکی جانب رجحان رکھتا تھا۔ ایک گزشتہ باب میں بتایا جاچکا ہے کہ ان نمونوں کا اسپینی مسلمان کے ذریعے سے اٹلی اور اس کے شاعر (دانتے) تک پہنچنا کتنا قرین قیاس ہے۔ پہلے دو باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ایک بجانہ ورسخت امتحان پر ڈوائن کامیڈی میں اسلامی خصوصیات کسی قدر کثیر تعداد میں موجود نظر آتے ہیں۔ تیسرے باب میں یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ دانتے کے قبل کے عیسائی قصوں کا بڑا حصہ بھی اسلامی ادبیات ہی سے ماخوذ ہے۔ بظاہر اب استدلال مکمل ہوچکا اور کوئی بڑا اعتراض اس دعوے کے خلاف نہیں اٹھ سکتا کہ نقل بالضرور پائی جاتی ہے کیونکہ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ ڈوائن کامیڈی اور اسلامی روایات میں اصل اور نقل کی مشابہت پائی جاتی ہے اور اسلامی ادبیات کو تقدم حاصل ہے اور ان دونوں میں تعلق ثابت ہے۔

اب اس سے انکار ناممکن ہے کہ اسلامی ادبیات کو دانتے کی نظم کے پیشرووں میں ایک شاہانہ تقدم حاصل ہونے کی عزت حاصل ہے کیونکہ اسلامی ادبیات ہی میں ہمیں دانتے کی نظم کی پیدائش کے متعلق اتنا کچھ حل ملتا ہے کہ پیشرو عیسائی قصوں کے پورے مجموعے سے بھی یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن ڈوائن کامیڈی کے نمونوں کی اسلامی اصلیت دریافت کرنے کے طویل سفر میں ہر ہر قدم پر ہمیں ایک بڑے مصنف کی شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے اور جن کے تصانیف میں ہی ہمیں اس چیز کی کلید حاصل ہوسکتی ہے جو دانتے کی نظم میں مقفل معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا اشارہ حضرت ابن عربیؒ اندلسی صوفی شاعر کی جانب ہے۔ آپ کے تصانیف بالعموم اور فتوحات مکیہ بالخصوص اطالوی شاعر کا ماخذ اور اس کی نظم کے عام خاکے کا نمونہ ہوسکتے ہیں۔ انھیں کی تصنیفوں میں دانتے کو جنت اور دوزخ کے تعمیری خاکے کے متعلق نمونے ملے ہونگے، نیز اس عظیم الشان ڈرامے کے ماحول کی عام خصوصیتیں، خدا کے برگزیدہ بندوں کی دلفریب زندگی، نور ربانی کی مقدس تجلی اور دیدار باری تعالیٰ پر محویت کا طاری ہونا۔

جن کی شاعرانہ اور مذہبی طبیعت ویسی ہی یکساں ہو جیسی دانتے اور ابن عربیؒ کی۔ کیونکہ ان کی مشابہت نہ صرف فلسفیانہ افکار کے متعلق ہے (جو ابن مسرہ کے اشراقی مذہب سے ماخوذ ہے) بلکہ ان تصاویر میں جن میں وہ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں اور ان ادبی طریقوں میں جن کے ذریعے سے وہ ان کا اظہار کرتے ہیں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دانتے کے (Conzits) اور (Treasures) سے بڑھ کر یہ مشابہت کہیں اور نہ ملیگی۔ دانتے کے یہ دونوں تصانیف انہیں اصول پر ترتیب پائے ہیں اور ان کے مقاصد بھی ویسے ہی تخصی ہیں۔ دونوں مصنف اپنے عاشقانہ اشعار میں تمثیلی تعبیر کرنے میں ایک ہی طریقہ برتتے ہیں۔ دانتے الاغیارئیے (Dante Alighieri) نے اپنے مساعی ادبیہ سے جو لافانی شہرت حاصل کی ہے اس میں حضرت ابن عربیؒ کا (جو ایک اسپینی گو کہ مسلمان تھے) حصہ کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اطالوی شاعر کی معزز شخصیت کو اس جدید تحقیقات سے اپنے شیدائیوں اور تمام اہل دنیا کی نظروں میں ذرا بھی اپنی وقعت کھونا نہیں پڑیگا۔ کسی کی ذہانت کی اندھی تعریف کرنی کبھی صحیح تعریف کرنی نہیں سمجھی جا سکتی۔ اور نہ وطن پرستی کے جذبے کے تحت جو عزت کی جاتی ہے اس کو خود وہ شخص کبھی پسند کریگا جس نے اپنے وطن اور اپنی قوم پر انسانیت اور مذہب کے اعلیٰ تخیلات کو ہمیشہ ترجیح دی۔ جس نے "باشندۂ عالم" ہونے کا پرفخر دعوی کیا اور جس نے اپنی بلند پایہ نظم میں اخلاق اور تصوف کی ابدی اور عالمگیر روح پھونکی جو عیسائی[1] خیالات کی عمیق ترین حقیقتوں کا فطری اظہار ہے .... (ختم)

(پہلی قسط گزشتہ نمبر میں شایع ہوئی ہے)

---

[1] اس فقرے سے کتاب کے آخر تک جو چند سطروں پر مشتمل ہے مصنف اسلام پر عیسائیت کی ترجیح کے غیر متعلقہ مبحث کو بلا دلیل

نذر

(از)

مولانا احمد حسین امجد حیدرآبادی

کر لے میری جان کا ہدیہ قبول
توڑ لے اس جسم کی ڈالی سے پھول

ٹوٹ کر، پھر گر نہ جائے خاک میں
داغ لگ جائے نہ روحِ پاک میں

گر نہیں بالفرض تجھ کو اس کی چاہ
ہاتھ رکھ دے، نذر پر اے بادشاہ!

مانتا ہوں میں ترے لائق نہیں
جانتا ہوں میں ترے لائق نہیں

تیرگی، اور نور کے دربار میں ؟
آہ، یہ پھول اور تیرے ہار میں

جس میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
رنگ و بو کا شائبہ، کچھ بھی نہیں

گرچہ امجد سخت نافرجام ہے
کام لینا اس سے تیرا کام ہے

میں تجھے پانے سے پہلے کھو نہ جاؤں
جاگنے سے پیشتر ہی سو نہ جاؤں

زندگی میں جب نہ پائی زندگی
بعد مُردن کیوں نہ ہو شرمندگی

تجھ کو جاں دینے سے پہلے مر نہ جاؤں
دم تو نکلے، اور قدم تیرے نہ پاؤں

کر دے روشن دیدۂ اعمیٰ مرے
ہے ابھی کچھ وقت اے آقا مرے

کیا کہوں میں، کیا ہوں، اور کیسا ہوں میں
سب تجھے معلوم ہے جیسا ہوں میں

میرے مالک تجھ سے شرمندہ ہوں میں
لے لے میری جان، ابھی زندہ ہوں میں

دفن سے پہلے اٹھا لے تو مجھے
موت سے پہلے جلا لے تو مجھے

بندۂ تو دور تر از بندگی ست

آسمانی امتحان

(از نکولو میکاویلی)

میکاویلی کی شہرت زیادہ تر اس کی دو کتابوں پر ہے۔ ایک "پرنس" دوسری "تاریخ فلارنس" لیکن اپنے اکثر معاصرین کی طرح وہ بھی ہمہ گیر حیثیت رکھتا تھا۔ مدبر وہ تھا، سیاس اور ڈرامانگار، وہ تھا اور قصہ نگاری بھی کرتا تھا۔ "آسمانی امتحان" مصنف کے انتقال کے بعد شائع ہوا جس کا موضوع نیا نہیں۔ لیکن میکاویلی نے اس میں جان پیدا کر دی ہے۔ اس قصہ کا اردو ترجمہ راسکو کے انگریزی ترجمہ سے مرزا ناصر علی بیگ صاحب نے کیا۔

(مدیر)

ایک مرتبہ وہ اپنی عبادت میں محو تھا اس وقت اس نے ایسے اشخاص کی جو اپنے کرتوت کی سزا بھگت کر گناہ کی حالت میں فوت ہوئے تھے خبیث روحوں کو غیر محدود تعداد میں دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ان میں کی اکثر روحوں نے اپنی شادی کی بیہودگی پر جس قدر افسوس کیا اتنا افسوس کسی چیز پر نہیں۔ ان روحوں نے اپنے تمام مصائب کا باعث اپنی بیویوں کو قرار دیا۔ اس سے سخت متعجب ہو کر منیاس، رھاڈامان ھتس اور باقی دوزخی ججوں نے صنف نازک پر جو اتہام لگایا گیا تھا اس سے ناراض ہو کر اس معاملہ کو پلوٹو کے روبرو پیش کرنے کا تصفیہ کیا۔ یہ طے پایا کہ دوزخی شہزادوں کی ایک خفیہ کمیٹی بغرض تحقیقات قایم کیجائے اور عدالت اپنے حسب صوابدید افواہی بدنامیوں اور تہمتوں کی اصلیت یا غیر اصلیت دریافت کرنے کیلئے ممکنہ تدابیر اختیار کرے۔ تمام لوگوں کے جلسہ میں جمع ہو جانے کے بعد پلوٹو نے جلسہ میں حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "عزیز دیوؤ! اگرچہ آسمانی تقسیم اور غیر متبدل و ناقابل تنسیخ تقدیر سے یہ سلطنت میرے حصہ میں آئی ہے اور مجھے ہر قسم کی ذمہ داری کا پابند رہنا چاہیئے لیکن چونکہ قوانین سے مشورہ کرنا اور دوسروں کی رائے لینا زیادہ مناسب ہے میں نے تمہاری رائے لینے کا ارادہ کیا ہے اور خصوصاً ایک ایسے معاملہ میں جس سے ہماری حکومت پر الزام عاید ہونے کا احتمال ہو کیونکہ ہماری سلطنت میں جتنے آدمی روزانہ آرہے ہیں ان کی روحیں اپنی دنیاوی مصیبتوں کے سبب اپنی بیویوں کو ٹھہراتی ہیں اور چونکہ یہ بات ہمیں ناقابل اعتماد نظر آتی ہے ہمیں احتیاط سے اس معاملہ کا تصفیہ کرنا چاہیئے ورنہ ہمارے اوپر سخت رکیک الزام لگایا جائیگا۔ نیز ہم نے تصفیہ کرنا ہے پڑیگا نہیں تو ہم پر ناانصافی اور لاپروائی کا

الزام عاید کیا جائیگا ۔ ناانصافی یا سختی کے الزام سے بچنے کی غرض سے تمہاری امداد کے طالب ہوتے ہیں تاکہ تم اس معاملہ پر غور کرکے کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ ہم نے جس طرح اب تک بلا کسی تہمت و الزام کے حکومت کی ہے آئندہ بھی اسی طرح حکومت کرتے رہیں ۔

شہزادوں نے دیکھا کہ معاملہ بیحد اہم اور ضروری ہے اگرچہ اس معاملہ کی انجام دہی کے بہترین تدابیر کے متعلق ان میں اختلاف آرا تھا لیکن انھوں نے طے کیا کہ سب سے پہلے واقعہ کی اہمیت دریافت کیجائے بعضوں نے رائے دی کہ ان میں سے ایک یا زیادہ اشخاص منتخب کئے جاکر دنیا کے سفر پر روانہ کئے جائیں تاکہ وہ انسانی بھیس میں اس افسانہ یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ واقعہ کس حد تک درست ہے ۔ بہت سوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس قدر مصیبت اٹھانے کے بغیر صرف چند خبیث روحوں کو سچائی کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ لیکن غلبۂ آرا سفر دنیا کی طرف تھی سے انھوں نے اول الذکر تدبیر پر رضامندی ظاہر کی ۔ کوئی شخص اس کام کو اپنے ذمہ لینے کے لئے رضامند نہ تھا اس لئے قرعہ ڈالا گیا اتفاق سے قرعہ بلفاگر نامی دیو کے نام آیا ۔ اگرچہ بلفاگر اپنے اس کام کو رضامندی سے قبول نہ کرتا تھا لیکن پلوٹو کے شاہی حکم کی وجہ سے مجبور ہوگیا اور کونسل میں جو کچھ تصفیہ ہوا اس کے مطابق عمل کرنے پر تیار ہوگیا اس کے ساتھ ساتھ اس نے مجریہ ہدایات پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی قسم کھائی شاہی ہدایات یہ تھے :- (۱) بلفاگر کو ایک لاکھ بدیسی سکے دئے جائیں ۔ (۲) دنیا میں جانے کے لئے عجلت ممکنہ سے کام لیا جائے ۔ (۳) انسانی بھیس اختیار کرنے کے بعد بلفاگر شادی کرے ۔ (۴) اپنی بیوی کے ساتھ دس سال زندگی بسر کرے ۔ اس مدت کے اختتام پر وہ فرضی طور پر مردہ ہوجائے اور اس طرح وطن واپس ہو تاکہ وہ بھیجنے والوں کو اپنے تجربہ نیز اس بات سے کہ ازدواجی تعلقات سے زندگی میں درحقیقت انسان کو کیا کیا آرام اور تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں آگاہ کرسکے ۔ مقررہ شرایط میں یہ بھی لکھا تھا کہ دس سال کے عرصہ میں بلفاگر کو انسانوں کی طرح تمام قسم کے مصائب اور رنج والم برداشت کرنا ہوگا ۔ مثلاً مفلسی قید اور امراض جس میں انسان اکثر مبتلا ہوجایا کرتے ہیں اگر بلفاگر اپنی چالاکی اور حسن تدبیر سے ان سے محفوظ رہے تو مضائقہ نہیں ۔ بیچارہ بلفاگر نے ان شرایط پر دستخط کرکے روپے حاصل کئے اور دنیا میں وارد ہوا ۔ اپنے ساز و سامان اور کئی خدمتگاروں کو لئے ہوئے بڑے ترک و احتشام کے ساتھ شہر فلورنس میں داخل ہوا اس نے دوسرے شہروں پر اس شہر کو اس وجہ سے ترجیح دی کہ اس کو یہاں اس کی رقم کا کثیر سود دستیاب ہوسکتا تھا ۔ اس نے روڈریگو نام اختیار کرکے موائی آگنی سانٹی میں ایک مکان سکونت کے لئے اختیار کیا چونکہ وہ جس مقصد سے دنیا میں آیا تھا اس کا اظہار نہیں

حلب میں کچھ روپیہ پیدا کرنے میں کامیاب رہا اور آخر میں شادی کر کے وہیں سکونت پذیر ہونے کی غرض سے ملک اٹلی میں آیا کیونکہ وہ ایطالیہ کو ایک مہذب اور دلفریب ملک سمجھتا تھا۔

روڈریگو حقیقت میں ایک حسین آدمی تھا اور بظاہر (۳۰) سالہ جوان معلوم ہوتا تھا۔ اور اس قسم کی زندگی بسر کرتا تھا جس سے لوگ سمجھتے تھے کہ اگر اس کے پاس وافر دولت نہیں تو کم از کم وہ خوشحال تو ضرور ہے خوش خلق اور آزاد طبع ہونیکی وجہ سے ایطالیہ کے بہت سے شریف الخاندان باشندوں کو اس نے اپنی طرف مائل کر لیا۔ ان باشندوں کے زیر سرپرستی کئی لڑکیوں کے خاندان تھے لیکن ان کی آمدنی قلیل تھی۔ لڑکیاں روڈریگو کے سامنے پیش کی گئیں جن میں سے اس نے آنستا نامی ایک نہایت حسین لڑکی کو منتخب کیا یہ لڑکی امیریگو ڈوناٹا کی بیٹی تھی ڈوناٹا کو تین جوان بیٹے اور تین شادی کے لائق لڑکیاں تھیں۔

اگرچہ ڈوناٹا کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا۔ اور شہر فلورنس میں خاصی شہرت بھی حاصل تھی لیکن وہ بالکل مفلس تھا۔ اور معمولی کاروبار کیا کرتا تھا۔ روڈری گو نے شادی جیسی تقریب کے لئے ہر قسم کی تیاری میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اِس خیال کے تحت وہ دنیاوی شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔ اور لوگوں میں شہرت و عزت حاصل کرنیکی غرض سے بہت سا روپیہ صرف کیا۔ اس کے علاوہ اُس کو اپنی ہونے والی بیوی سے شادی سے پیشتر کئی مرتبہ ملنے جُلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آنستا کو ذرا بھی تکلیف پہنچے اپنی اعلی نسبی اور حُسن کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ عورت اپنے ساتھ وہ فخر و امتیاز بھی لائی کہ لُوسیفر بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ تاہم جب اُس نے اپنی روڈریگو کے ساتھ شادی کے حالات معلوم کئے تو اُس کو شوہر پر غالب آنے اور اُس پر جابرانہ حکومت کرنیکا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے اسی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ہر قسم کی گستاخیوں اور شرارتوں سے اُس کو ناقابل برداشت و ناقابل بیان تکلیف و رنج پہنچایا کرتی تھی۔ روڈری گو اس کے باپ، بھائیوں، دوست احباب، رشتہ داروں، اس کی محبت اور ازدواجی تعلقات کے خیال سے کچھ عرصہ ساری مصیبت صبر سے برداشت کرتا رہا۔ بیوی کے لئے لباس طعام اور جدید سے جدید وضع کی اشیاء مہیا کرنے میں اُس نے جو اسراف برتا اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ تاہم بیوی کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے کی خاطر اُس کو اس سے بھی زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑے۔ اُس کو اپنے خُسر کو اُس کی دوسری لڑکیوں کی شادی میں امداد دینی پڑی۔ اس کی بیوی نے

[illegible]

مغرب کی طرف روانہ کرے ۔ اور تیسرے بھائی کو شہر فلورنس میں ایک سُنار کی دوکان لگوادے ۔ روڈریگو کی دولت کا بڑا حصہ ان اغراض کے نظر ہو گیا ۔ آخر کار کارنیول کا زمانہ قریب آیا ۔ اور سینٹ جان کی یادگار منائی جانیوالی تھی جس کی وجہ سارے شہر میں حسب معمول آمد قدیم خاصی چہل پہل تھی ۔ کئی شریف خاندان اس موقع پر انتظامات کے لحاظ سے ایک دوسرے پر سبقت لیجانیکی کوشش کر رہے تھے ۔ اور لیڈی آنسٹا نے اپنے ہم حیثیتوں میں نظر نیچی نہو نیکے خیال سے روڈری گو کو مجبور کیا کہ وہ سب سے بڑھکر انتظامات کرے ۔ روڈریگو کو اس بات پر رضامند ہونا پڑا ۔ وہ مختلف طریقہ سے اِن انتظامات کے مصارف سے بچنے کی سعی کرتا رہا ۔ لیکن بیوی کی ضد کی وجہہ اُس کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے ۔ اُس گھر کے لوگ بچے بڑے عورت مرد میاں بیوی کے ناقابل برداشت طریق زندگی سے تنگ آکر گھر کو خیرباد کہہ چکے تھے ۔ تنہائی کی وجہہ روڈری گو کو جو مصائب برداشت کرنے پڑے وہ ناقابل بیان ہیں حتیٰ کہ خود اُس کے ہمراہی عفریت بھی اُس سے کنارہ کش ہو گئے ۔ انھیں اُس کی بیوی کے مظالم برداشت کرنیکے مقابلہ میں وطن جانا پسند تھا ۔ اب روڈری گو تنہا رہ گیا ۔ اُس کے ساتھ صرف اُس کی گستاخ اور ضدیلی بیوی تھی ۔ ساری دولت برباد ہونے سے اب اس کو مشرق و مغرب کی سیاحتوں سے جو روپیہ ہاتھ آیا تھا ۔ اُس پر زندگی بسر کرنی پڑی اسی زمانہ میں مشرق و مغرب سے یہہ خبر آئی کہ اُس کی بیوی کے ایک بھائی نے تجارت کی ساری پونجی کھیل تماشوں میں ضایع کردی ۔ دوسرا بھائی بہت سا قیمتی اسباب لیکر وطن واپس ہو رہا تھا کہ ناگہاں جہاز طوفان میں گھر گیا اور وہ بھی غرق ہو گیا ۔ جوں ہی یہ خبر شہر میں پھیلی روڈری گو کے قرض خواہ ایک جگہ جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ روڈریگو پر نگرانی رکھی جائے تاکہ وہ فرار نہو سکے ۔ روڈری گو نے یہ دیکھکر کہ اب کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی کسی طرح بھاگ جانیکا ارادہ کیا ۔ چنانچہ ایک روز صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو گیا ۔ اُس کے غائب ہونیکی خبر فوراً شہر میں پھیل گئی ۔ قرض خواہوں نے ہنگامہ مچایا اور عدالت میں دعویٰ دائر کیا جس کی بنا پر چند عہدہ دار تھوڑی سی آبادی کو گئے ہوئے روڈری گو کے تعاقب میں روانہ ہوئے ۔ روڈری گو نے ابھی ایک میل کا فاصلہ بھی طے نہ کیا تھا کہ اُس کو تعاقب کرنے والوں کی چیخ پکار سُنائی دینے لگی ۔ خود کو اُن کی نظر سے بچانیکی غرض سے اُس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ عام راستہ چھوڑ کر کھلے میدانوں کی راہ لی لیکن کھیت کی منڈیروں اور خندقوں پر سے گذرنا سخت دشوار تھا ۔ اس لئے گھوڑے کو چھوڑ کر پیدل چلنے لگا ۔ انگور اور بید کے کھیتوں سے گزر کر وہ پر ٹی ٹولہ پہنچا ۔ جہاں وہ میاٹیوڈل بریکا نامی ایک مزدور کے مکان میں داخل ہوا ۔ بریکا اپنے مویشیوں کو چارہ ڈالنے میں مصروف تھا ۔ [illegible]

اس وقت پناہ دے تو اس کو بڑا دولت مند بنادیگا۔ ورنہ بریکا کو اختیار دیدیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کو دشمنوں کے حوالے کردے۔

بریکا اگرچہ ایک دہقان تھا۔ مگر ہمت والا آدمی تھا۔ اور یہہ سمجھ کر کہ اس سنہری موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے روڈریگو کو پناہ دینے پر رضامند ہوگیا۔ چنانچہ اُس نے روڈریگو کو کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر میں چھپادیا۔ جب اُس کے دشمن یہاں پہنچے تو وہ بالکل مایوس ہوگئے۔ کیونکہ بریکا نے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔ اب دشمنوں کو آگے تعاقب کئے جانیکے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ دو دن تک تعاقب کئے چلے گئے۔ لیکن آخر میں تھک کر بحالت مایوسی فلورنس واپس آئے۔ اِس اثناء میں بریکا نے روڈریگو کو کوڑے کے ڈھیر سے نکالکر وعدہ کے ایفا کی استدعا کی۔ روڈریگو نے کہا "بھائی مجھے اعتراف ہے کہ میں آپکا بڑا احسان مند ہوں۔ اور اس کا معاوضہ ضرور ادا کرونگا۔ میں اب معلوم کراؤنگا کہ میں کون ہوں"۔ یہہ کہکر اُس نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ یعنے یہہ کہ وہ کس طرح دنیا میں آیا شادی کی اور کیوں فرار ہوا۔ اس کے بعد اُس نے بریکا کو دولت مند بننے کا طریقہ بتایا۔ اور وہ یہہ تھا۔ جوں ہی بریکا کو یہہ خبر ملے کہ قرب و جوار میں کسی عورت کو آسیب ہوگیا ہے تو وہ سمجھ لے کہ یہہ روڈریگو کا سایہ ہے۔ نیز یہ کہ روڈریگو اُس عورت سے اُس وقت تک جدا ہوگا جبتک کہ بریکا خود اس کی تدبیر نکریگا۔ ہر طریقہ سے بریکا اُس عورت کے دوستوں سے اُس کے آسیب کو دور کرنیکے حیلے سے حسب دلخواہ دولت حاصل کرسکتا ہے۔ یہہ وعدہ کرکے روڈریگو غائب ہوگیا۔

اس واقعہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ شہر فلورنس میں یہہ خبر پھیلی کہ امبروگیو امیڈی کی بیٹی کو جس کی شادی ٹی بالڈوسی سے ہوئی تھی۔ آسیب ہوگیا ہے۔ رشتہ داروں نے ایسے موقعوں پر جو تدابیر اختیار کیے جانے چاہئیں اس میں کوئی کسر باقی نہ رکھی مثلاً اس کے سر پر سینٹ زنوبی کی کلاہ پہنائی اور سینٹ جان آف گالرٹو کا کوٹ پہنایا۔ لیکن ان تدابیر پر روڈریگو ہنستا تھا۔ ماں باپ کو یہہ یقین دلانے کے لئے کہ حقیقت میں ایک روح اس پر وارد ہے اُس نے عورت سے لاطینی زبان میں گفتگو کروائی۔ بعض اوقات عورت فلسفیانہ مسائل پر غور کرنیکے لئے جلسے کرتی اور اپنے ساتھیوں کی غلطیوں کو ظاہر کرتی۔ غرض اسی قسم کی دیوانہ وار حرکتیں کیا کرتی۔ امبروگیو نے دیکھا کہ اس کو کسی طرح خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اس کو علاج سے مایوسی ہوگئی۔ لیکن یہ خبر بریکا کو ملتے ہی وہ فوراً امبروگیو کے پاس گیا۔ اور یہ یقین دلایا کہ اگر وہ پانسو فلورن دینے رضامند ہے تو اس کی بیٹی کو درست کرنیکی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ امبروگیو اس بات پر رضامند ہوگیا۔ اور بریکا نے ایک جلسہ منعقد کرواکے بہت سارے غیر ضروری رسوم

چلے جاؤ"۔ روڈری گو نے جواب دیا "یہ درست ہے۔ لیکن تم نے لڑکی کے والدین سے معقول رقم حاصل نہیں کی ہے۔ اِس وقت اِس لڑکی سے جدا ہوتا ہوں لیکن چارلس شاہ نیپلز کی بیٹی پر وارد ہو جاؤنگا۔ اور جبتک تم وہاں نہ آؤ میں لڑکی سے جدا نہ ہونگا۔ اس مرتبہ تم حسبِ دلخواہ مطالبہ کرسکتے ہو۔ اور یاد رہے کہ اس کے بعد پھر آپ مجھے تکلیف نہ دیں۔ یہ کہہ کر وہ لڑکی سے جدا ہوگیا۔ لڑکی تندرست ہوگئی جس سے سارے شہر فلورنس میں خوشی منائی گئی۔

اِس واقعہ کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ شاہ نیپلز کی بیٹی پر آسیب ہوگیا۔ تمام تدابیر غیر مفید ثابت ہونے سے بادشاہ نے شہر فلورنس سے بریکا کو طلب کیا۔ نیپلز پہنچکر بریکا نے لڑکی کا علاج کیا۔ شہزادی سے جدا ہوتے وقت روڈری گو نے کہا "دیکھو بریکا میں نے وعدہ پورا کیا اور تمہیں دولتمند بنا دیا۔ اب مجھ پر تمہارا احسان ہے۔ آیندہ تم کو میرا نام نہ لینا چاہئے۔ ورنہ جس طرح میں ابتک تمہارے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتا رہا اُسی طرح تمہارے لئے آیندہ وبال جان بن جاؤنگا"۔ یہہ سنکر بریکا بادشاہ کے جانب سے پچاس ہزار سکہ حاصل کرکے عیش و آرام سے بسر کرنیکی غرض سے فلورنس واپس ہوا۔ چند روز کے بعد سنا گیا کہ شاہ فرانس لوئی کی ایک بیٹی پر کوئی خبیث روح وارد ہے لیکن بادشاہ کی عظمت اور روڈریگو کی نصیحت کے خیال سے بریکا نے اس جانب مطلق توجہ نہ کی۔

شاہ فرانس کو بریکا کا حال معلوم ہوا اور کوئی اور چارہ باقی نہ رہنے سے اُس نے بریکا کے پاس ایک قاصد روانہ کیا۔ بریکا نے مختلف عذرات کرکے قاصد کو واپس کردیا لیکن شاہ فرانس نے بریکا کی روانگی کے لئے فلورنس کی کونسل سے درخواست کی جس کی وجہہ بریکا کو مجبوراً فرانس جانا پڑا۔ بادل ناخواستہ پیرس پہنچکر وہ بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس نے آسیب کے علاج میں کسی قدر شہرت حاصل کی ہے لیکن وہ یہ فخریہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر وقت کامیاب ہوگا نیز یہ کہ بعض بھوت اور شیطان ایسے شریر ہوتے ہیں کہ ان پر دھمکیوں، سحر حتیٰ کہ مذہبی منتر وغیرہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے عمل تو کریگا لیکن اس کے ساتھ یہ استدعا کرتا ہے کہ اگر بھوت ضدی ہو اور میری کوشش ناکام ہوجائے تو ایسی صورت میں مجھے معاف کیا جائے اس پر بادشاہ نے جواب دیا کہ کسی طرح بھی اگر وہ آسیب کے دور کرنے میں کامیاب نہ ہو تو اُسے سولی دیجائیگی یہ الفاظ سنکر بریکا کو جس قدر دہشت اور پریشانی ہوئی وہ ناقابل بیان ہے لیکن کسی قدر ہمت کرکے اس نے شہزادی کو اپنے روبرو طلب کیا۔ اور حسب عادت اس کے قریب جاکر روڈریگو سے عجز و انکسار کے ساتھ التماس کیا کہ وہ اس کو عذاب میں نہ پھنسائے بلکہ اس کے گذشتہ خدمات کے معاوضہ میں شہزادی سے جدا ہوجائے یہ سنکر روڈری گو نے کہا "اے دغاباز بدمعاش۔ کیا تو نے اس معاملہ میں خفت کی ہے؟ کیا تو مرے؟ [illegible] دولت دولتمند ہو کے ناز کرتا ہے؟ اب [illegible] دنیا کو اور تجھ کو [illegible]

مجھے کس قدر قوت حاصل ہے میں تجھے یہاں سے جانے سے قبل سولی پر دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ بچارے بریکانے جب دیکھا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔ زیادہ کچھ نہ کہا بلکہ ایک عقلمند کی طرح آسیب کو دور کرنے کے لئے دیگر ذرائع اور تدابیر دریافت کرنیکی نسبت غور کرنے لگا اس مقصد کے تحت اُس نے بادشاہ سے کہا "خداوند نعمت مجھے جس بات کا خوف تھا اُسی سے دوچار ہونا پڑا بعض بھوت اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان پر کسی طرح قابو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بھوت بھی اسی قسم کا ہے بہرحال میں ایک آخری کوشش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس میں ہماری خواہش کے مطابق کامیابی ہوگی بصورت ناکامی میں آپکے ہاتھ میں ہوں اور مجھے توقع ہے کہ آپ میری بے گناہی پر رحم کھائینگے۔ اب یہ استدعا ہے کہ آپ ایک بڑے اسٹیج کی تیاری کا حکم جاری فرمائیں اور وہ اس قدر وسیع ہو کہ شہر کے تمام شرفا اور پادری وغیرہ اس پر بیٹھ سکیں۔ اسٹیج ہر قسم کے ریشمی اور سنہری پارچہ جات سے سنوارا جائے اور درمیان میں ایک چبوترہ بھی بنایا جائے کل آپ اس مقام پر دربار منعقد کریں جس میں آپ کے ملک کے جملہ روسا امراء اور مذہبی علما زرق برق لباسوں میں حاضر رہیں پھر نماز کی ادائی کے بعد شہزادی اس مقام پر لائی جائے لیکن میں خاص طور پر استدعا کرتا ہوں کہ اس موقع پر سارے باجے بجوائے جائیں۔ اس کے بعد جس وقت میں اپنی ٹوپی اُتاروں تو تمام باجے بجتے رہیں اور مہیب صدائیں کرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھیں یہ اور چند دیگر تدابیر ہے جنہیں میں اس وقت اختیار کرونگا بھوت مجبوراً دفع ہوجائیگا۔

شاہی حکم کے بموجب یہ تمام انتظامات مکمل ہوگئے اور یوم اتوار کا مقررہ دن آپہنچا اسٹیج امراء و شرفا سے اور اور دربار ساری مخلوق سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نماز ادا ہونے کے بعد آسیب زدہ شہزادی کو اسٹیج پر لایا گیا جب روڈریگو نے اتنے بڑے مجمع اور زبردست انتظامات کو دیکھا وہ حیرت و استعجاب سے بھوت سا ہوگیا اور اپنے دل میں کہا "مجھے تعجب ہے معلوم نہیں کہ وہ بزدل بدمعاش اب کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسی چیزیں میں نے کبھی نہیں دیکھیں؟ کسی حال میں اس کو کردار کو پہنچاؤنگا۔ بریکانے روڈریگو کے قریب آکر لڑکی سے علٰحدہ ہونے کی استدعا کی لیکن روڈریگو نے جواب دیا" تمہارا خیال ہے کہ تم نے اب ایک اچھا کام کیا ہے۔ یہ تمام باجے بجوانے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طریقے سے میری طاقت یا بادشاہ کے انتظام سے بچ سکتے ہو؟ اے کمینہ بدمعاش میں تجھے اس کے معاوضہ میں سولی نصیب کراؤنگا اور بریکا جوں جوں استدعا کرتا گیا روڈریگو اسی طرح اس کو لعنت ملامت کرتا گیا۔ اب بریکانے موقع کو غنیمت جانکر اپنی ٹوپی اُتاری اس اشارہ پر تمام مطرب جو اس وقت حاضر تھے صدائیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ آوازیں سنکر روڈریگو نے

[illegible]

بریکا نے جواب دیا "افسوس روڈریگو یہ عورت تمہاری بیوی ہے وہ تم سے ملنے آرہی ہے۔" "بیوی" کا لفظ سن کر روڈریگو کو جو دماغی صدمہ ہوا اور اس کے جذبات میں جو عجیب و غریب تغیر واقع ہوا اس کے اظہار سے الفاظ قاصر ہیں۔ جوں ہی بریکا نے بیوی کا لفظ زبان سے کہا روڈریگو نے اس پر غور کئے بغیر کہ آیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں اور ایک لفظ بھی زبان سے کہے بغیر مارے خوف کے لڑکی سے علحدہ ہوگیا اور ازدواجی زندگی میں یہیں کو مزید تکالیف اور رنج والم میں مبتلا ہونے کے مقابلہ میں اپنے وطن واپس ہوکر اپنی سرگزشت ہم وطنوں کو سنانے کو ترجیح دی اس طرح بلفاگر کو ایک عورت کی وجہ سے خاندان میں جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا کافی ثبوت اور مواد لیکر عفریتوں کی سلطنت کو واپس گیا اور بریکا محصلہ کامیابی ہر فخر و مباہات کرتا ہوا بڑی شان سے وطن واپس ہوا۔

طلباء کے لئے نہایت مفید کتاب

نصاب تعلیم ملک سرکار عالی میں عرصے سے مضمون نویسی کا مضمون داخل ہے۔ لیکن اس کے متعلق کوئی کتاب تیار نہ ہونے کی وجہ سے اس مضمون کی مدارس میں خاطر خواہ تعلیم نہیں ہوتی تھی۔ مولوی مظفرالدین صاحب نے اس تعلیمی ضرورت کو محسوس کرکے اپنے دیرینہ تعلیمی تجربہ کی بنا پر تیسری اور چوتھی جماعتوں کے نصاب کے موافق مضمون نویسی کی کتابیں لکھی ہیں جو مذکورۂ بالا جماعتوں کے فن مضمون نگاری کے نصاب کو بخوبی پورا کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل جدید طریقہ تعلیم پر تیار کی گئی ہیں یہ کتابیں نہ صرف بچوں ہی کے لئے مفید ہو سکتی ہیں بلکہ اہلکاروں اور ان پیرو کار و اہل معاملہ حضرات کے لئے جو کاغذات نویسی کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ کامل رہنمائی کر سکتی ہے اس کتاب کے دو حصے ہیں حصہ اول کی قیمت ۵ حصہ دوم کی قیمت ۶

مکتبہ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

حجاز کا ایک فرضی انگریز سیاح[1]

محمد امین

(عرف)

مسٹر کین

از جناب حاجی سید علی شبیر صاحب صدر منتظم ہائیکورٹ

جان فرایر کین ۱۸۵۴ء میں بمقام ولی واقع آئرلینڈ پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ریورنڈ ولیم کین کچھ دنوں کلکتہ کا بڑا پادری بھی رہا تھا۔ کین کی عمر بارہ سال تھی کہ یہہ گھر سے بھاگ کر جہاز پر نوکر ہوگیا اور سات سال مسلمانوں میں گزار کر بقول اُس کے اپنے تئیں اُس نے سفر حجاز کے قابل بنالیا۔ یہہ خشکی اور بحری راستوں سے مختلف ملکوں کا سفر کرتا ہوا جدے پہنچا اور مسلمانوں کے طرز معاشرت وروزہ نماز سے واقف ہونے کے لیئے وہاں اس نے قہوہ کی دوکان کرلی۔ پھر ہندوستان کے کسی سوداگر کے پاس جو حج کو جارہا تھا ملازم ہوکر اُس کے نوکروں کے ساتھ کبھی پیدل اور کبھی اونٹ پر چلتا ہوا ۱۸۷۷ء میں مکے پہنچا۔ کوئی پانچ مہینے یہاں قیام کرکے مدینے گیا وہاں دس روز ٹھر کر پھر مکے واپس آیا۔ اور جدے سے انگلستان چلا گیا۔ حجاز میں اس کا کل قیام چھ مہینے رہا۔ انگلستان واپس جانے کے بعد اِس نے اپنا سفرنامہ "سِکس منتھز اِن حجاز" (حجاز میں چھ مہینے) کے نام سے شایع کیا جسے ہنسلی براورز نے ۱۸۸۷ء میں لندن میں طبع کیا ہے۔ اگرچہ عام طور پر اہل یورپ اس کو سیاح حجاز تصور کرتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہہ فی الحقیقت مکہ ومدینہ نہیں گیا۔ گھر بیٹھے یا زیادہ سے زیادہ جدے میں بیٹھ کر دوسرے سفرناموں کی مدد سے اِس نے ایک سفرنامہ مرتب کردیا ہے۔ انشاء اللہ اِس شبہ کو آئندہ ثابت کیا جائیگا۔ کین کا سفرنامہ ناواقف لوگوں کو شاید دلچسپ معلوم ہو لیکن جنہوں نے دوسرے

---

[1] [illegible]

سفرنامے دیکھے ہیں اُن کو اس میں کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔ بعض واقعات اس نے تعصب سے تحریر کئے ہیں جن کے پڑھنے سے کبھی ہنسی اور کبھی افسوس آتا ہے۔ اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ وہ حصہ ہے جہاں اس نے مسماۃ زہرہ بیگم کے حالات لکھے ہیں۔ یہ عورت بقول کین ایک انگریز خاتون تھی اور کسی مسلمان خاندان کے ساتھ بیس برس سے نجد میں رہتی تھی اور ۱۸۷۹ء میں اُنھیں لوگوں کے ساتھ ہندوستان لوٹ گئی تھی۔ اس کے تفصیلی حالات آگے بیان کئے جائینگے۔ ایک نئی بات کین کے سفرنامے میں یہ ہے کہ اس سال مکہ معظمہ میں طغیانی آئی تھی[1] نیز اس سال ہیضہ، بخار و چیچک کی وبا مکے میں اس قدر پھیلی تھی کہ ایک ایک دن میں ساٹھ ساٹھ آدمی مرے تھے۔ کین نے اپنے سفرنامے میں جا بجا دینِ اسلام کے متعلق اپنے وسیع معلومات کا ذکر بڑی آب و تاب سے کیا ہے مگر شروع بسم اللہ ہی غلط ہے۔ اس نے ابتداء میں اپنا نام "عبد الرحمٰد" رکھا تھا جس کی غلط ترکیب سے ظاہر ہے کہ کبھی کوئی دھوکا باز ایسا نام رکھنا پسند نہ کریگا جس سے خواہ مخواہ مسلمانوں میں انگشت نما ہو۔ بقول اُس کے مکہ معظمہ میں اس نام پر اعتراض ہونے لگا تو اس نے اپنا نام محمد امین رکھ لیا۔ اپنی مذہبی معلومات اور پابندی فرائض کے بارے میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:-

"اگرچہ میری تمام عمر ایسے لوگوں میں گزری تھی جو برائے نام مسلمان تھے اور میں کچھ لکھا پڑھا بھی نہ تھا مگر میری مذہبی پابندی و ادائی فرائض کے باعث میرے سب ساتھی میری بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور کئی مرتبہ میں نے ایک جید اندھے مولوی کو اپنی مذہبی معلومات سے متحیر کر دیا تھا۔"

---

[1] مکہ معظمہ میں اکثر اوقات گرمی کے دنوں میں یکایک آندھی آکر زور کا مینہ برس جاتا ہے۔ چونکہ مکہ معظمہ اور خصوصاً بیت اللہ نشیب میں واقع ہے اس وجہ سے جب کبھی آس پاس کے پہاڑوں میں زوردار بارش ہو جاتی ہے تو اس سے بیت اللہ میں سیلاب آجاتا ہے۔ مکے کے مورخوں نے کئی بڑی بڑی طغیانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ طغیانی ہے جو اسلام سے کئی صدی قبل آئی تھی اور جس سے کعبہ منہدم ہو گیا تھا اور قبیلۂ جرہم نے اسے تعمیر کیا تھا۔ زمانہ اسلام میں جو طغیانیاں آئیں ان میں سب سے زیادہ خوفناک سنہ ۸۰ھ و سنہ ۱۸۴ھ و سنہ ۲۰۲ھ و سنہ ۲۰۸ھ و سنہ ۲۹۷ھ و سنہ ۵۴۹ھ و سنہ ۶۲۰ھ و سنہ ۸۲۹ھ میں آئی تھیں۔ ان میں سے بعض میں کل مکے اور بیت اللہ کو بہت نقصان پہنچا تھا حجر اسود تک پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ اور بہت سے مکان اور جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ عصامی مورخ نے سنہ ۱۰۳۹ہجری کی طغیانی کا ذکر کیا ہے جس میں پانسو آدمی مرے تھے۔ تاریخ الخلفا مولفہ سیوطی میں عبداللہ ابن زبیر کے ذکر میں تحریر ہے کہ ایک مرتبہ کعبہ میں پانی بھر آیا مگر وہ طواف سے نہ رکے اور تیر تیر کر طواف کرتے رہے۔ عبداللہ ابن زبیر کی وفات سنہ ۷۳ہجری میں ہوئی تھی۔

کین نے اُس سوداگر کا نام بھی اپنے سفرنامے میں ظاہر نہیں کیا جس کے پاس ملازم ہو کر وہ حج کو گیا تھا یہاں تک کہ اپنے کسی ہمراہی کا نام بھی نہ لکھا اور کسی کے وطن و سکونت کا بھی کچھ ذکر نہ کیا ورنہ اس کے جھوٹ سچ کا بہ آسانی پتہ چل جاتا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا نام پہلا سپاہی۔ دوسرا سپاہی اور تیسرا سپاہی تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "میں نے اُن کے ناموں کا ترجمہ کر دیا ہے"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کن ناموں کے ترجمے ہیں لن لوگوں کے ناموں کے چھپانے کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اگر وہ ظاہر کئے جاتے تو بہ آسانی پتہ لگ جاتا کہ کین صاحب حجاز نہیں گئے۔ کین جس کا نوکر تھا اس کا ذکر سفرنامے میں کہیں کہیں آگیا ہے۔ مکے میں اس نے اپنا چلنا پھرنا ایسی آزادی کے ساتھ دکھایا ہے گویا وہ کسی کا نوکر ہی نہ تھا۔ کین کا بیان ہے کہ دوران سفر میں اس پر کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ وہ کوئی انگریز ہے اور صدق دل سے مسلمان نہیں ہے مگر بچ گیا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"مکے میں ایک دن میں ایک مدرسہ کے پاس سے جا رہا تھا جہاں کوئی سو ڈیڑھ سو لڑکے کھیل رہے تھے میں ان کا کھیل دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ایک ہندوستانی لڑکے نے کہا دیکھو وہ عیسائی ہے۔ یہ سنکر اور بھی لڑکے میری طرف متوجہ ہو گئے اور ان میں سے ایک لڑکا آگے بڑھ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ او عیسائی کتے اگر تو مسلمان ہے تو کلمہ پڑھ۔ میں نے اس کو ایک لات ماری اور ہاتھ پکڑ کر اوسے جھٹکے دے کر چھوڑ دیا۔ اس پر چاروں طرف سے لڑکوں نے مجھ پر پتھر برسانے شروع کئے۔ میرے ہاتھ پاؤں اور گھٹنے پتھروں سے زخمی ہو گئے اور موت کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ آخر ایک چھوٹے سے لڑکے کو جس کا نام ابراہیم تھا میں نے لپک کر پکڑ لیا اور ڈھال کی طرح اس کو اپنے سامنے کر لیا۔ اس ترکیب سے جان بچا کر میں بھاگا اور ایک ترکی تھانہ میں پناہ لی۔ اتنے میں ایک غول حبشیوں اور عربوں کا عیسائی۔ عیسائی کا غل مچاتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ ترکی سپاہیوں نے مجھے کالی کالی آنکھوں سے گھورا اور سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے وہ اپنے لفٹینٹ کو بلا کر لائے۔ اس نے مجھ سے فرانسیسی میں گفتگو شروع کی۔ میں نے اس سے کہا مجھے ترکی نہیں آتی اور میں نے کلمہ پڑھنا شروع کیا۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ بار بار کہتا جاتا تھا۔ آخر سپاہیوں نے چھوڑ دیا"۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جھگڑے نے بہت طول کھینچا تھا اور اس قدر فساد برپا ہونے کے بعد کین کا سپاہیوں کے ہاتھ سے بغیر کافی تحقیقات کے کے میں رہا ہو جانا حیرت کی بات ہے۔ جو شخص واقعی مسلمان نہ ہو۔ جس کے دل میں چور ہو۔ جس نے کہیں علانیہ اسلام نہ اختیار کیا ہو وہ مکۂ معظمہ میں ایسا دیدہ دلیر کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمان لڑکے اس سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہیں اور وہ لات سے جواب دے۔ اور پولیس والے اس سے بغیر دریافت کئے ہوئے کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے کس کے ساتھ ہے۔ کہاں ٹھہرا ہے۔ نو مسلم ہے یا پیدائشی مسلمان۔ محض کلمہ پڑھنے پر اور وہ بھی غلط پڑھنے پر اس کو چھوڑ دیں۔ خلاصہ یہ کہ اس واقعہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ مکے نہیں گیا۔ رفع شک کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

"مکہ اگرچہ متجسس تاکنے والوں اور خدائی فوجدار مخبروں سے بھرا ہوا تھا مگر میرے پاس ہزاروں چھوٹی چھوٹی علامتیں اور محاورات و فقرات مسلمانوں کے فریضہ کے متعلق موجود تھے۔ چنانچہ کئی موقعوں پر میں نے اپنے تئیں نو مسلم بتا دیا۔ مکے میں چھ ہفتے رہ کر میں اس مذہب کا ایسا ماہر ہو گیا تھا گویا پیدائشی مسلمان۔"

گرفتاری کے موقعہ پر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسلامی فریضہ کے متعلق اس کے ہزارہا محاورات و فقرات و علامات کا اندازہ ہو چکا ہے۔

کین کا بیان ہے کہ اس کا مالک اپنے چند ملازمین کے ساتھ اس کو مکے میں چھوڑ کر بیت المقدس چلا گیا تھا۔ اور اس کو وہ کافی روپیہ دے گیا تھا جس کی بدولت یہ مزے کرتا تھا اور اچھے اچھے کپڑے پہنے مکے میں اتراتا پھرتا تھا۔ یہ واقعہ بھی غور طلب ہے۔ کین نے اپنے سفرنامے میں ایسی کوئی تفصیل نہیں بیان کی جس سے اس کی صحت ہو سکے۔ نہ کہیں اس نے یہ بتایا ہے کہ اس نکمے کو ملازم رکھنے کی اس امیر آدمی کو غرض کیا تھی اور اس کے فرائض ملازمت کیا تھے۔ کون سا کام اس کے سپرد تھا اور اپنی عدم موجودگی میں بھی اس منصبدار کی تنخواہ برقرار رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کعبے کی پیمائش اس نے ایک گز بھر بانس کے ٹکڑے سے کی تھی جس کو وہ سونٹے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اپنے ہاتھوں پیمائش کی

"اس جوشیلے فقیر پر کسی نے شبہ نہ کیا جو رات کے وقت اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل طواف کیا اور اس طرح عبادت کے بہانے سے اس نے کعبے کی پیمائش کر لی۔"

کین ۱۵ دسمبر ۱۸۷۷ء کو جبل عرفات پر موجود تھا۔ یہاں کی عبادت اور حاجیوں کے جوش و خروش کے

"دو لاکھ پاگلوں میں صرف ایک میں ہی عقلمند معلوم ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے بھی بہترین حاجیوں کی حرکتوں کی نقل کی"

نویں ذیحجہ کو تمام کوہ عرفات پر اکٹھے ہوتے ہیں اور تین بجے سے مغرب تک وہاں خطبہ ہوتا رہتا ہے۔ اُس وقت مسلمانوں پر جو کیفیت و حالت طاری ہوتی ہے اور جس طرح یہاں مسلمان اپنے گناہوں پر تائب و پشیمان نظر آتے ہیں اس کا ذکر ہم تین چار عیسائی سیاحان حجاز کے سفرناموں سے نقل کرتے ہیں اس کے بعد ناظرین خود اندازہ کر لینگے کہ اپنے گناہوں پر پشیمان ہونے والے اور خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے قصوروں کا اعتراف کرنیوالے پاگل ہیں یا اُن کو پاگل سمجھنے والا شخص خبطی ہے۔ برٹما جو ۱۵۰۳ء میں مکہ معظمہ گیا تھا لکھتا ہے:-

"جس وقت خطیب بہ آواز بلند یہہ الفاظ کہتا ہے کہ یا حضرت ابراہیم خلیل اللہ و یا حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ اُمّت نبی کے حق میں خدا سے دعائے مغفرت کیجئے تو چاروں طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں"

پٹس جو ۱۶۹۳ء میں مکہ معظمہ گیا تھا جبل عرفات کے ذکر میں لکھتا ہے:-

"ہزارہا آدمیوں کا عاجزی و انکساری کا لباس پہنے۔ ننگے سر چار پانچ گھنٹے تک ٹھنڈی سانس بھر بھر کے آنسوؤں سے مُنہ دھونا۔ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے درگاہ خدا میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنا اور سچے دل سے توبہ و استغفار کرنا فی الحقیقت دل پر ایک گہرا اثر کرنیوالا منظر تھا"

بکھارٹ جس نے ۱۸۱۴ء میں سفر حجاز کیا اپنے سفرنامے میں خطبہ عرفات کے ضمن میں فرماتا ہے:-

"حاجیوں کے جم غفیر میرے چاروں طرف کھڑے احرام کے پلو سر پر ہلا رہے تھے اور ان کے لبیک اللہم لبیک کے نعروں سے زمین آسمان گونج رہے تھے۔ بعض حاجی چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ اپنے سینے کوٹ رہے تھے۔ آنسوؤں سے اپنے مُنہ دھو رہے تھے اور خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے۔ بعض آنکھوں میں آنسو بھرے عاقبت کی فکر میں خاموش کھڑے تھے"

برٹن جس نے ۱۸۵۳ء میں حجاز کا سفر کیا۔ تحریر کرتا ہے:-

"مختلف ملکوں کی مذہبی رسمیں میری نظر سے گذری ہیں لیکن کسی جگہ ایسی سنجیدہ اور ایسی موثر رسم میں نے کبھی نہیں دیکھی جیسی کہ یہہ تھی"

حج سے فارغ ہو کر کین اپنے مالک کے ساتھ درب سلطانی[1] کی راہ سے مدینے گیا۔ منزل رابغ[2] پر یہہ کھڑی

---

[1] مکہ معظمہ سے مدینے جانے کے واسطے چار رستے ہیں جن میں سب سے اچھا اور شاداب رستہ درب سلطانی (یعنی شاہی رستہ) کہلاتا ہے [illegible]

پکا کر کھانے کے لئے بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک عرب نے جو اونٹ کے زخم کو چیر پھاڑ کر آیا تھا۔ اور ابھی تک اس کے ہاتھ خون وغیرہ آلایش سے لیسے ہوئے تھے آکر بلا پوچھے گچھے اس کی رکابی میں اپنا پنجہ گھسیڑ دیا۔ کین سے برداشت نہو سکی اس نے رکابی اٹھا کر اس زور سے عرب کے مُنہ پر ماری کہ وہ گر پڑا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور یہہ اپنی رکابی اُٹھا کر صاف کرتا ہوا بیٹھا تھا کہ اس کو یکایک اپنی سیدھی ران میں سخت درد معلوم ہونے لگا۔ مڑکر دیکھا تو خبر ہوئی کہ وہی عرب اس کو نیزے سے زخمی کر کے چلتا بنا۔ اس کے ساتھی سب اکٹھے ہوگئے اور اس کے تمام کپڑے پھاڑ پھاڑ کر زخم پر باندھے مگر خون رکنا تھا نہ رکا۔ آخر لوگ مایوس ہو کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ یہہ سمجھا کہ مرنے کے لئے اب اس کو یہیں ریگستان میں چھوڑ دیا جائیگا۔ مایوسی کی حالت میں اس نے بڑی مشکل سے کاغذ پر پنسل سے یہہ لکھا کہ "حامل ہذا تفصیلی واقعہ بیان کریگا"۔ یہہ خط اس نے اپنے ایک ساتھی کو دیکر کہا کہ "جدے کے انگریزی کونسل کو پہنچا دینا"۔ کین نے یہہ خیال کیا تھا کہ قافلے والے دیر کے خیال سے اس کو گڑھے میں زندہ دفن کر کے چلے جائینگے۔ اس نے اپنے اوپر دو تین گدھ بھی منڈلاتے دیکھے تھے۔ مگر اس کے ساتھی ایسے بے رحم نہ تھے کہ اسے چیل کوؤں کی دعوت کے لئے جنگل میں پڑا چھوڑ جاتے۔ چودہ گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنے کو شغدف[1] میں پایا۔ اس کو غذا میں تربوز کھلاتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس راہ سے قافلہ کسی قدر دیر میں پہنچتا ہے مگر اس سڑک پر امن زیادہ ہے۔ وادی فاطمہ۔ عصفان۔ خلیص۔ رابغ۔ حمرا۔ حدیدہ۔ بیر عباس۔ بیر درویش اور بیر علی اس رستے کی خاص منزلیں ہیں جہاں سامان خورد و نوش مل جاتا ہے۔ اس زمانہ میں حکومت نجد کے انتظام سے کوئی رستہ بھی خطرناک نہیں رہا۔ سب جگہ امن ہی امن ہے۔ چاہے جس طرف سے چلے جاؤ۔ قافلے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تنہا ایک آدمی بھی سفر کر سکتا ہے۔

لہ رابغ جدے سے سو میل اور بحر احمر کے ساحل سے تین میل پر ایک بندرگاہ و قصبہ ہے کے سے مدینے جاتے ہوئے یہاں حاجی قیام کرتے ہیں اور ایک وسیع میدان میں ڈیرے ڈالتے ہیں۔ بہت سے لوگ چائے خانوں میں چارپائیوں پر سوتے ہیں۔ آج کل رابغ میں وہابیوں کی تھوڑی سی فوج رہتی ہے۔ یہاں ایک قلعہ۔ ڈاکخانہ اور مختصر بازار ہے۔ سامان خورد و نوش بکثرت ملتا ہے۔ مکانات رابغ کے نیم پختہ ہیں جھتیں مٹی کی ہیں۔

[1] شغدف ایک قسم کی چارپائی ہے جس کے اوپر خمیدہ لکڑیاں لگا کر ٹاٹ وغیرہ سے سایہ کر دیتے ہیں۔ ایک اونٹ پر دو شغدف

اس کا ایک ساتھی گاؤں سے کسی حکیم کو بلا لایا تھا جس نے کچھ دوا لگائی تھی۔ خون بند ہوگیا تھا اور چھ دن بعد یہہ اپنے پاؤں سے مدینے میں داخل ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔

کین مدینے منورہ کو دنیا کے خوشنما ترین شہروں میں شمار کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اس کی برف کے مثل سفید بلند دیواریں۔ اس کی میناروں کے سنہری کلس جن کی چمک صبح کے سورج کی کرنیں پڑ کر نگاہ کو خیرہ کرتی ہے۔ اس کے گرد اگرد لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کی سرسبز چوڑی پٹی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ موتیوں کے آس پاس زمرد جڑا ہوا ہے"۔

کین مدینے میں دس روز قیام کر کے اپنے مالک کے ساتھ جب دوبارہ مکے آیا تو یہاں کی آب وہوا اس کو بہت ہی بھلی معلوم ہوئی اور یہہ سمجھا گویا اپنے گھر پہنچ گیا۔ مکے میں چار دن قیام کر کے وہ جدے روانہ ہوگیا۔ یہاں یہ دل کھول کر فرنگیوں کی صحبت میں وقت گزارتا تھا۔ لفظ حاجی جس سے اس کے ساتھی اس کو مخاطب کرتے تھے اس کو زہر معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی پہنچ کر اس نے مسلمانوں کا لباس بھی اتار کر پھینکدیا۔ کین کہتا ہے کہ "چند روز بعد بمبئی میں اُس امیر نے جس کے پاس میں ملازم ہوا تھا ایک دن بازار میں مجھے دیکھا مگر وہ انجان بن کر چلا گیا۔ واللہ اعلم یا تو مجھے پہچانا نہیں یا عمداً مجھ سے بات کرنا اس نے پسند نہیں کی"۔

یہ بھی ایسے بھلے آدمی تھے کہ جس شخص کا نمک کھایا جس کی بدولت مکے میں مالدار بنے پھرے اس کے پاس جا کر ادب سے سلام تک نہ کیا۔

۱۹۱۱ء تک کین زندہ تھا اُس کا بیان تھا کہ:۔

"اس تجارتی و علمی زمانہ میں اگرچہ دنیا میں بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہوئے لوگ موجود ہیں مگر میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس شخص کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا جس نے مکے میں خوفناک لفظ "عیسائی" سنا ہو"۔

اب ہم وہ کہانی اور اس کی اصلیت بیان کرتے ہیں جو کین کے سفرنامے کی جان ہے اور جو غالباً حکومت انگریزی کو مسلمانوں کے جانب سے بددل کرنے کے لئے اور انگریزوں کو اشتعال دلانے کے لئے درج کتاب کی گئی ہے۔

کین کہتا ہے:۔

"میں مکے میں ایک حجام کی دکان پر جو تھوڑے فاصلے پر ہے روز میں جایا کرتا تھا۔ دوران گفتگو میں انگریزوں کا

کچھ ذکر آیا۔ اس پر اُس حجام نے کہا کہ یہاں مکے میں ایک انگریز عورت زہرہ بیگم نامی کوئی بیس سال سے رہتی ہے۔ واللہ اعلم وہ حجام مجھے آزمانا چاہتا تھا یا اس عورت کو مجھے دکھانا منظور تھا۔ بہرحال مذہب عیسوی کے متعلق میں اپنے معلومات چھپاتا نہ تھا بلکہ حقیقت سے زاید میں اپنے تئیں دین مسیحی کا عالم ظاہر کیا کرتا تھا[1]

خیر۔ پہلی مرتبہ حجام کے سالے کے مکان پر جو ایک مولوی تھا اس عورت سے میری ملاقات ہوئی آدہ گھنٹے کی گفتگو سے میرا پورا اطمینان ہوگیا کہ وہ دراصل تعلیم یافتہ انگریزی خاتون ہے۔ میں نہایت آزادی کے ساتھ اس سے انگریزی میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اس کے کہنے سے میں نے اردو میں گفتگو شروع کردی۔ چلتے وقت میں نے انگریزی میں اس سے ہاتھ ملانے کے لئے کہا مگر اس نے انکار کردیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ظہر کی نماز ہر روز حرم میں پڑھتی ہوں وہاں تم مجھ سے مل سکتے ہو۔ چنانچہ ایک دن حرم میں بھی اس سے میری ملاقات ہوئی۔ نماز کے بعد میں اور وہ دونوں حرم سے نکل کر ایک ہندوستانی کے مکان کو روانہ ہوئے۔ کوئی پاؤ کوس تک ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ جب کسی گلی کا موڑ آتا تو وہ بار بار مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی اور جب تک کہ میں اس کے قریب نہ پہنچ جاتا وہ ٹھہری رہتی۔ پھر اس نے انگریزی میں باتیں شروع کیں لیکن ایک ترکی سپاہی کو آتا دیکھ کر ہم جھٹ عربی میں باتیں کرنے لگے اس ہندوستانی کے مکان پر پہنچ گئے وہ ہم دونوں کو مکان میں تنہا چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اور ہم کوئی تین گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو اس نے برقع ہٹا کر اپنا چہرہ بھی مجھے دکھادیا۔ جو میرے مثل سرخ و سفید تھا۔ وہ مجھے بیٹا کہہ کر پکارتی تھی۔ میری باتیں سن سن کر وہ کہنے لگی "بیٹا میں پہچان نہیں سکتی کہ اصل میں تو کون ہے اور میں بھی نہ پہچان سکا کہ وہ دراصل کون تھی اس لئے دوسری ملاقات میں اس سے پوچھنے کے لئے بہت سے سوالوں کی ایک فہرست میں نے تیار کی۔"

پہلی ملاقات میں صرف دو گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد کین کا اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ انگریزی تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ آج تین گھنٹے باتیں کرنے کے بعد بھی شبہ ہی میں ہیں۔

زہرہ بیگم کے واقعات و حالات سن کر کین کے دل پر جو اثر ہوا اس کو ان الفاظ میں اس نے ظاہر کیا ہے: —

---

[1] یہ بیان شیخی پر مبنی ہے۔ اچھا خاصہ مسلمان بھی اگر مکہ معظمہ میں دین عیسوی کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کرے تو اس پر عیسائی ہونے کا شبہ ہوجائے مگر یہ صاحب بہادر بڑے نڈر ہیں۔

"ایک حاجی کعبے کے سامنے لیٹا ہوا انگلستان کے مشہور شاعر ہڈ کا یہ شعر گن گنا رہا تھا۔ خوبصورت نازک عورتوں کی قسمت میں بھی کیا کیا مصیبتیں لکھی ہوتی ہیں"

آگے چل کر کہیں کہتا ہے :۔

"اس امید میں کہ وہ عورت بھی اپنی کچھ کیفیت مجھ سے بیان کرے گی میں نے اپنا انگریزی نام و پتہ اس کو بتا دیا اور مکے آنے کی غرض بھی ظاہر کر دی۔ ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھ سے یہ کہا کہ میں نے ہندوستان میں اپنے کسی رشتہ دار کے پاس راس امید کے رہنے والوں کے ذریعہ سے جو ہندوستان جانے والے تھے خط بھی بھیجے ہیں"

کین کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ زہرہ بیگم کا کوئی انگریز رشتہ دار بھی ہندوستان میں موجود تھا۔
زہرہ بیگم کے انگریزی نام وسکونت وولدیت کے متعلق کین لکھتا ہے :۔

"جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اپنا نام میکن توش بتایا تھا اس کا باپ کوئی ڈاکٹر تھا۔ اور وہ بچپن میں بمقام ڈیون شائر[۲] رہ چکی تھی۔ غدر میں محاصرہ کے وقت وہ لکھنؤ میں تھی۔ وہاں سے اس کو کوئی مشہور باغی اڑا لے گیا تھا۔ چونکہ اس نے تفصیل بیان نہیں کی اس لئے میں یقین کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا کہ وہ خوشی سے مکے گئی تھی یا زبردستی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ایک برس تک اس باغی کے ساتھ ہندوستان میں بھی رہی تھی۔ انگریزوں نے اس باغی کے سر کا انعام مقرر کیا تھا اس لئے وہ بھاگ کر مکے چلا گیا تھا"

کین اس لیڈی سے اپنی آخری ملاقات کی کیفیت ان الفاظ میں لکھتا ہے :۔

"آخر مرتبہ وہ اور میں منیٰ[۳] کی سڑک پر دو میل تک ٹہلتے ٹہلتے چلے گئے۔ منیٰ پہنچ کر وہ ایک عرب کے مکان میں گئی لیکن مالک مکان کہیں گیا ہوا تھا اس وجہ سے اس کی عورتوں نے اندر آنے کی اس کو

---

[۲] ڈیون شائر۔ انگلستان کا ایک شہر اور مستقر صوبہ ہے۔ آبنائے برسٹل کے ساحل پر واقع ہے۔ قدرتی مناظر و باغ و چمن یہاں کے مشہور ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں کئی ٹین کی کانیں بہت مشہور تھیں۔

[۳] منیٰ مکہ معظمہ سے تین کوس ہے۔ یہ ایک وادی ہے جس کے دونوں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ اس وادی میں آٹھویں ذی الحجہ کی شام تک سب [illegible] آ [illegible] کو صبح عرفات [illegible] چلے جاتے ہیں [illegible] پھر واپس [illegible] دس، گیارہ، بارہ ذی الحجہ کو یہاں قیام کر کے (بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

اجازت نہ دی۔ ہم دونوں پہاڑوں میں پھرتے رہے اور ہمیشہ قدم بڑھاتے ہوئے چلتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو کہ کسی کام پر جا رہے ہیں۔ محض سرگشت نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر دوبارہ میں تم کو لینے کے لئے یہاں آؤں تو کیا میرے ساتھ تم انگلستان چلوگی۔ اس کا جواب اس نے نہایت خوشی کے ساتھ دیا کہ "ہاں" جیسے کسی بچے سے پوچھیں کہ تم مٹھائی کھاؤگے اور وہ بڑی خوشی سے حامی بھرے۔ میں نے اس سے کہا ایک برس میں تم انگلستان پہنچ جاؤگی۔ اس نے جواب دیا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ (یعنی کون مجھے وہاں پہونچائیگا)۔

کین کہتا ہے:—

"۱۸۷۷ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد میں نے یہ قصہ بہت سے آدمیوں سے بیان کیا جن میں سے بعض ہندوستان رہ آئے تھے اور بعض مشرق کے مشہور سیاح تھے اور ان کے ذریعہ سے اس خاتون کی مکے میں موجودگی کا واقعہ سرکاری عہداروں کے ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ چنانچہ محکمہ خارجہ کے ذریعہ سے انگریزی کونسل مقیم جدہ کو لکھا گیا کہ کسی مسلمان کو مکے بھیجکر پتہ لگایا جائے کہ فرضی قیدی آیا وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اس تحقیقات میں میرا بیان سچ ثابت ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ عورت مکے میں موجود تھی لیکن تھوڑے ہی دن قبل جن لوگوں کے ساتھ وہ رہتی تھی انھیں کے ہمراہ ہندوستان چلی گئی تھی۔ اب چونکہ محکمۂ خارجہ کی دسترس سے وہ باہر ہوگئی تھی اس لئے ضروری تحقیقات کے لئے انڈیا آفس میں تحریک کی گئی اور آخر بڑی مشکل سے ہندوستان میں اس لیڈی کا پتہ لگا گیا اور وہ ملگئی لیکن انگریز مجسٹریٹ علیگڈھ کو جس کی میم نے اس عورت سے کوئی دو گھنٹے تک باتیں کی تھیں۔ اس قصے کی اصلیت اور سچائی میں شبہ ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ لیڈی ایک غمزدہ عورت ہے اور مصیبت میں ہونیکی وجہ سے وہ اپنی اصلیت کو چھپاتی ہے اور اسی وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ دراصل انگریز لیڈی نہیں ہے۔"

اگرچہ کین نے خود یہ بیان کردیا ہے کہ علیگڈھ کے انگریز مجسٹریٹ کو اس قصے کی اصلیت میں شبہ ہے اور وہ اس عورت کو انگریز لیڈی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر بھی مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قربانی وغیرہ ارکان حج ادا کرتے ہیں۔ وادی منیٰ ایک قصبہ ہے جس میں وادی کے دو رویہ سینکڑوں مکان اور احاطے حاجیوں کے پڑاؤ کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مکان سال بھر تک خالی پڑے رہتے ہیں۔ صرف حج کے زمانے میں آباد ہوجاتے

علیگڈھ کی رپورٹ کا اقتباس بھی یہاں کر دیا جائے تاکہ ناظرین کو واقعات سے خود نتیجہ اخذ کرنے کا پورا موقعہ ملجائے اور کین کی دروغ بیانی اور فسانہ نگاری اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔ مجسٹریٹ صاحب اپنے مراسلہ نیم سرکاری موسومہ محکمہ خارجہ میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے محمد۔۔۔۔ کو طلب کیا۔ یہ شخص یہاں سے چو بیس میل کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ وہ دوسرے روز آیا۔ میں نے اس سے اس انگریز لیڈی کا ذکر کیا جو اس کے زیر حفاظت تھی۔ اور کہا کہ میں اپنی میم صاحبہ کو اس سے ملاقات کرانا چاہتا ہوں۔ اس نے اس عورت کی موجودگی کا اقبال کیا۔ اب تک وہ اس سے بالکل ناواقف تھا۔ اس نے اس عورت کو علیگڈھ لانے اور میری بیوی سے ملاقات کرانے کے متعلق کوئی عذر نہ کیا۔ چنانچہ نو بجے رات کا وقت مقرر کیا گیا اور اس وقت وہ لیڈی میرے بنگلے پر آئی اور میری بیوی نے دو گھنٹے سے زاید دیر تک اس سے بات چیت کی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لیڈی تو وہی ہے جس کا ذکر مسٹر کین نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ لیکن اصل بات سے ہی اس کو انکار ہے یعنی وہ یہ نہیں کہتی کہ وہ انگریز عورت ہے اور غدر کے زمانہ میں وہ اپنے اقربا سے چھوڑا ئی گئی تھی اور کوئی باغی اُس کو بہکا کر مکے لے گیا تھا۔ اور بالجبر اُس کو مسلمان کر کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ البتہ اس کے واقعات یہ ہیں کہ غدر کے تھوڑے دن بعد وہ مکے چلی گئی تھی۔ سات آٹھ برس ہوئے اس کا خاوند مکے یا مدینے میں مرگیا۔ مکے میں وہ انگریزی عورت کے نام سے مشہور تھی۔ وہ اردو عربی زبان بولتی تھی۔ کسی سوداگر کے انگریزی خطوں کا اردو ترجمہ بھی کر دیا کرتی تھی اور نہایت تنگی و ترشی سے اپنی زندگی کے دن بھرتی تھی۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس سال ہوگئی۔ اپنے باپ کی نسبت وہ کہتی ہے مجھے کچھ علم نہیں وہ کون تھا۔ اس کی ماں نے بھی اس کے باپ کا کچھ پتہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون تھا۔ میرا خیال ہے کہ باپ کوئی انگریز ہوگا اور اس کی ماں جیسا کہ وہ خود کہتی ہے کشمیری تھی۔ اس کو بچپن ہی سے انگریزی بولنے کی تعلیم دلائی گئی تھی۔ وہ بے تکلف انگریزی بولتی ہے مگر اس کا لہجہ انگریزوں کا سا نہیں ہے بلکہ ہندوستانیوں کا سا ہے۔ غدر کے بعد اتفاقات زمانہ سے جن پر اب تک پردا پڑا ہوا ہے وہ مکے پہنچ گئی وہاں ایک عرصہ تک رہنے کے بعد اب ۱۸۷۹ء میں ہندوستان واپس آئی اور اب

اپنی موجودہ حالت میں نہایت خوش و مطمئین ہے"

مجسٹریٹ علیگڈھ اور کین دونوں کے بیان کا مقابلہ کرنے سے حسب ذیل واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اور کین صاحب کی غلط بیانی آئینہ ہو جاتی ہے :-

(الف) غدر کے بعد زہرہ بیگم کو کسی باغی کے بہکا کر لیجانے کی کہانی کین صاحب کا من گڑھت قصہ ہے جس کی تصدیق مجسٹریٹ کی رپورٹ سے نہیں ہوتی۔

(ب) زہرہ بیگم انگریزی خاتون نہ تھی۔ بلکہ کسی کشمیرن کی لڑکی تھی۔

(ج) اس کا باپ کوئی ڈاکٹر سامن ڈیون شائر نہ تھا۔ خدا معلوم کون انگریز تھا۔

(د) بچپن میں اس کا انگلستان جانا کین کی بنائی ہوئی بات ہے۔

(ہ) اس کا انگریزی نام میکن توش کین صاحب کا ایجاد کردہ نام ہے۔ جس پر خود ان کو شبہ ہے۔

(و) وہ اپنی موجودہ حالت پر خوش و مطمئین تھی۔ انگلستان جانیکی خواہشمند بیان کرنا کین صاحب کا حسن ظن ہے۔

(ز) ہندوستان میں اس کے کسی انگریز رشتہ دار کا وجود ثابت نہیں ہے۔

واقعات متذکرۂ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زہرہ بیگم کی مکے میں موجودگی کی اطلاع کین کو جدے میں یا ہندوستان کے کسی شہر میں ہوئی ہوگی۔ اور کسی سوداگر نے جو زہرہ بیگم کو خط وغیرہ لکھوانے کی وجہ سے اچھی طرح جانتا ہوگا کین کو نومسلم سمجھ کر اس سے مساۃ مذکور کا ذکر کر دیا ہوگا جس پر کین نے یہہ سب رنگ چڑھا دیا۔ اگر اس کی ملاقات خود اس خاتون سے ہوئی ہوتی تو وہ اس واقعہ کے تمام اہم اور ضروری جزو نہ چھوڑتا اور جس حالت میں کہ وہ عورت اس سے کوئی بات چھپاتی نہ تھی اس کا فرض تھا کہ اس سے ہر واقعہ کی تفصیل پوچھ لیتا۔ برخلاف اس کے وہ اس کے انگریزی نام میں بھی شبہ کر رہا ہے اور اس کے باپ اور خاوند کا نام بھی دریافت نہ کیا تھا نہ اُس انگریز رشتہ دار کا نام پوچھا جس کے پاس وہ ہندوستان میں خط بھیجا کرتی تھی۔ یہہ امر قابل غور ہے کہ جب کین کو اس معاملہ کی طرف گورنمنٹ کی توجہہ معطوف کرانی تھی اور حسب وعدہ زہرہ بیگم کو مسلمانوں کے پاس سے رہائی دلا کر انگلستان پہونچانا تھا تو اس کا فرض تھا کہ ہر بات کو اچھی طرح تحقیق کر کے گورنمنٹ اور پبلک کے سامنے

کے وقت وہ لمبی چوڑی فہرست سوالوں کی بنا کر بھی گیا تھا ۔ مجسٹریٹ علیگڈھ نے بھی اپنے ہم مشرب مصنف کی دروغ بیانی کو چھپانے کے لئے اپنی رپورٹ میں (۳) واقعہ پر کافی روشنی نہیں ڈالی ۔ کم سے کم اس کو یہہ ذکر کر دینا چاہیئے تھا کہ مکہ معظمہ میں کین کی اس خاتون سے ملاقات بھی ہوئی تھی یا نہیں تاکہ کین کے سفر حجاز کی تصدیق تو ہو جاتی غرض کہ اس کہانی پر جتنا جتنا غور کرتے جاؤ بناوٹ ہی بناوٹ نظر آتی ہے ۔ اصلیت کا پتہ نہیں چلتا ۔

دہن کا ذکر کیا یاں سرہی غائب ہے گریبان سے

کاش میں پھول ہوتا!

از جناب شبیر حسن صاحب قیس حیدرآبادی

"کاش میں پھول ہوتا"! تو ہر شخص مجھ سے محبت کرتا۔ مجھ کو اپنے دل میں جگہ دیتا۔ میں حسینوں کے دستِ حنائی میں کھیلتا۔ میں مہ جبینوں کے لبِ نازک کے بوسے لیتا۔ میں کبھی ان کی گود میں لوٹتا۔ اُن کی صراحی دار گردن میں جھومتا۔ ان کے بلورین سینہ پر رقص کرتا۔ ان کے گیسوئے عنبرین میں بستا۔ ان کے سرخ رخساروں کو پیار کرتا۔

"کاش میں پھول ہوتا" آہ میں محفلوں کی زینت بنتا۔ جلسوں میں مہکتا۔ نوجوان اپنی محبوبہ کے لئے مجھے پیامِ محبت بناتے۔ بوڑھے میری خوشبو سے وجد میں آکر صلِ علیٰ پڑھتے۔ بادشاہ وشہنشاہ مجھے اپنے تخت پر جگہ دیتے۔ شہزادیاں مجھے عزیز رکھتیں، شاعر کے جذبات میری دید سے طوفانی ہو جاتے۔ وہ میری تعریف میں قصیدہ اور غزل لکھ ڈالتے۔ بلبل میری عاشق ہوتی، دنیا میری مفتوں ہوتی۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوتا۔ مگر افسوس میری مراد اب تک بر نہ آئی۔ اور مجھ میں پھول کی سی رنگت نہ آئی"۔

کانٹا۔ پہروں یہی فریاد کیا کرتا تھا۔ اُس کے ہمسایہ پھولوں نے ایکدن بیزار ہو کر اس سے کہا "اے کانٹے تیرا کہنا بالکل بجا ہے۔ مگر تو نہیں سمجھتا کہ ہمیں سر کٹانے کے بعد کہیں یہ رتبہ حاصل ہوا ہے۔ آہ تو نہیں جانتا کہ ہماری مختصر سی زندگی میں کس قدر تکالیف ہیں۔ ہم بظاہر تو خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور مہکتے ہیں۔ لیکن ہم ایک لمحہ بھی خوشی کی سانس نہیں بھر سکتے۔ صبح نسیم سحری نے ہم میں روح پھونکی ہم نے باغ عالم میں آنکھیں کھولیں اور ہوائیں ہمیں آغوش میں لئے پورے طور پر لوریاں بھی نہیں دینے پاتیں کہ مالی کا ہاتھ دستِ قضا بنکر ہمیں توڑ لیجاتا ہے اگر قسمت نے یاوری کی تو سورج کی تیز کرنوں سے بچتے بچاتے شام تک ہم میں کچھ دم باقی رہجاتا ہے اور اُس کے بعد موت کی ہوا ہماری روح کو جذب کر لیتی ہے۔ بس یہی ہماری زندگی کا مختصر فسانہ ہے اس لئے اے کانٹے تو پھول ہونے کی ہرگز تمنا نہ کر"

لیکن کانٹے نے پھولوں کی ایک بات نہ مانی اور اب تک آسمان کے طرف سر کئے "کاش میں پھول ہوتا"! "کاش میں پھول ہوتا"! کی فریاد کیا کرتا ہے جس کی وجہ سے بیچارہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔

نوائے راز

(از)

جناب ابو الفاضل راز چاند پوری

کہاں تک ضبطِ غم اے ہمنشیں آہ و فغاں کرلیں
وفا کے مدعی جتنے ہیں اُن کا امتحاں کرلیں

اجازت ہو تو کہہ لیں اپنے دل کی ہم بھی محفل میں
عنایت ہو تو رودادِ محبت کچھ بیاں کرلیں

محبت ہو تو آساں ہے نہیں تو سخت مشکل ہے
کہ جورِ چرخ کو ہم رنگ لطفِ دوستاں کرلیں

ضرورت ہے کہ دیں درسِ محبت دوست دشمن کو
ہم اپنے دل کو مطلق بے نیازِ این و آں کرلیں

محبت کیش بن کر بندۂ تسلیم ہو جائیں
ضیائے شمعِ الفت سے منور بزمِ جاں کرلیں

قیامت خیز ہے یہ تفرقہ شیخ و برہمن کا
مناسب ہے کہ دونوں بیعتِ پیرِ مغاں کرلیں

چمن کا راگ گائیں ملکے باہم یوں چمن والے
کہ گلچیں اک طرف، دنیا کو اپنا ہمزباں کرلیں

کہاں یہ مجمعِ احبابِ اہلِ دل، کہاں پھر ہم
ادھر آؤ ذرا اے راز دردِ دل بیاں کرلیں

*

شیرشاہ سوری

(از)

جناب شبیر علی صاحب متعلم بی۔اے کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱)

ابتدائی زندگی

شیرشاہ کا دادا | شیرشاہ جس کا اصلی نام فرید خاں ہے حسن خاں کا بیٹا تھا حسن کا باپ ابراہیم خاں اودہ کا افغان باشندہ تھا جس کے متعلق فرشتہ نے غلطی سے لکھا ہے کہ یہ خود کو سلاطین غور کی اولاد سے خیال کرتا تھا اور اسی کو پڑھ کر الفنسٹن نے بھی لکھا ہے کہ ابراہیم اور اس کا بیٹا حسن دونو اپنی قوم کی شریف زادیوں سے بیاہے گئے تھے ابراہیم خاں گھوڑوں کی سوداگری کیا کرتا تھا لیکن اس کی جماعت میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ "ابراہیم جد فرید سوداگری اسپاں می کرد"۔ اس وقت ابراہیم خاں سرگری کے ایک معمولی قصبے میں رہتا تھا لیکن گھوڑوں کی سوداگری میں اُسے زیادہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے وہ معہ اپنے لڑکے حسن خاں کے ایسے وقت جبکہ اوس کی عمر کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے تلاش معاش کے لئے ہندوستان روانہ ہوا اور مہابت خاں سور کی جاگیر بجواڑہ میں جو صوبہ جالندھر میں تھی پہنچا اور تھوڑے دن وہاں رہا لیکن چند دنوں کے بعد وہ جمال خاں سرنگ خانی کی ملازمت میں داخل ہوگیا جو ان دنوں حصار فیروز میں تھا۔ اسی حصار فیروز میں حسن خاں کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی تاریخ پیدائش یا سنہ کے متعلق کسی مورخ نے بھی تحقیق نہیں کی ہے البتہ گمان غالب ہے کہ وہ سنہ ۱۴۸۶ء میں سلطان بہلول لودھی کے دور میں پیدا ہوا اس وقت اس لڑکے کا دادا ابراہیم خاں معہ اپنے خاندان کے نارنول میں مقیم تھا۔ یہاں اُسے بہت سی زمینات بطور جاگیر سلطان کی جانب سے عطا کی گئیں تاکہ وہ سلطان کی فوج کے لئے چالیس سوار مہیا کرے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی ابراہیم خاں کا انتقال ہوگیا اور حسن خان کو اوس کے تمام جاگیرات سلطان نے عطا کئے۔

حسن خاں کی اولاد | فرید نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ اوس کے لئے بہت ہی ناموزوں تھا کیونکہ خود اوس کا باپ بہت

تھی۔ حسن خاں کو چار بیویوں سے آٹھ لڑکے تھے۔ فرید اور اس کا بھائی نظام خاں تو پٹھان بیوی سے تھے۔ علی اور یوسف دوسری سے۔ خرم خاں اور شادی خاں تیسری بیوی سے اور سلیمان و احمد چوتھی بیوی سے۔ سلیمان کی ماں لونڈی تھی لیکن حسن خاں اس کے حسن اور دلربائی کی وجہ سے اس پر ایسا وارفتہ و شیدا تھا کہ نہ وہ فرید خاں کی بات پوچھتا تھا اور نہ اوس کی ماں کے حال پر کچھ توجہ کرتا تھا۔ فرید کی ماں سیواجی کی ماں جی جی بائی کے مانند اپنے سنگدل شوہر پر زیادہ اثر اسی وجہہ سے نہ رکھ سکی کہ وہ حسن کی دیوی نہیں تھی۔ یہی وجہہ تھی کہ وہ اپنی دوسری بیویوں کے لڑکوں کی نسبت فرید اور اس کے بھائی نظام کو دل سے نہیں چاہتا تھا۔ باپ کی اس بد دلی کے باعث یہہ دونو بھائی ہمیشہ حیران و پریشان رہا کرتے تھے۔

فرید خاں کا باپ سے ناراض ہوکر جونپور چلا جانا

حسن نے اپنی کاروباری قابلیت کی وجہ سے اپنے مالک جمال خاں پر بہت اچھا اثر ڈالا جس کی وجہہ سے اس نے حسن کو رہتاس کے قریب سہسرام اور خواص پور کی جاگیریں بھی عطا کیں تا کہ وہ اوس کے لئے پانچ سو سوار ہمیشہ تیار رکھے اس طور پر حسن اب مع اپنے اہل و عیال کے نارنول سے سہسرام آگیا لیکن تبدیل مقام نے فرید یا اوس کے بھائی نظام کی قسمتوں پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا۔ ایک موقع پر جب حسن خاں اپنی جاگیرات کی تقسیم کر رہا تھا تو اس وقت اوس نے فرید کا کچھ خیال نہیں کیا اور اس کو جاگیر نہ دی جس پر فرید اور اوس کے باپ حسن کے درمیان بہت کچھ بحث ہوئی اور نتیجہ یہہ ہوا کہ باپ اور بیٹے کے تعلقات بالکل کشیدہ ہوگئے۔ اس طور پر فرید باپ سے رنجیدہ ہوکر جونپور میں جمال خاں کے پاس چلا گیا۔ جب حسن خاں کو یہہ معلوم ہوا تو اوس نے جمال خاں کو لکھا کہ فرید مجھ سے ناحق رنجیدہ خاطر ہوکر آپ پاس چلا آیا ہے آپ کے مکارم اخلاق سے امید ہے کہ آپ اوسے سمجھا کر میرے پاس بھیج دینگے اور اگر میرے پاس آنے کے لئے وہ راضی نہو تو آپ اس کو اپنی خدمت میں رکھیں اور علوم دینی و دنیوی کی تعلیم دلائیں جمال خاں نے فرید کو بلا کر اوس کے باپ کا خط دکھایا اور اوسے مجبور کیا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلا جائے لیکن اوس نے وہاں جانے سے اپنی ناراضی ظاہر کی اور کہا کہ اگر اوس کے باپ کی یہہ خواہش ہے کہ وہ اوسے تعلیم دلا کر قابل بنائے تو سہسرام سے جونپور ہی ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ یہاں بہت سے لایق لوگوں کا مجمع ہے۔ یہہ سنکر جمال خاں بہت متاثر ہوا اور اوس پر جبر نہیں کیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات جو پرانی ضرب المثل مشہور ہے وہ اسی زمانہ میں فرید خاں پر صادق آئی کیونکہ جونپور کے قیام کے دوران میں اوس نے اس زمانے کے دستور کے مطابق عربی اور فارسی کا پوری طور پر درس حاصل کیا اور شرع اسلامی سے بھی یہیں اس نے واقفیت حاصل کی۔ وہ ہمیشہ ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا جس میں سلف کے کارنامے لکھے ہوئے ہوں۔ عربی اور فارسی کا درس حاصل کرنے کے بعد اوس نے اپنے

جونپور کے قیام کے زمانے میں مالی معاملات، کاشتکاروں کے تکالیف، مسلمان سپاہیوں پر جبر وظلم اور محصول وصول کرنیوالوں کی بے جا سختیوں کے متعلق خوب معلومات حاصل کیں۔ فرید کی اس قابلیت کے باعث اوس کا باپ اور تمام عزیز واقارب اوس کو چاہنے لگے۔ اس طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک کمسن لڑکے کا جس کی عمر اس وقت بمشکل بارہ سال کی ہوگی اتنا جلد ایک غیر جگہ میں رہکر تمام معاملات پر حاوی ہونا کچھ کم عرصے میں ممکن نہیں تھا بلکہ اس سے یہہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرید جونپور میں تقریباً دس سال رہا۔ فرید کی اس قابلیت اور ہوشیاری سے متاثر ہوکر جمال خاں نے اپنے معاملات میں اس سے کام لینا شروع کیا جس کی وجہ سے تمام جونپور میں فرید کی لیاقت کا شہرہ ہوگیا۔ جب جمال خاں سے کسی سرکاری کام پر ملنے کے لئے حسن خاں جونپور آیا تو تمام لوگ حسن پر ملامت کرنے لگے کہ اس نے اپنے ایک ایسے قابل لڑکے کو صرف ایک لونڈی کے اثر کے تحت جلاوطن کر دیا ہے۔ گو فرید جوان ہے لیکن اس کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے اور اس کی پیشانی پر ستارۂ اقبال چمک رہا ہے اور قبیلہ سور میں نہ اس کے مانند اب تک کوئی لائق ہوا اور نہ آئندہ ہوگا چنانچہ سبھوں نے متفق الرائے ہوکر حسن خاں کو اس کے جاگیرات کا انتظام فرید کے سپرد کرنے پر مجبور کیا۔ حسن اپنے بیٹے کی قابلیت کا شہرہ سنکر بہت خوش ہوا اور اوسے اپنے جاگیرات کے انتظام کے لئے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

باپ کی جاگیرات میں فرید خاں کا انتظام

گھر آنے پر حسن خاں نے اپنی تمام جاگیرات کا انتظام فرید کے سپرد کر دیا لیکن فرید نے قبل اس کے کہ اپنے باپ کی جاگیرات میں قدم رکھے باپ سے وہاں کے انتظامات کے متعلق مکمل اختیارات حاصل کرلئے کہ وہ اوس کے زبردست علاقوں میں خواہ وہاں کے باشندے اوس کے باپ کے قرابت دار یا منہ چڑھے مقدم ہی کیوں نہ ہوں اگر رعایا پر ظلم کرینگے اور فرید کا حکم نہ مانینگے تو وہ ان پر سخت سے سخت سزائیں عاید کرکے دوسروں کو عبرت دلائیگا۔ اور ایسے موقع پر اوس کے باپ کو کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنا چاہئے تاکہ وہ جاگیرات کا انتظام اچھی طرح کرسکے اور واقعہ بھی یہہ ہے کہ اوس نے وہاں جاکر وہ انتظام کیا کہ جو اس زمانے کے سن رسیدہ تجربہ کاروں سے بھی ناممکن تھا حسن کی جاگیرات کی حالت اندنوں بہت خراب تھی جتنی بھی بدمعاشیاں ایک قوم یا قبیلے میں ہوسکتی ہیں وہ تمام حسن کی جاگیرات میں موجود تھیں۔ جب کبھی کوئی مسافر راستہ پوچھتا تو مسافروں کو غلط راستہ بتاکر اونھیں پریشان کرنا وہ اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ جاگیرات چونکہ فوج مہیا کرنے کے لئے دئے جاتے تھے اس لئے فوج کا اس زمانے میں بہت زور تھا۔ کیمپ کے قریب اگر کسی ہندو کا کھیت رہتا تو وہ اوسے تباہ و برباد کر ڈالتے اور اگر اگر ہندو کاشتکار جاگیردار کے پاس فریاد بھی کرتا تو فوجی لوگوں کو سزا دینا اوس کے لئے بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ وہ جاگیردار

انتظام کرنے اور فوجیوں پر اپنا قابو رکھنے کی قابلیت نہیں رہتی تھی۔ اس زمانے کے کاشتکاروں کی حالت بھیڑوں کے ایک ایسے سندے کے مانند تھی کہ جس کا کوئی رکھوال نہیں بلکہ وہ تمام وکمال فوجیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دئے گئے تھے۔ فوجیوں کے سوا غریب کاشتکاروں پر ایک اور طبقہ بھی ظلم کیا کرتا تھا اور وہ پٹواریوں یا مقدموں کا طبقہ تھا۔ غرض اس طور پر بحیثیت مجموعی جاگیرات کی حالت نہایت ہی خراب تھی لیکن فرید اپنی اعلی قابلیت اور تجربے کی بناء پر جو کہ اوس نے جونپور میں حاصل کیا تھا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ سولھویں صدی کے ابتدائی دور میں فرید نے وہ معاشی نظریہ وجود میں لایا جو آج کے موجودہ زمانہ میں بھی کارآمد ہوسکتا ہے یعنے یہہ کہ فرانسیسی گروہ فطرآئین کے مانند فرید نے بھی زراعت ہی کو تمام پیداوار اور دولت کا ماخذ و منبع قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی کاشتکاروں کی محنت کی اس نے بہت قدر کی۔ اس نے ٹھیک طور پر پتہ لگا لیا کہ بجز کاشتکاروں کی مدد کئے اور اون کی حالت سنبھالے کے جاگیرات کی معاشی اور مالی حالت سدھارنا مشکل ہے چنانچہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کاشتکار تمام تر مال و دولت کے ماخذ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ زراعت کا انحصار انھی غریب اور عاجز کاشتکاروں پر ہے اگر یہہ بچارے مفلس ہوں تو کچھ بھی نہیں مدد کرسکینگے لیکن اگر یہہ خوش حال رہیں تو بہت کچھ دولت پیدا کرسکتے ہیں۔ "از احوال ایشان خبردار خواہم بود تا کسے بر ایشان ظلم و تعدی نکند و اگر حاکم رضائے رعیت را از ستمرین نگاہ نتوانست داشت محصول گرفتن از ایشان ظلم و حیف باشد۔" اس طرح پر کاشتکاروں کی حالت سنبھالنے اور مقدموں پٹواریوں اور فوجیوں کے ظلم وجور سے انھیں محفوظ رکھنے کے لئے اوس نے خاص طور پر ان کی سرپرستی کی۔ اوس نے اپنی تمام رعایا کو جمع کیا اور اونھیں اون کے حاضر و مستقبل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا انھیں یہہ جاننا چاہئے کہ میاں حسن نے مجھے تمھارے تقرر اور برطرفی کا اختیار دے رکھا ہے اور میں اپنی تمام سعی جاگیرات کے انتظام، زراعت اور آبادی کی توفیر میں کرونگا اس میں خود تمہارا فائدہ اور میرا نام ہے اس لئے زراعت پر کسی کو بھی کسی طرح کا بار نہیں ڈالنا چاہیے اور نہ ترکوں کے مانند کاشتکاروں پر ظلم کرنا چاہئے اگر کبھی مجھے یہہ معلوم ہو جائے کہ کسی نے بھی رعیت پر ظلم کرکے گھاس کا ایک گٹھا ہی کیوں نہ لیا ہو تو میں اوسے بہت سخت سزا دونگا تا کہ اوس سے دوسروں کو عبرت ہو اور میں کبھی اس کو روا نہیں رکھ سکتا کہ کوئی بھی میرے احکام کی بے وقعتی کرے۔ ایسا کرنے کی صورت میں ان بدمعاشوں کو میں پہلے سے بھی سخت سزا دونگا تا کہ رعیت اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کھیتوں کے بونے اور جوتنے میں مصروف ہوں اگر رعایا اپنی محنت سے کھیت کی پیداوار میں اضافہ کرے تو میں کبھی مقررہ مقدار سے زاید لگان اس سے نہیں لونگا بلکہ زاید پیداوار کی مالک وہ خود ہی رہیگی۔ یہہ میری عین خواہش ہے کہ میرے اس انتظام سے امیر وغریب یکساں فائدہ [illegible] اوس نے رعایا سے مخاطب ہو کر کہا تمھیں اختیار ہے کہ تم لگان [illegible]

صورت میں۔ اوس نے مقدموں اور پٹواریوں کا واسطہ اٹھا کر بلا واسطہ راست طور پر اپنا تعلق قائم کیا۔ ان میں سے اکثروں نے روپے کی شکل میں اور بہتیرے آدمیوں نے جنس کی صورت میں اپنی اپنی سہولت کے موافق لگان ادا کرنا چاہا چنانچہ اوس نے ان کی خواہش کے مطابق ان سے قبولیت اور قول لکھوائے اور کہا کہ تمھیں جو کچھ بھی کہنا ہو مجھ سے بذات خود کہہ سکتے ہو۔ اس کے بعد اوس نے اپنی توجہ جاگیر کے ان بدمست شریر اور باغی زمینداروں کی طرف کی جن کے سبب سے ایک دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اوس کا سب سے پہلا وار مقدموں اور پٹواریوں پر ہوا۔ کیونکہ ان لوگوں نے اس کے باپ کی کمزوری سے فایدہ اوٹھا کر لگان کا بہت سارا روپیہ وصول کرلیا تھا اور بغیر جاگیردار کو ادا کئے اوس کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس نے سواروں کے ایک زبردست دستے کے ساتھ ان لوگوں کے قصبات پر حملہ آور ہو کر ان کا تمام مال واسباب لوٹ لیا۔ مویشی گرفتار کرلئے اور جورو بچوں کو قید کرلیا۔ اس نے تمام مال غنیمت اپنی فوج کا دل خوش کرنے اور اونھیں اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے تقسیم کردیا لیکن اون کے اہل و عیال کو خاص اپنی حفاظت میں رکھا تاکہ فوجی لوگ ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرسکیں۔ آخر کار مقدموں اور پٹواریوں نے مجبور ہو کر اطاعت کی قسم کھائی اور تمام بقایا ادا کردیا اور اپنے آئندہ چال وچلن کی عمدگی کا اوسے پورے طور پر اطمینان دلایا۔

دوسرا وار باغی زمینداروں پر کیا گیا۔ یہہ باغی زمیندار ناقابل گزر گھنے جنگلوں میں رہا کرتے تھے اس نے سب سے پہلے یہہ کام کیا کہ یہہ تمام جنگل رفتہ رفتہ کٹوا دئے۔ فوج کو حکم دیا کہ گاؤں والوں میں سے جو کوئی بھی دکھائی دے اونھیں قتل ڈالو۔ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلو۔ مویشیوں کو پکڑ لو۔ کاشت تباہ کرڈالو تاکہ اون کے لیے خوراک کا کوئی سامان باقی نہ رہے۔ اس طور پر زمینداروں نے جب اپنے آپ کو بالکل بے بس پایا تو وہ بھی اس کی اطاعت پر آمادہ ہوگئے۔ لیکن وہ ان باغیوں کی فطرت سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے ان میں سے اکثر آدمیوں کو قتل کروادیا اور ان کی عورتوں کو فروخت کرڈالا اور گاؤں کو از سر نو دوسرے مقامات سے آدمیوں کو بلا کر آباد کیا۔

سوتیلی ماں کا رشک اور فرید کی جاگیرات سے علحدگی

اس طور پر فرید نے اپنے باپ کی جاگیر میں تقریباً ۸ سال یعنے ۱۵۱۱ء سے ۱۵۱۹ء تک وہ انتظام کیا کہ دوست دشمن تمام اوس کی قابلیت کے معترف ہوگئے اور خود اوس کے باپ پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ وہ فرید اور اوس کے بھائی نظام کو دل سے چاہنے لگا۔ لیکن حسن جس وقت فرید کو اپنی جاگیرات کا شقدار مقرر کر رہا تھا اوسی وقت سلیمان کی ماں نے حسن سے قسم لی تھی کہ جب سلیمان سن وشعور کو پہونچ جائیگا تو وہ جاگیرات کا شقدار اوسے بنائیگا۔ جب سلیمان کی ماں نے فرید کی اس قدر شہرت سنی تو وہ بہت رنجیدہ ہوئی اور دل سے [illegible]

اوس کی شکایتوں سے بھر دیئے گئے۔ لیکن حسن چونکہ بیٹے کی قابلیت سے بہت متاثر ہوچکا تھا اس لیے ایک روز غصے میں آکر کہا کہ سوائے تیرے اور تیرے بیٹے کے میرے دوستوں، لوگوں، رعیت اور سپاہیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو فرید کی شکایت کرتا ہو۔ اس پر سلیمان کی ماں نے حسن سے غصہ ہو کر بات چیت کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن جب ایک روز حسن نے اوس کی خفگی کا سبب دریافت کیا تو وہ بہت ہی تاسفانہ لہجے میں آنکھ میں آنسو بھر لاکر بولی کہ اگر حسن اپنی قسم کو پورا نہ کریگا تو وہ خود کشی کرلیگی اور اس کا ذمہ دار حسن ہوگا۔ حسن پہلے ہی سے اس پر دارفتہ تھا۔ یہہ سنتے ہی بے چین ہوگیا اور اب یہہ کوشش کرنے لگا کہ فرید کا ذرا سا بھی عیب یا بدانتظامی اگر اوسے معلوم ہو تو اس الزام میں اوسے شقداری سے علیحدہ کردے اور اپنے حسب وعدہ سلیمان کو شقدار مقرر کرے لیکن اس نے فرید میں کوئی عیب نہیں پایا۔ تاہم سلیمان کی ماں سے وعدہ کرلیا کہ وہ فرید کو ہٹا کر اوس کے لڑکے کو شقدار بنائیگا۔ فرید کو باپ کا یہہ ارادہ بہت جلد معلوم ہوگیا۔ لہذا معلوم ہوتے ہی اوس نے خود بخود جاگیرات سے دست برداری اختیار کرلی اور مع اپنے بھائی نظام کے آگرے سے بہت دور تلاش معاش کے لیے نکل گیا۔ گویہاں سے بیچارے فرید کو پھر مصیبت کا سامنا ہوا لیکن حقیقت یہہ ہے کہ سہسرام کی شقداری کا زمانہ اوس کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ کیوں کہ اس شقداری کے تجربے نے اوسے آگے چل کر ہندستان جیسی وسیع سلطنت کا انتظام کرنیکا اہل بنادیا۔

فرید کا سلطان ابراہیم کی ملازمت میں داخل ہوکر دوبارہ ملازمت حاصل کرنا

اس طرح پر سلیمان کی ماں کے رشک وحسد کی بناء پر دوسری مرتبہ فرید کو اپنے باپ کی جاگیر سے جلا وطن ہونا پڑا بعد ازآں وہ آگرہ پہونچا جو اس وقت سلطان سکندر لودھی کے زیر حکومت مرکز سلطنت تھا۔ سلطان سکندر کے ۱۵۱۷ء میں انتقال کے سبب سے ابراہیم جو اوس کا جانشین ہوا تھا وہ بھی یہیں مقیم تھا۔ آگرہ پہونچنے سے پہلے وہ کانپور میں شروانیوں کا مہمان رہا جہاں اوس کی دو اشخاص سے بہت زیادہ دوستی ہوگئی ان میں سے ایک شیخ اسمٰعیل اور دوسرا اوس کا بہنوی حبیب خاں تھے جو کہ بعد میں چل کر شیرشاہ کے زمانے میں شجاعت خاں اور سرمست خاں کے خطاب سے علی الترتیب سرفراز ہوئے آگرے میں اوس نے سلطان ابراہیم کے ایک امیر دولت خاں کی ملازمت قبول کرلی اور اپنی کاردانی سے دولت خاں کو اس قدر متاثر کیا کہ اوس نے اوس کے باپ کی زندگی ہی میں سلطان کے حکم سے اس کی جاگیر کا ایک پرگنہ فرید کے نام منتقل کروا دیا لیکن اس کے چند دنوں بعد ہی حسن کا انتقال ہوگیا اور دولت خاں حسن کی تمام جاگیرات کی منتقلی کا فرمان فرید کے نام سلطان سے لکھوالیا۔

مخزن التواریخ میں لکھا ہے کہ شاہی فرمان میں نہ صرف فرید کا نام تھا بلکہ اوس کے بھائی نظام کا بھی نام اوس میں شریک

جانب سے پیش کی گئی ہو جس کی بناء پر فرمان میں دونو کا نام لکھا گیا تھا ۔ فرمان حاصل ہونے کے بعد اب فرید دوبارہ اپنے عزیز و اقارب اور رعایا کی خوشی آمدید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر سہسرام میں داخل ہوا ۔ اسی صورت میں سلیمان اپنے آپ کو بے بس پاکر محمد خاں سور کے پاس پناہ گزین ہوا جو اس وقت چوندہ کا گورنر تھا ۔ قصبہ چوندہ سہسرام سے ۴۴ میل مغرب میں واقع ہے ۔ محمد خاں اس وقت پندرہ سو سواروں کا حاکم تھا اوس نے سلیمان کی دلجوئی کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ اوس کا حق دلانے میں ضرور کوشش کریگا ۔ محمد خاں سور نے دونوں بھائیوں کی آپس میں صلح کرا دینے کی خواہش ظاہر کی جس پر فرید نے اوسے لکھا کہ میں اپنے بھائی نظام کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں تاکہ وہ سلیمان کو میرے پاس لائے اور میں اس کو باپ کی جاگیرات سے اس قدر حصہ دونگا جس سے وہ مطمئن ہو جائے لیکن اس کے یہہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ حق حکومت میں بھی میرا شریک رہے اور جب تک کہ میں زندہ ہوں کسی طرح وہ تنظیمی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا کیونکہ یہہ ضرب المثل مشہور ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ۔ لیکن سلیمان کی خواہش تھی کہ وہ اپنا شرعی حصہ جاگیرات میں سے لیکر بذات خود اوس پر حکومت کرے اس پر فرید خاں راضی نہ ہوا چنانچہ نتیجہ یہہ ہوا کہ محمد خاں سور نے تلوار کے زور سے سلیمان کا حق فرید سے لینے کی سلسلہ جنبانی کی ۔

فرید کا بہار خاں کی ملازمت میں داخل ہونا

اس موقع پر لودھی سلطنت کے مشرقی صوبہ جات میں بہت سی بغاوتیں برپا تھیں ۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے ابراہیم نے بہت سے ان امرا کو جو سلطان بہلول اور سکندر لودھی کے زانو بزانو بیٹھتے تھے دھوکا و فریب سے قتل کروا دیا جس کی بنا پر بہار کا صوبہ دار دریا خاں لوہانی جو شروانیوں پر فتح پاکر آگرہ جا رہا تھا اس اندیشے سے کہ کہیں ابراہیم اوس کو بھی قتل نہ کروا دے آگرہ جانے کے ارادے کو ملتوی کرکے اپنے صوبے کو واپس لوٹ گیا اور ناصر خاں لوہانی صوبہ دار غازی پور اور معارف فارملی صوبہ دار اودھ کی معیت میں علم بغاوت بلند کیا ۔ یہہ باغی دریا خاں لوہانی کی سرکردگی میں بہار سے جونپور تک قابض ہوگئے لیکن دریا خاں لوہانی کے یکایک انتقال کی وجہ سے اوس کا بیٹا بہار خاں جو اکثر تواریخ میں غلطی سے بہادر خاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اوس کا جانشین ہوا ۔ اور اصلی معنوں میں وہ آزاد حکومت کرنے لگا گو ابراہیم کے انتقال تک نہ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور نہ سکہ رائج کیا ۔ اس موقع پر فرید یہہ دیکھ کر کہ ایک کمزور شہنشاہ کا صرف فرمان اس کے جاگیرات پر محمد خاں سور کو حملے سے نہیں روک سکتا جب تک کہ وہ ان جاگیرات کی حفاظت کے لئے کسی اور طاقتور کا سہارا نہ دھونڈے اس لئے وہ ۱۵۲۲ء میں بہار خاں کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور اس قدر جاں فشانی سے دن رات اوس کی خدمت میں مشغول ہوا کہ بہت جلد آقا کو اپنا غلام کر لیا اور بہار خاں کی غیر معمولی توجہ اور مہربانی کی بنا پر وہ تمام بہار میں بہت

مشہور ہوگیا۔ اس دوران میں ایک دن جبکہ وہ بہار خاں کے ساتھ شیر کے شکار کے لئے گیا ہوا تھا شیر کے یکایک سامنے آتے ہی فرید نے اوس پر ایسا وار کیا کہ پہلے ہی مرتبہ اوس کا کام تمام ہوگیا۔ چنانچہ اس غیر معمولی شجاعت کی بنا پر بہار خاں نے اوسے شیر خاں کا خطاب عطا کیا۔

سلطان محمد کی شیر خاں سے مخالفت اور شیر خاں کا مغلیہ ملازمت میں داخل ہونا

چند دنوں بعد بہار خاں سے شیر خاں کی فراست اور دانائی کا ٹھیک اندازہ کرکے اوسے وکیل سلطنت مقرر کیا اور اوس کے ساتھ ہی اپنے کمسن لڑکے جلال خاں کا اتالیق بھی بنایا۔ اس طرح ہر ایک عرصے تک وہ یہہ کام انجام دیتا رہا۔ لیکن کچھ دن بعد غالباً پانی پت کی پہلی لڑائی سے پہلے وہ بہار خاں کی اجازت سے یہہ وعدہ کرکے کہ وہ بہت جلد واپس آئیگا اپنی جاگیر سہسرام میں واپس آیا۔ لیکن وہ حسب وعدہ واپس نہ ہوسکا جس کی بنا پر بہار خاں جو اب سلطان محمد کے نام سے مشہور ہوگیا تھا ہمیشہ شیر خاں کو یاد کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ شیر خاں نے بہت جلد واپس ہونیکا وعدہ کیا تھا لیکن وہ اب تک نہیں آیا۔ چونکہ ان دنوں مغلوں کی طرف سے حملے کا خدشہ تھا اور پریشانی کا زمانہ تھا اس لئے ایک شخص دوسرے پر بہت کم بھروسہ کرتا تھا لیکن کسی مورخ نے بھی شیر خاں کی اس وعدہ خلافی کے نسبت کچھ نہیں لکھا کہ اس کا کیا سبب تھا۔ مخزن التواریخ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی خاص کام کی بنا پر شیر خاں اپنے وعدہ کو پورا نہ کرسکا جس وجہ سے سلطان محمد کو اس کی یاد ہمیشہ ستاتی تھی۔ بعض نے اس کے متعلق یہہ خیال کیا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی حالات کے تحت شیر خاں خاص کام کے نام یا حیلے میں سلطان محمد کی دوستی سے منحرف ہوچکا تھا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کے بعد ہی ناتجربہ کار خود غرض افغان سرداروں نے خود اپنے قبیلے کے سرداروں پہ غالب نہ آکر مغلوں کی مدد سے اپنے خانگی رشتہ دار دشمنوں کا استقبال کرنے کی خاطر بابر کو ابھارا تھا کہ وہ مشرقی حصے پر حملہ آور ہو۔ ان لوگوں میں شیخ بایزید فارملی اور محمد خاں لوہانی تھے۔ اول الذکر کی معارف فارملی سے جو کہ اودھ کا حکمران تھا لڑائی تھی کیونکہ اس نے اس کے بھائی شیخ مصطفیٰ کو مار ڈالا تھا اور آخر الذکر ناصر خاں جو صوبہ دار غازی پور کا دشمن تھا چنانچہ انھی ناعاقبت اندیشوں کے بھکانے پر مغلوں کو اتنی جرات ہوئی کہ باوجود سخت بارش کے مشرقی حصے پر حملہ آور ہوں۔ بابر نے اس مہم پر ہمایوں کو مامور کیا یہہ مہم اگست ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء میں شروع ہوئی اور پورے پانچ ماہ تک تمام ملک میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ معارف فارملی اور ناصر خاں جو سلطان محمد کے زبردست مددگار تھے مغلوں کی مہمات سے تنگ آکر بھاگ گئے تو ہمایوں نے ان کی جگہ پر اپنی جانب سے بایزید اور محمد خاں کو اودھ اور غازی پور کا علی الترتیب صوبہ دار مقرر کیا اور جونپور میں جنید برلاس کو مقرر کیا کہ بذات خود باغیوں کی سرکوبی کرے ایسے موقع پر جب کہ سلطان محمد اپنے زبردست مددگار [illegible]

تجربہ کار شخص پر اوس کی وعدہ خلافی کی وجہہ سے اوس کا شبہ کرنا کچھ بعید از عقل نہیں ۔کیونکہ سلطان محمد کو ہمیشہ اس کا
ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں معارف فارملی اور ناصر خاں کی مانند اسے بھی اپنی حکومت سے دست بردار نہ ہونا پڑے ۔غرض
کسی طرح ہی کیوں نہ ہو شیر خاں تقریباً جولائی سے ڈسمبر یعنے چھ ماہ تک اپنی جاگیر سہسرام میں ٹھہرا رہا ۔اس موقعے پر
محمد خاں سور نے جو شیر خاں کا دشمن تھا سلیمان محمد کو سمجھایا کہ شیر خاں سلطان سکندر کے بیٹے سلطان محمود لودھی کی اطاعت
قبول کر چکا ہے جو کہ ابراہیم کے قتل پر تخت دہلی کا دعویدار تھا اور کنورہ کی جنگ میں افغانوں اور راجپوتوں کے ساتھ مغلوں
کا مقابلہ کیا تھا لیکن اس پر کسی طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ شیر خاں جیسا سیاس ایسا کام کرتا جس کی وجہ سے ایک طرف
تو مغل اور دوسری طرف سلطان محمد لوہانی اوس کے دشمن ہو جاتے ۔غرض محمد خاں سور نے موقعے کی اہمیت کو سمجھکر
سلیمان کو سلطان محمد کے پاس پیش کیا جو کہ شیر خاں کے خلاف محمد خاں سور کے پاس پناہ گزین تھا ۔محمد خاں سور نے
سلطان محمد پر زور دیا کہ حسن خاں کے تمام جاگیرات اوس کے لایق بیٹے سلیمان کے نام منتقل کر دیے جائیں لیکن سلطان محمد
نے جب ایسا کرنے سے انکار کیا تو اوس نے کہا کہ کم سے کم حسن خاں کے جاگیرات میں سے جائز حصہ تو بھی سلیمان کو ملے ۔
اس پر سلطان محمد نے اپنی رضامندی ظاہر کی ۔سلطان محمد کی رضامندی کے ساتھ ہی محمد خاں سور خود سہسرام آیا
اور اپنے غلام شادی خاں نامی کو شیر خاں کے پاس اوسی پیام کے ساتھ بھیجا جس کو کہ پہلے شیر خاں ادا کر چکا تھا (۱۵۲۶ء)
شیر خاں نے شادی خاں سے کہا کہ یہہ اودہ کا ملک نہیں ہے کہ میں اپنے بھائی کو مساوی حصہ دوں بلکہ یہہ ہندوستان ہے
جہاں بادشاہ کی مرضی سب سے اول ہے اس لئے نہ اس میں کوئی حصہ بانٹ سکتا ہے اور نہ یہاں چھوٹے بڑے کا
یا قرابت دار کا خیال کیا جا سکتا ہے ۔سکندر لودھی نے یہہ تصفیہ کر دیا ہے کہ اگر کوئی امیر مر جائے تو اوس کی نقد رقم اور
تمام مال و اسباب اوس کے جایز ورثا میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اوس کا عہدہ اور جاگیرات وہی پائیگا جو اس کے لڑکوں
میں سب سے زیادہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے جو کچھ مال و اسباب میرے باپ کے پاس تھا اوس کا تو تمام
و کمال سلیمان مالک ہو چکا ہے اور رہا جاگیرات کا معاملہ تو اسے سلطان ابراہیم نے مجھے خاص اپنے فرمان سے عطا کئے ہیں
اس میں کوئی بھائی حصہ نہیں بانٹ سکتا میں اپنے بھائیوں سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آمدنی میں سے ضرور اونھیں حصہ
دونگا لیکن حکومت میں وہ میرے شریک نہیں ہو سکتے بلکہ حکومت میری رہیگی ۔اور تمھیں اس کا کوئی حق نہیں کہ میرے
باپ کے جاگیرات میں کا کوئی علاقہ سلیمان کو دینے پر مجھے مجبور کیا جائے ۔محمد خاں سور سے تم یہہ جا کر کہو کہ اگر وہ جبراً
ان علاقوں کو تلوار کے زور سے مجھ سے لیکر سلیمان کو دینا چاہتا ہے تو دے ورنہ میں تو کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتا ۔
شادی خاں نے جب شیر خاں کی یہہ تمام باتیں محمد خاں سور کو سنائیں تو وہ غصے میں آ کر اپنے سے باہر ہو گیا اور حکم دیا کہ

اوس کی تمام فوج شیرخاں کے خلاف روانہ ہو۔ جب شیرخاں کو اس کی خبر معلوم ہوئی تو اوس نے اپنے غلام ملک شقہ کو جو خواص پور اور ٹانڈہ کا صوبہ دار تھا حکم دیا کہ وہ محمد خاں کا مقابلہ کرنے میں کسی قسم کی کمزوری نہ ظاہر کرکے بلکہ جواں مردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے۔ جب شادی خاں اور سلیمان دونو خواص پور پہنچے تو ملک شقہ نے خود لڑائی کی سلسلہ جنبانی کی لیکن بدقسمتی سے وہ خود سر لڑائی میں کام آیا اس طرح پر شیرخاں کی فوج اپنے سپہ سالار کے مارے جانے سے نہایت ہی منتشر حالت میں سہسرام کو واپس ہوئی۔ شیرخاں نے ایسے موقع پر اپنے بھائی نظام خاں اور دوسرے اپنے مشیروں کو جمع کیا تاکہ ان کے مشورے سے کچھ کام کرے ان میں سے بعض نے اوسے سلطان محمد لوہانی کی امداد طلب کرنے کی رائے دی لیکن وہ ایسے شخص سے جس کے بالواسطہ حکم سے ہی محمد خاں سور کو اس کے علاقے پر حملہ کرنے کی جرأت ہوئی تھی مدد کا طلب کرنا معیوب سمجھا۔ لیکن اس کے بھائی نظام نے سلطان جنید برلاس کے ذریعے مغلوں کی ملازمت قبول کرنے کی رائے دی تاکہ نہ صرف شیرخاں کی مدد کرے بلکہ محمد خاں سور کو جوندہ سے نکال باہر کرے۔ شیرخاں نے اس رائے کو پسند کیا اور اپنے ایلچی جنید برلاس کے پاس بھیجے۔ مغل صوبہ دار نے شیرخاں کو ہر طرح کا اطمینان دلایا تو شیرخاں خود جونپور گیا اور بہت سے قیمتی تحائف اوس کی خدمت میں پیش کرکے مغل بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہوگیا۔

مغل حکومت کے متعلق شیرخاں کی رائے

شیرخاں نے جس ارادے سے مغلوں کی ملازمت قبول کی تھی اوس کے متعلق عباس شروانی لکھتا ہے جس کو بعد کے بہت سے مورخین بھی بے سمجھے بوجھے نقل کرتے چلے آئے ہیں کہ جونپور کا مغل صوبہ دار یعنی جنید برلاس نے تھوڑے ہی عرصہ بعد شیرخاں کو ایک فوج کا دستہ دیا کہ وہ اس کی مدد سے اپنی جاگیر پر قابض ہوجائے۔ شیرخاں اس دستے کی مدد سے نہ صرف اپنی جاگیر پر قابض ہوگیا بلکہ دوسرے علاقے بھی اپنے دشمنوں سے حاصل کئے لیکن غور کرنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مغلوں کی ملازمت سے شیرخاں کو جائے امن تو ضرور ملگئی لیکن اوس کے جاگیرات کے دوبارہ ملنے کا کوئی امید افزا مستقبل اوس کے سامنے نہ تھا کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مغل مغرب میں راجپوتوں اور دیگر دشمنوں کی وجہ سے پریشان تھے اور تمام مغل سپاہ فتح پور سیکری کے قریب بابر کی سپہ سالاری میں کام کر رہی تھی۔ فروری اور مارچ ۱۵۲۷ء کا زمانہ بابر کی زندگی کا بہت ہی مشکل حصہ ہے کیونکہ اسے ہر جانب سے اندیشہ تھا۔ جس کی بنا، پر وہ بہت غیر مطمئن تھا۔ کنوہہ کی جنگ میں راجپوتوں اور پٹھانوں پر فتح پانے کے باوجود مغلوں کو مشرق میں ابھی ایک خطرہ تھا کیونکہ شیخ بایزید فارملی مغلوں سے منحرف ہوکر علم بغاوت بلند کرچکا تھا لہٰذا

عطا کرنا نہایت ہی ناممکن اور بعید از عقل ہے۔ حقیقت یہہ ہے کہ شیر خاں سلطان جنید برلاس کے پاس دو تین ماہ تک صرف اس امید میں ٹھہرا رہا کہ وہ کسی موقع پر شہنشاہ بابر کے پاس اوسے پیش کر دے۔ جنگ کنوہہ کے بعد جب جنید برلاس آگرہ گیا تو شیر خاں بھی اس کے ساتھ تھا اس موقع پر سلطان جنید برلاس نے اپنے بھائی میر خلیفہ کے ذریعے جو کہ بابر کا چہیتا وزیر تھا شیر خاں کی بادشاہ کے پاس سفارش کروائی اس کے بعد سے وہ بابر کے پاس اس امید اور خواہش میں رہا کہ اگر بابر کی فوج مشرقی حصے میں فتوحات کے لئے جائے گی تو خود بخود اوسے اوس کے موروثی مقبوضات ملجائینگے۔ شیر خاں بابر کے پاس تقریباً پندرہ مہینے یعنی اپریل ۱۵۲۷ء سے جون ۱۵۲۸ء تک رہا اور اسی عرصے میں جب بابر کی فوج مشرقی مہمات پر روانہ ہوئی تو اوس کے جاگیرات اوسے واپس مل گئے۔ اس پندرہ ماہ کے عرصے میں شیر خاں نے کچھ کار نمایاں نہیں انجام دئے لیکن عباس اور دوسرے مورخین نے شیر خاں کی ابتدائی زندگی کے حالات اور اوس کی بعد کی عظیم الشان کامیابی سے متاثر ہو کر عجیب بے بنیاد من گھڑت قصے لکھدئے ہیں جس میں سے عباس ایک واقعہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے جس کو وہ اپنے چچا شیخ محمود سے جن کی عمرہ سال کی تھی سنا تھا۔ شیخ محمود کا بیان ہے کہ میں مہم چندیری میں خان خانان یوسف خیل کی ملازمت میں تھا کہ شیخ ابراہیم شروانی اوسے شیر خاں کے خیمے میں لیگیا اور باتوں میں شیخ ابراہیم نے کہا۔ یہہ ناممکن ہے کہ افغان دوبارہ ملک ہند کے مالک ہوجائیں۔ شیر خاں نے یہہ سن کر شیخ محمد سے کہا کہ تم میرے اور شیخ ابراہیم کے درمیان گواہ رہو کہ اگر طالع و بخت میری مدد کرے تو تھوڑی مدت میں مغلوں کو ہندوستان سے میں باہر نکال دونگا اس کی وجہ یہہ ہے کہ افغان جنگ و شمشیر زنی میں مغلوں سے فائق ہیں افغانوں نے اپنے ہند کی سلطنت اپنی نا اتفاقی کی بنا پر کھوئی ہے۔ میں نے مغلوں میں رہ کر اون کی جنگ کی روش دیکھی کہ میدان جنگ میں وہ ثبات و قرار نہیں رکھتے ہیں اور ان کے بادشاہ اپنے علو، نسب و شرافت کے سبب سے اپنے نفس نفیس سے ملکی معاملات میں حصہ نہیں لیتے۔ امور و مہمات ملکی اپنے امراء و ارکان دولت کے سپرد کر دیتے ہیں اور ان کے قول و فعل پر اعتماد رکھتے ہیں یہہ امراء سپاہی، رعیت اور زمینداروں سے رشوت خوب دل کھولکر لیتے ہیں۔ وفادار ہو یا بیوفا جس کے پاس زر ہو وہ اپنے حسب دلخواہ سارے کام بنا لیتا ہے اور جس کے پاس زر نہیں خواہ وہ کیسی ہی دولتخواہی کرے اور سپاہی خواہ کیسی ہی شمشیر زنی کیوں نہ کرے اوس کے کاموں کے چلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

بہر در کہ رشوت ستاں یافتی   اگر یار داری رماں یافتی

طمع زر کے سبب سے دوست دشمن میں حاکم تمیز نہیں کرتا۔ اگر بخت نے میری یاوری کی تو شیخ جی آپ دیکھ لینگے کہ میں افغانوں کو کس طور سے اپنے ساتھ وابستہ کرتا ہوں کہ وہ پھر دوبارہ کبھی متفرق نہوں، ـــــــ لیکن حقیقت یہہ ہے کہ مذکورہ بالا قصے کا تاریخ [illegible]

یوسف خیل کے ساتھ رہنا ہی بالکل غلط ہے اس لئے کہ یہہ خان خانان یوسف خیل وہی شخص ہے جس کو بابر دولت خاں یوسف خیل پکارا کرتا تھا اور یہہ دولت خاں چندیری کے محاصرے سے دو سال قبل دسمبر ۱۵۲۶ء میں انتقال کر گیا۔ دوسرے یہہ کہ اس محاصرے کے وقت شیر خاں کچھ کمسن نہیں تھا بلکہ اس کی عمر اس وقت تیس سال سے بھی زائد تھی اور افغانوں کی قصہ گوئی کی عادت سے وہ خوب واقف تھا کہ وہ کوئی بات چھپاتے نہیں بلکہ تمام کے سامنے کہتے پھرتے ہیں لہذا ان حالات میں ایسی باتیں جو سراسر مغلوں کو شیر شاہ کا دشمن بنا دیتیں شیر خاں جیسے چالاک اور تجربہ کار شخص سے ممکن نہیں تھیں تیسرے یہہ کہ شیر خاں جیسا مبصر شخص مغلوں کی فوج اور ان کی ترتیب کے متعلق کبھی ایسی غلط رائے نہیں قائم کر سکتا کہ ان کی فوج میں ترتیب و تنظیم ہی نہیں تھی حالانکہ یہہ وہ زمانہ ہے کہ پانی پت کی پہلی لڑائی اور جنگ کنوہہ میں بابر کی فوج خوب شہرت حاصل کر چکی تھی اور اس لئے تمام مورخین نے بالاتفاق بابر کو اپنے زمانے کا سب سے بہادر سپہ سالار مانا ہے خصوصاً جنگ کنوہہ میں راجپوتوں کے خلاف جو بابر نے اپنی فوج کی تنظیم کی تھی وہ ایسی چیز ہے کہ بھلائے نہیں بھول جاتی۔

جلال خاں کی آتالیقی پر شیر خاں کا تقرر ہونا اور شاہ بنگالہ سے جنگ

غرض اس طرح پر معلوم ہوتا ہے کہ چندیری کے محاصرے میں شیر خاں بابر کی فوج میں تھا لیکن اس وقت اس نے کوئی کارنمایاں نہیں انجام دئے اور اسی زمانہ میں شیر خاں نہ صرف اپنی جاگیرات واپس پایا بلکہ بابر کی مہربانی سے اوسے اور دوسرے پرگنے بھی مل گئے۔ لیکن بعد میں شیر خاں کے متعلق بابر اپنی تزک میں یاس طرح لکھتا ہے کہ جب ہم مشرقی صوبوں میں ٹھہرے ہوے تھے خبر آئی کہ سلطان محمد لودھی دس ہزار افغانوں کے ساتھ فتح خاں شروانی کی معیت میں چنار کے قریب ہمارا راستہ روکے ہوئے ہے اور شیر خاں افغان جس پر سال گذشتہ میں نے مہربان ہو کر کئی پرگنے عطا کئے تھے اور وہاں کے انتظام کے لئے اوسے وہیں چھوڑ گیا تھا ان افغانوں سے مل گیا ہے۔

اسی زمانے میں سلطان محمد لوہانی کے انتقال سے اوس کی سلطنت میں انتشار پھیلا ہوا تھا کیونکہ اوس کا لڑکا جلال خاں بہت کمسن تھا جلال خان کی ماں ملکہ دادو تھی۔ اوس نے اپنی فراست سے جان لیا کہ سلطان کے انتقال اور اس کے لڑکے کی کمسنی کی وجہ سے سلطنت میں جو انتشار پیدا ہوا اور ہوتا جا رہا ہے اوس کا دفعیہ صرف شیر خاں ہی سے ہو سکتا ہے جس نے خود اوس کے شوہر کے زمانہ میں اپنے کارنمایاں خوب دکھا چکا تھا۔ اس لئے اوس نے شیر خاں کو طلب کیا اور معاملات ملکی اوس کے سپرد کئے گو خود بھی ایک عرصے تک معاملات سلطنت میں حصہ لیتی رہی لیکن چند دنوں بعد جب اوس کا انتقال ہو گیا تو اب شیر خاں ہی ملک بہار کا حکمران تھا۔ اسی زمانے میں گور و بنگالہ کا حاکم سلطان محمود تھا اور پرگنہ حاجی پور میں اوس کی جانب سے مخدوم عالم گورنر تھا شیر خاں اور مخدوم عالم کی بہت گہری دوستی تھی۔

لیکن چند وجوہات کی بنا پر شاہ بنگالہ مخدوم عالم سے جب ناراض ہوگیا تو صرف اس ناراضی کی بنا پر چونکہ اوس کی شیر خاں سے بہت دوستی تھی ملک بہار پر حملہ کرکے اوسے فتح کرنا چاہا - اور قطب خاں کو ایک لشکر دیکر روانہ کیا کہ وہ ملک بہار فتح کرے - شیر خاں نے بہت منت و سماجت کی کہ صلح کرلی جائے اور شاہ بنگالہ کے پاس پیغام بھیجا کہ سلطان مرحوم کے تعلقات آپ سے نہایت ہی خوشگوار تھے اب اوس کے انتقال پر جبکہ اوس کا لڑکا بہت کمسن ہے اوس کے ملک پر حملہ کرکے فتح کرنا اور سلطنت کے منتشر حالات سے فائدہ اوٹھانا شایان جوانمردی کے خلاف ہے - لیکن شاہ بنگال نے نہیں مانا اور حملہ کرہی دیا اس پر شیر خاں نے تمام رعایا کو جمع کیا اور کہا کہ ایک طرف شاہ بنگال اور دوسری طرف مغلوں کا خطرہ ہم سب کے لئے بہت زبردست ہے اگر ان دونوں کو آتش و آب مان لیں تو ان دونوں کے درمیان سے بچکر نکلنا صرف ہماری جوان مردی اور استقلال پر موقوف ہے ورنہ ملک بہار پر شاہ بنگالہ کے قابض ہوجانے میں اب کوئی دقیقہ باقی نہیں ہے - شیر خاں کی یہہ تقریر سنکر افغانوں نے قسم کھائی کہ جب تک جان میں جان ہے ملک بہار پر شاہ بنگالہ کا قبضہ کسی طرح نہیں ہوسکتا چنانچہ جب لڑائی ہوئی تو افغانوں کی جوان مردی اور استقلال کی بدولت انھیں فتح اور شاہ بنگال کو شکست ہوئی بنگالیوں کی اس شکست سے بہت سا خزانہ اور مال و دولت شیر خاں کے ہاتھ آیا لیکن اس میں سے اوس نے لوہانیوں کو کچھ بھی نہیں دیا جس پر وہ بہت برہم ہوئے اور دل ہی دل میں شیر خاں کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے - لوہانیوں کو مال غنیمت نہ دینے کا ایک زبردست سبب یہہ ہوسکتا ہے کہ اوس نے اس مال غنیمت کو مغلوں کے حملے کی صورت میں صرف کرنے کے لئے رکھہ چھوڑا تھا - کیونکہ اوسے مغلوں کے حملے کا ہر وقت اندیشہ تھا - اسی دوران میں ادہر شاہ بنگالہ نے یہہ سنکر کہ قطب خاں کی مخدوم عالم نے کچھ بھی مدد نہیں کی جس کی وجہہ انھیں شکست ہوئی تو اس نے مخدوم عالم پر بھی حملہ کردیا - لہذا ایسی صورت میں مخدوم عالم نے شیر خاں سے امداد چاہی لیکن شیر خاں نے یہہ کہکر کہ اوس میں اور لوہانیوں میں بہت زبردست مخالفت ہوگئی ہے اور وہ بذات خود اوس کی مدد نہیں کرسکتا اپنے ایک معتمد جنو خاں کو تھوڑی سی فوج دیکر روانہ کیا - مخدوم عالم نے اپنا تمام مال و اسباب شیر خاں کے پاس بھیجدیا کہ اگر اوسے اس لڑائی میں فتح ہوئی تو وہ خود اس کو واپس لے لیگا ورنہ اس مال و اسباب کا شیر خاں کے پاس رہنا اچھا ہے - شیر خاں کی خوش نصیبی ہے کہ مخدوم عالم کو اس لڑائی میں شکست ہوئی اور وہ مارا گیا اس طرح پر شیر خاں کی مال و دولت میں اور بھی اضافہ ہوگیا -

شیر خاں اور لوہانیوں کی مخالفت -

شیر خاں اور لوہانیوں میں دن بدن مخالفت بڑھتی جارہی تھی یہاں تک کہ انھوں نے شیر خاں کو مارنے کے لئے جلال خاں کی جھوٹی خبر اڑا دی کہ اگر شیر خاں اوس کے دیکھنے کے لئے اوس کے محل میں

آئیگا تو اوس وقت وہ اوس کا کام تمام کر دینگے۔ لیکن شیرخاں بہت جلد اس سے واقف ہوگیا اور جلال خاں کے پاس تمام واقعات لکھ کر بھیجا کہ یا تو وہ شیرخاں پر اعتماد کرے اور لوہانیوں کو ملک سے نکالدے ورنہ وہ اپنی خدمت سے سبکدوش ہونے پر تیار ہے۔ کیونکہ آب و آتش کا ایک جگہ رہنا نہایت ہی ناممکن ہے۔ اس پر جلال خاں نے لوہانیوں کی جماعت کو طلب کیا اور ان سے مشورہ کیا۔ لوہانیوں نے اوسے رائے دی کہ وہ شیرخاں کو اس کی جاگیر سہسرام میں روانہ کر دے اور خود شاہ بنگالہ کے پاس جاکر ملک بہار کو اوس کی نذر کر دے۔ لوہانیوں کو یہہ معلوم تھا کہ جلال خاں کی کمسنی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اوٹھا کر شیرخاں ایک دن ضرور بہار پر قابض ہو جائیگا اس لئے بہار کا شیرخاں کے قبضے میں جانا نہ پسند کر کے وہ اس کو ہی بہتر سمجھے کہ شاہ بنگالہ کے ملک بہار نذر کر دیا جائے اور خود وہ اس پر اس لئے حکومت نہیں کر سکتے تھے کہ اون میں خود حسد و نفاق کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ غرض اس طرح پر جلال خاں کو بھی لوہانیوں کی یہہ رائے بہت پسند آئی چنانچہ اس نے شیرخاں کو بلا کر کہا کہ میں تمہارے خدمات کا بہت مشکور ہوں جو تم نے میرے اور میرے باپ کے زمانے میں ملک کی حفاظت کے لئے انجام دیں اب بہتر یہہ ہے کہ تم مغلوں کے پاس جاؤ اور اپنی جاگیر کی حفاظت کرو اور میں ادھر ملک بنگال پر حملہ کرتا ہوں۔ شیرخاں جلال خاں کی روش اور لوہانیوں کے مشورے سے واقف ہو چکا تھا اس لئے وہ بہت خوش ہوا کہ اگر جلال خاں شاہ بنگال کے پاس چلا گیا تو بہار اوس کے قبضے میں آجائیگا اور شاہ بنگال کا بھی اوسے اب کوئی خوف نہیں تھا۔ اس لئے کہ پہلی لڑائی میں جب لوہانی بھی اوس کے شریک تھے اور اوس کے مخالف تھے تو باوجود مخالفت کے بھی وہ دشمن پر غالب آیا تھا لیکن اب یہہ صورت نہیں تھی بلکہ شیرشاہ کے پاس جتنی بھی فوج تھی وہ بہت بہادر اور متفق تھی اس کے علاوہ افغان فن حرب میں بنگالیوں پر بہت فوقیت رکھتے تھے۔ لہذا اوس نے زر کثیر خرچ کر کے فوج میں نئی بھرتی کرنا شروع کی۔

بنگالیوں کی شکست اور بہار پر شیرخاں کا قبضہ

شاہ بنگال نے قطب خاں کے لڑکے ابراہیم خاں کو ایک لشکر کثیر دیکر جس میں ہاتھی اور آتش باری کا سامان بہت زیادہ تھا ملک بہار کی فتح کے لئے روانہ کیا۔ شیرخاں ابراہیم کی آمد کی خبر سنکر قلعہ بند ہو گیا اور ایک عرصہ تک بنگالیوں کو تنگ کرتا رہا۔ بنگالیوں نے جب فتح کی کوئی صورت نہ دیکھی تو انھوں نے شاہ بنگالہ کو لکھا کہ موجودہ فوج ملک بہار کو نہیں فتح کر سکتی تاوقتیکہ مزید فوج روانہ نہ کی جائے۔ مزید فوج کی امداد کی خبر سنکر شیرخاں نے اپنے تمام افغان سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ اگر بنگالیوں کو امداد حاصل ہو جائیگی تو ان سے مقابلہ کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہوگا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ امداد کے آنے سے قبل ہی ان سے کھلے میدان میں مقابلہ کر کے اونھیں شکست دیں سبھوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تب شیرخاں نے ابراہیم کے پاس کہلا بھیجا کہ کل میدان جنگ میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوگا کیونکہ میں اس تک

صلح کی امید میں تھا لیکن تم نے صلح نہیں کی چنانچہ دوسرے روز میدان جنگ میں دونوں لشکروں کا خوب مقابلہ ہوا جس میں ابراہیم کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا جلال خاں جو لشکر کے ساتھ تھا بنگالہ بھاگ گیا۔ اس فتح سے شیر خاں کو بہت سامال و دولت ہاتھ لگا اور اب وہ پورے بہار پر قابض ہو گیا۔

شیر خاں کا لاڈو ملکہ سے عقد۔

سلطان ابراہیم لودھی کے زمانے سے چنار کے قلعے پر تاج خاں سرنگ خاں مقرر تھا اس قلعے کی لودھی سلطنت میں بہت اہمیت تھی کیونکہ تمام شاہی خزانے یہیں رہتے تھے تاج خاں کی بیوی لاڈو ملکہ تھی اور اس سے تاج خاں کو بہت محبت تھی۔ لاڈو ملکہ سے تاج خاں کو کوئی اولاد نہیں تھی لیکن دوسری بیویوں سے چند لڑکے تھے جنھیں لاڈو ملکہ کے حسد و رشک کی وجہ سے تاج خاں نے نہایت ہی بری حالت میں رکھا تھا۔ اور اون کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس بری حالت سے تنگ آکر تاج خاں کے بڑے لڑکے نے لاڈو ملکہ کے قتل کے ارادے سے ایک دن اوس کے محل میں داخل ہو کر لاڈو ملکہ پر تلوار کا وار کیا لیکن اوس کی بدقسمتی کہ وار خالی گیا۔ جب تاج خاں کو یہہ خبر ہوئی تو اوس نے خود تلوار لیکر بہت ہی غیض و غضب کی حالت میں اپنے بڑے لڑکے کو مارنے کے لئے آیا۔ لڑکے نے پہلے پہل تو مدافعت کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ خود اوس کی جان کی خیر نہیں تو اوس نے باپ کا ہی خاتمہ کر دیا۔ تاج خاں پر چونکہ لاڈو کا بہت اثر تھا اس لئے فوج وغیرہ بالکل اسی کے تحت تھی۔ چنانچہ تاج خاں کے انتقال کے بعد بھی فوج لاڈو ملکہ کے ہی ساتھ رہی لیکن چونکہ وہ عورت تھی اس لئے تاج خاں کے لڑکوں سے پیچھا چھڑانے اور اون کو اون کے حق سے محروم کرنے کی خاطر اپنے دو بھائیوں میر احمد و میر داد کی رائے سے اوس نے شیر خاں سے عقد کرنا چاہا۔ گو لاڈو ملکہ لودھی تھی تاہم شیر خاں ملک و مال کی حرص میں آکر عقد کرنے کے لئے راضی ہو گیا۔ لاڈو ملکہ نے اس کو پچاس عدد بیش بہا جواہر سات من موتی اور ایک سو پچاس من سونا اور بہت سی بیش قیمت اشیا اوس کی نذر کیں جس کا تخمینہ تقریباً نو لاکھ (۹ لاکھ) روپیہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چنار کا قلعہ مع اوس کے نواحی پرگنوں کے شیر خاں کے قبضے میں آگیا اور شیر خاں نے فوج میں بھرتی شروع کر کے فوج کی تعداد بہت بڑھائی۔

سلطان محمود لودھی کی بادشاہت اور مغلوں کا اوسے شکست دینا۔

اسی اثناء میں جب سلطان محمود لودھی بن سلطان سکندر لودھی نے بابر سے فتح پور سیکری میں شکست کھائی تو وہ وہاں سے چتوڑ میں آیا لیکن اوس کا خسر مسند عالی اعظم خاں ہمایوں نامی اور دیگر طاقتور امرا جو بہار میں جمع تھے انھوں نے اس کو بلا کر پٹنہ میں بادشاہ بنا دیا۔ سلطان محمود کی کثرت فوج کے باعث شیر خاں نے اوس کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے وہ بذات خود سلطان محمود لودھی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ملک بہار افغانوں میں منقسم ہو چکا تھا لیکن سلطان نے شیر خاں کو یقین دلایا کہ جب وہ جونپور فتح کرلیگا تو اپنے باپ کی طرح [حسب طریقہ]

اس نے سلطنت بہار دریا خاں لوہانی کو دی تھی وہ شیر خاں کو بہار کا ملک دیدیگا اور اسی مضمون کا ایک فرمان بھی اوس کی تسلی کے لیئے اس نے دیا۔ اس فرمان کو حاصل کرکے شیر خاں اپنی جاگیر میں آیا تاکہ اور لشکر جمع کرے۔ جب سلطان محمود نے جونپور کی جانب کوچ کیا تو شیر خاں کو بھی شرکت کے لئے احکام بھیجا۔ شیر خاں نے جواب میں عرضداشت لکھی کہ میں لشکر جمع کررہا ہوں جمع کرتے ہی حاضر خدمت ہوجاونگا لیکن اس جواب پر اوس کے چند امرانے اوس سے کہا کہ شیر خاں بڑا مکار اور فریبی ہے اوس کی باتوں پر ہمیں اعتبار نہ کرنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مغلوں سے سازش رکھتا ہو اس لئے اوس کو ضرور ساتھ رکھنا چاہیئے۔ اعظم ہمایون شیروانی کی رائے ہوئی کہ سلطان معہ لشکر کے اوس کی جاگیر کی طرف روانہ ہوں اور وہاں سے ساتھ لے کر جونپور پر حملہ آور ہوں اور اوس کے ہمارے ہاں خود نہ آنیکی سزا اوسے اس طرح ملیگی کہ ہماری مہانداری کے اخراجات کا بار اوس پر پڑیگا۔ سلطان نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا اور سہسرام روانہ ہوا جب شیر خاں کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے رنجیدہ ہو کر کہا کہ میں نے جو تدبیر سوچی تھی وہ کارگر نہیں ہوئی کیونکہ سلطان کی فوج میں سوائے چند سرداروں کے باقی سب بے شعور ہیں اور یہہ کبھی کسی دشمن کے مقابلہ میں بھی فتح یاب نہیں ہوسکتے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کو اس طرح ٹال دوں اور جب یہہ بہار سے دور ہو جائیں تو پھر غدر مچا کر از سر نو بہار پر قابض ہو جاوں لیکن چونکہ اب وہ خود یہاں آگئے ہیں اس لئے سلطان کی فرمانبرداری مجھ پر واجب ہے۔ پادشاہ تو خود سہسرام میں ٹھہر رہا لیکن تھوڑی سی فوج آگے بھیجکر لکھنو اور کڑہ مانک پور پر قبضہ کرلیا۔ ہمایون کو جب یہہ خبر ہوئی تو وہ آگرے سے لکھنو روانہ ہوا۔ اس وقت سلطان محمود بھی جونپور آگیا تھا دونو لشکر لکھنو کے قریب خیمہ زن ہوئے اور زبردست لڑائی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا شیر خاں جانتا تھا کہ سلطان محمود لودھی کے لشکر میں نااتفاقی کے باعث جو خرابی ہے اوس کی وجہہ سے اس کا لشکر شکست کھائیگا چنانچہ اوس نے ہندو ملک کو لکھا کہ مغلوں ہی کی عنایت سے میں سرافراز ہوا ہوں سلطان محمود مجھے زبردستی اپنے ساتھ لایا ہے۔ جنگ کے موقعے پر میں کبھی ایسا کام نہیں کرونگا جس سے اوس کو فتح ہو، شہنشاہ سے میری کیفیت عرض کرو۔ اس پر ہمایوں نے اوس کو لکھا کہ اگر جنگ کے وقت واقعی شیر خاں نہ لڑے اور سلطان محمود کے لشکر کو شکست ہو تو ہم اوس کے مرتبے میں ضرور اضافہ کرینگے۔ چنانچہ شیر خاں کی ہی چشم پوشی کی وجہہ سے سلطان محمود لودھی کے لشکر کو وہ روز بد دیکھنا پڑا جس کا کہ بہت پہلے شیر خاں اندازہ کرچکا تھا۔ وجہہ اس کی یہہ تھی کہ سلطان محمود لودھی صاحب دولت نہیں تھا اور زناصہ عورتوں کے جمگھٹ میں عیش و عشرت کے مزے لوٹتا رہتا تھا اس لئے مغلوں نے نہایت آسانی سے اوسے شکست دیدی لہذا وہ آخر کار تنگ آکر بادشاہی کے فضول خیال سے باز آیا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ۹۴۹ھ میں اڑیسہ کے علاقے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

قلعہ کالنجر پر ہمایون کا محاصرہ اور واپسی۔

سلطان محمود پر غالب آنے کے بعد ہمایون نے جب اپنے خطرات کا اندازہ کیا تو منجملہ اور خطروں کے ایک زبردست خطرہ اوسے شیر خاں کا ہی معلوم ہوا۔ اس لئے پہلے پہل ہمایوں نے اس بات کی کوشش کی کہ شیر شاہ کے خطرے کو دور کیا جائے جو کہ اوس کے اور اوس کے تخت و تاج کے لئے بہت خطرناک تھا۔ کالنجر پر افغانوں کے حملے اور قبضہ کر لینے سے ہمایون نے کالنجر کی جغرافی اہمیت کا لحاظ کرکے سب سے پہلے اوسی پر حملہ کیا تاکہ افغانوں کے اتحاد کا خاتمہ کر دے اور اسی غرض کے تحت اوس نے قلعہ چنار پر بھی حملہ کیا اور اوس کا محاصرہ جاری ہی تھا کہ گجرات میں بہادر شاہ کی بڑھتی ہوئی قوت سے خایف ہوکر مجبوراً ہمایوں کو اوس کا محاصرہ اوٹھا لینا پڑا۔ اور شیر خاں سے مصالحت ہوگئی۔ ہمایوں اتنا نادان نہیں تھا کہ چنار کا محاصرہ شیر خاں کے معاہدے پر بھروسہ کرکے اوٹھالے بلکہ واقعہ یہہ تھا کہ وہ خود وہاں سے نکلکر جانا چاہتا تھا لہذا اوس نے جیسے ہی شیر خاں نے مصالحت کے لئے عرضداشت بھیجی موقع کو غنیمت جان کر بہت جلد صلح کرلی۔ شیر خاں نے بطور ضمانت اپنے لڑکے قطب خاں کو شاہی لشکرگاہ میں روانہ کر دیا۔ شیر خاں نے صلح کی کارروائی اس لئے شروع کی تھی کہ اگر ہمایوں اس سے صلح کرے اور گجرات میں بہادر شاہ کی طرف متوجہ ہو تو اس عرصہ میں وہ اپنی قوت میں اور اضافہ کریگا۔

شیر خاں کا ملک گور پر قبضہ کرنا۔

گجرات اور مالوے کی تسخیر اور پھر اون کا دوبارہ بہادر شاہ کے قبضے میں چلے جانے سے بھی بہادر شاہ کی قوت سے اب ہمایون کو کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا کیونکہ اوس کی پوری قوت برباد ہوچکی تھی اور اب وہ اس قابل نہیں تھا کہ ہمایون کا مقابلہ کرسکے۔ تاہم اب ہمایون کے لئے زبردست خطرہ شیر خاں کا تھا جس نے اس عرصے میں اپنی قوت میں بہت اضافہ کرلیا تھا۔ مالوہ اور گجرات سے نکلنے کے بعد ہمایوں کی فوج کی ہمت بہت پست ہوگئی تھی کیونکہ اس فوج نے جس جان فشانی اور خونریزی کے ساتھ جو علاقہ فتح کیا تھا وہ لاپروائی کی وجہ سے پھر دشمن کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر خود ہمایون پر بھی بہت برا پڑا اور اوس کی ہمت بھی بہت پست ہوگئی اس لئے باوجود شیر خاں کے زبردست خطرے کے سات ماہ تک ہمایون نے شیر خاں کے مقابلے سے چشم پوشی کی اور اپنی غفلت سے اوس کو موقع دیتا رہا کہ وہ اپنی قوت میں مزید اضافہ کرے۔ ۱۵۳۴ء سے ۱۵۳۷ء تک تین سال کے عرصے میں شیر خان نے نہایت ہی آزادی کے ساتھ بہار کی تسخیر مکمل کی اور بنگال کی اندرونی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اور طاقتور ہوگیا۔ نصرت شاہ والی بنگال کے انتقال پر اوس کے بیٹے کو اوسی خاندان کے ایک فرد نے شکست دی اور محمود شاہ کے لقب سے بنگال کا فرماں روا ہوا۔ اس کی تخت نشینی سے بنگال کی سلطنت کا اندرونی اتحاد قایم

اس طرف توجہ کی اور بہار کے سرحدی علاقوں کی تسخیر شروع کردی اور گور جو بنگال کا دار العلاقہ تھا اوس پر حملہ کر کے اوس کا محاصرہ کرلیا۔ جب گور پر شیر خاں کے حملے کی ہمایون کو خبر ملی تو اس وقت شیر خاں کے صحیح اور زبردست خطرے کا ہمایون کو اندازہ ہوا۔ اور اوس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اب ادھر توجہ کریگا۔ جونپور جو افغانوں کے حاصل کردہ علاقے کی سرحد سے قریب تھا اوس پر افغان اب تک اس لئے قابض نہ ہوسکے تھے کہ وہاں ایک زبردست شخصیت اور اپنے زمانے کا بہترین سپہ سالار جنید برلاس مقرر تھا جس نے اپنی بہادری اور ذاتی قابلیت سے افغانوں کو وہاں داخل ہونے کا موقع نہیں تھا لیکن ہمایون بدقسمتی سے اب اوس کا انتقال ہوگیا تھا اس لئے جونپور پر اب ہمایوں کے مخالف سردار قابض تھے اس لئے شیر خاں کو جونپور سے بھی کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اس طرح پر شیر خاں کو ہر طرح سے پورے مواقع اپنی قوت بڑھانے کے لئے مل گئے لہذا اب ہمایوں نے چالیس ہزار فوج لیکر چنار پر جو کہ شیر خاں کا زبردست مامن تھا حملہ آور ہوا۔ اور چھ ماہ کے طویل محاصرے میں اس کو فتح کرلیا اس قلعے کی فتح میں زیادہ تر حصہ بہادر شاہ والی گجرات معتمد علیہ افسر توپ خانہ رومی خاں کا تھا۔ شیر خاں چنار سے شکست کھاکر اگر چاہتا تو دہلی میں داخل ہوسکتا تھا لیکن وہ زمانے کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہوچکا تھا لہذا اوس نے ہمایوں کی گجرات اور مالوے میں فوجی قوت کا اندازہ کرکے دہلی کی طرف باوجود ہمایوں کی غیر موجودگی کے رخ نہیں کیا بلکہ دوسرے کمزور علاقوں پر فتح حاصل کرنی شروع کی۔ اب اوس کی کوشش یہہ تھی کہ کسی طرح وہ اتنی قوت حاصل کرے کہ آخری مقابلے میں ہمایوں کی قوت سے ٹکر لڑسکے۔ ادھر ہمایوں کے خطرات اور زیادہ ہوگئے تھے فوج درہم برہم ہوگئی تھی رومی خاں کا انتقال ہوگیا تھا جس کی وجہ سے سب سے بڑا سہارا جو ہمایون کو توپوں کا تھا وہ جاتا رہا۔ چنار کی فتح کے بعد ہمایوں عیش و عشرت میں پڑگیا اور اوس کی قوت میں کمی ہوتی رہی اس طرف شیر خاں اس فکر میں تھا کہ وہ اپنی دولت جو اوسے گور کی فتح سے حاصل ہوئی ہے کسی طرح بھی اوس کو محفوظ کرے تاکہ اگر اوسے شکست ہوجائے تو ہمایوں اوس پر قابو نہ پاسکے۔ اس لئے اوس نے یہہ تدبیر کی کہ پٹنے کے قریب ہمایوں کی آمد کی خبر سن کر اپنے بیٹے جلال کو ہمایوں کے لشکر کی روک تھام کے لئے روانہ کیا اور اوسے تاکیداً ہدایت کی کہ حتی الوسع کوئی جنگ نہ کرے بلکہ جس طرح بھی ہوسکے ہمایون کو آگے نہ بڑھنے دے۔ جلال خاں نے اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق گڈھی ترائی میں پڑاو ڈالا اور ہمایون کے لشکر کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ یہاں تک کہ شیر خاں نے نہایت ہی چالبازی اور مکاری سے رہتاس کے راجہ کو فریب دیکر اپنا تمام خزانہ معہ اہل وعیال کے قلعہ رہتاس گڑھ میں پہنچا دیا

بعد بیٹے کو لکھا کہ وہ اب وہاں سے بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے واپس ہوجائے اور شیر خاں کے پاس چلا آئے جلال خاں باپ کے حکم کی تعمیل میں بغیر لڑے بھڑے کے خود بھی واپس ہوگیا۔ جلال خاں کے آپ ہی آپ ہٹ جانے پر ہمایوں کو بہت تعجب ہوا اور ۱۵۳۸ء میں بغیر کسی لڑائی کے بڑھ کر گور پر قابض ہوگیا۔

ہمایون کا بنگال میں محصور ہوجانا

یہاں سے اوس نے اپنے بھائی میرزا ہندال پورنیہ اور مرہٹ کی جاگیر دیکر حکم دیا کہ وہ وہاں کا انتظام کرے اور خود گور میں ٹھہر کر بنگالے کا انتظام کرنے لگا۔ گجرات اور مالوے کی فتح کے مانند گور کی فتح بھی محض اتفاقی تھی۔ یہاں کی آب وہوا ہمایوں کو بہت پسند آئی۔ لیکن یہاں کے انتظامات کرنے کے بعد آئندہ اوسے کیا کرنا چاہیئے تھا اس سے اوس نے غفلت برتی۔ لہذا اوس وقت شیر شاہ نے ہمایون کو بنگالے کے انتظام میں مصروف دیکھ کر بہار میں آپہنچا بنارس وچنار گڑھ فتح کرکے جونپور کا محاصرہ کرلیا اور وہاں کی فوجوں کو شکست دیکر قابض ہوگیا اس کے سوا شیر خاں نے دانشمندی یہہ کی کہ اپنی فوج سنبھل وقنوج تک پھیلادی تاکہ ہمایون کے پاس آگرے سے کوئی خبر نہ پہنچ سکے لیکن ہمایون کی کثرت فوج کے باعث بنگال کی آب وہوا میں خرابی پیدا ہوئی اور لشکر میں بیماری پھیل گئی جس سے ہزاروں آدمی اونٹ اور گھوڑے ضائع ہوے۔ بہار میں شیر خاں کے داخل ہوتے مرزا ہندال جو وہاں مقیم تھا واپس ہوکر آگرہ چلاگیا۔ ہمایون کے ہندال کی واپسی کی خبر سنکر لکھا کہ وہاں یعنے آگرے سے وہ فوج بھیجے تاکہ اوسے بنگال سے نکلنے میں آسانی ہو کیونکہ شیر خاں نے ہمایون کو بنگال میں اپنی تمام فوج اطراف میں پھیلاکر اس طرح پھانس لیا تھا جیسے کہ ایک ماہی گیر جال میں چھوٹے چھوٹے مچھلیوں کو پھانس لیتا ہے۔ ہمایون ادھر اس پریشانی میں تھا کہ کس طرح وہ بنگال سے نکلے لیکن ادھر آگرہ میں مختلف بغاوتیں برپا ہورہی تھیں۔ چنانچہ اس اثناء میں ان وحشت ناک خبروں کے ساتھ ہی اوسے ایک اور خبر یہہ ملی کہ میرزا ہندال نے آکر آگرہ پر قبضہ کرلیا ہے اور اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا ہے۔

جنگ چونسہ اور ہمایون کی شکست۔

اس خبر کو سنکر ہمایون مجبوراً بنگالے کو جہانگیر بیگ کے سپرد کرکے خود آگرہ کی راہ لی۔ اب اگر ہمایون کی حالت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ بہار میں شیر خاں اور آگرے میں ہندال قابض تھا اور عسکری کی فوجیں اسے مدد دینے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ لہذا ہمایون کے پاس جو کچھ نقد روپیہ تھا اوسے عسکری کی فوجوں کو دیا تاکہ وہ اوسے بنگال سے نکلنے میں مدد دیں۔ اس طرح پر جب یہہ خراب وخستہ لشکر بکسر کے قریب پہنچا تو یکایک شیر خاں جونپور کا محاصرہ چھوڑ کر بلائے ناگہاں کی طرح ہمایون کے مقابل میں آموجود ہوا۔ اور تین ماہ تک راستہ روکے پڑا رہا۔ اس مدت میں ہمایون نے کئی نصیحت آمیز خطوط میرزا ہندال اور کامران کو لکھے

کسی طرح شیر خاں کا دفعیہ کیا جائے لیکن ان بھائیوں نے جو کسی طرح سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے کم نہ تھے ہمایون کی کسی قسم کی اعانت نہ کی بلکہ الٹے ہمایون کی تباہی اور شکست کے منتظر تھے کہ ہمایون کے بعد وہ اپنی متحدہ قوتوں سے شیر خاں کو نکال کر خود قابض ہو جائینگے ۔ ہمایون کی مراجعت کے لیئے یہہ وقت نہایت ہی ناموزوں تھا کیونکہ بنگال میں یہہ موسم سخت بارش کا تھا جس کی وجہ سے تمام راستے رکے ہوئے تھے ۔ پہلے ہی سے فوجیں پست ہمت تھیں ۔ اب تو بعض بارش کے مشکلات سے اور بھی پست ہمت ہو گئیں ۔ اس طرح سے ہمایوں کو جب مدد کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو اوس نے صلح کرنا چاہی ۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ جن شرائط پر صلح ہوئی وہ یہہ ہے کہ ملک بنگالہ، بہار اور چنار گڑھ شیر خاں کے قبضہ میں رہیں مگر سکہ و خطبہ ہمایوں کا جاری رہے ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شیر خاں نے ہمایون کو دھوکہ میں رکھا اور ۱۵۳۹ء میں جب ہمایون صلح ہو جانیکے بعد شیر خاں کے قول فعل پر اعتماد کر کے اپنے لشکر کے ساتھ غفلت کی نیند بسر کر رہا تھا کہ شیر خاں اپنے منتخب جوانوں کے ساتھ نشیب کی طرف سے اس پر حملہ آور ہوا اور دم بھر میں سارے لشکر کو درہم برہم کر دیا ۔ کثیر تعداد فوج دریا میں ڈوب کر مر گئی کیونکہ فوج دریا عبور نہیں کر سکتی تھی اس لئے کہ دو ماہ سے ہمایون جو پل بنوا رہا تھا وہ ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا تھا ہمایون نے بھی مجبوراً گھوڑا دریا میں ڈالدیا ۔ گھوڑا بیچ دھارے میں ڈوب گیا ۔ ہمایوں غوطے کھانے لگا قریب تھا کہ وہ بھی ڈوب جائے لیکن ایک بہشتی نے بچالیا ۔ غرض اس طرح کالپی سے ہوتا آگرے پہنچا ۔ یہاں ہمایوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ہندال اوس کے خلاف ایک جماعت تیار کر چکا تھا تا کہ اوس کی مخالفت کرے ۔ اسی لڑائی میں ہمایوں کی بیوی شیر خاں کے پاس گرفتار ہو گئی تھی لیکن شیر خاں نے اوسے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ ہمایون کے پاس روانہ کر دیا ۔ یہہ لڑائی مقام چونسہ پر واقع ہوئی اس لئے جنگ چونسہ کہلاتی ہے ۔

ہمایون کی آخری شکست اور شیر خاں کی بادشاہی

ہمایون جب آگرے پہنچا تو بے مہر و بے وفا بھائی اپنے کرتوتوں پر پشیمان ہو کر حاضر ہوئے اور شیر خاں کے معاملے میں مشورہ کرنے لگے ۔ مگر چونکہ دلوں میں نفاق کی آگ سلگی ہوئی تھی اس لئے کوئی بات طے نہیں ہوئی ۔ کامران حیلے بہانے کر کے لاہور چلا گیا ۔ ہندال اور عسکری ہمایون سے ملگئے ۔ زمان میرزا بھی آگیا ۔ اور ہمایون دوبارہ فوج کی درستی میں مشغول ہوا ۔ شیر خاں بنگالہ اور بہار کا انتظام کر کے قنوج کے سامنے گنگا کے اس پار ٹھہرا اور اپنے بیٹے قطب خاں کو گنگا کے اس پار کالپی و اٹاوہ کی طرف روانہ کیا مگر اس نے ہمایون کے شاہی لشکر سے شکست کھائی یہہ نمایاں فتح حاصل کرنیکے بعد ہمایون شیر شاہ کے مقابلہ کے لئے گنگا کے کنارے پہنچا اس موقعہ پر ہمایون کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار فوج تھی لیکن یہہ وہ فوج نہیں تھی جو کہ مالوہ یا گجرات میں داخل ہوئی تھی ۔ ہمایون ایک عرصہ تک وہیں ٹھہرا رہا جب دونوں لشکر ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے خوف سے دریا کے پار نہ اترے تو شیر خاں نے

ہمایون کے پاس پیام بھیجا کہ یا تو مجھے اس پار آنیکی اجازت دیجئے یا آپ ہی خود ادھر تشریف لائیے تاکہ مقابلہ ہو اور خدا جس پر مہربان ہو اوس کو فتح دے۔ لہذا ہمایون نے اس اندیشے سے کہ اگر اس طرح دریا کے کنارے فوج مقیم رہیگی تو بدوی کی وجہ سے کہیں چلپے نہ جائے خود ہی پیش قدمی کرنا مناسب سمجھا اس موقع پر شیر خاں نے اپنا لشکر عبور کرنیکے مقام سے ہٹا لیا۔ پار اُترنے کے بعد بھی دونو لشکر تقریباً ایک ماہ تک ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے ناگہاں ایک دن ایسا پانی برسا کہ بادشاہی لشکر کے خیمے تمام پانی سے بھر گئے۔ چنانچہ ہمایون عاشورے کے روز جب اپنا لشکر دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا کہ یکایک شیر خاں کی فوج آ پڑی اور ہمایون کے لشکر میں ہلچل پڑ گئی مصنف تاریخ رشیدی کا بیان ہے کہ اس موقع پر شیر خاں کی فوج آگے بڑھتی تھی اور ہمایون کی فوج پیچھے ہٹتی تھی۔ ہمایون نے میدان ہاتھ سے جاتے دیکھا تو بذات خود دشمنوں کی صفوں میں تابڑ توڑ تین حملے کئے لیکن ہر مرتبہ ناکام رہا آخر موت کو سر پر دیکھا تو بھاگا۔ ہمایون کا آفتابچی کا جوہر جس نے ہمایون نامہ لکھا ہے لکھتا ہے کہ آخر میں بادشاہ سلامت میدان جنگ میں بالکل تنہا رہ گئے تھے دریا عبور کرکے ننگے سر ننگے پاؤں وہاں سے بھاگے اور بادشاہ سلامت کے ساتھ گو توپ خانے اور بندوق سب ہی موجود تھے لیکن نہ توپ گرجی اور نہ بندوق آواز دی بلکہ اگر آواز تھی تو عام طور پر فوج میں یہی تھی کہ اب گھر چلنے کا وقت ہے گھر چلیں۔ غرض اس طرح پر ہمایون شکست کھا کر میدان جنگ سے بچکر نکل گیا لیکن آگرہ یا دہلی میں اُس کا ٹھہرنا دشوار تھا کیونکہ فاتح افغان برابر اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔ مغل حکام اور سردار ہر طرف سے سمٹ کر پنجاب میں آنے لگے اور لاہور میں ان پناہ گزینوں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ رہنے کے لئے مکان تک میسر نہ آتا تھا (تاریخ رشیدی) مگر باہمی نفاق اور بے سروسامانی و پست ہمتی کی وجہ سے یہاں بھی دشمنی کی مزاحمت یا مقابلے کی تیاری نہ ہوسکی دوسرے یہ کہ شیر خاں نے شکست خوردہ مغلوں کا تعاقب ابھی نہیں چھوڑا تھا وہ خوب سمجھ گیا تھا کہ شکست خوردہ مغلوں سے ملک کو صاف کرنیکا بہترین موقع یہی ہے۔ لہذا آگرے میں وہ تھوڑے دن ٹھہر کر پھر لاہور کو بڑھا۔ اور اُس کی آمد کا غلغلہ سن کر فوجیں کابل و کشمیر کی طرف پراگندہ ہوگئیں۔ خود میرزا کامران جسے ہمایون کی مہربانی سے پنجاب عطا ہوا تھا اب کمال یزدی سے اپنے دعاوی سے دستبردار ہوگیا اور بھائی کو نہایت ہی بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ کر کابل چلا آیا۔ دوسرے بھائیوں نے بھی اُس کی سرد مہری کی لیکن ہمایون نے باوجود بھائیوں کی سرد مہری کے بھی امید کو ہاتھ سے جانے نہ دیا بلکہ اُس کا ارادہ کہ چند جان نثار رفیقوں کے ہمراہ وہ سندھ جائے اور وہاں کے حاکم شاہ حسن ارغون سے مدد لیکر گجرات پر حملہ آور ہو لیکن ہمایون کی بدقسمتی اور شیر خان کی خوش قسمتی کہنا چاہیئے کہ ہمایون کو اُس کے مقاصد میں بہت بری طرح ناکامی ہوئی۔ غرض اس طرح پر شیر خاں اپنے زبردست دشمن سے نجات پاکر اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور شاہ ... تخت سلطنت پر متمکن ہو ...

سوزِ فرقت

ترجمہ When we two parted از بائرن

مترجمہ جناب سید محمد علی صاحب شہرت بلگرامی صدر مدرس مدرسۂ فوقانیہ ناندیڑ

(۱)

یاد ہے روزِ جدائی کی گھڑی
خامشی تھی اور آنسو تھے رواں

دل شکستہ تھا مگر یہ آس تھی
چند برسوں میں ملیں گے بے گماں

زرد چہرا آپ کا تھا سرد بھی
ہم سے کچھ رُک رُک کے ملتے تھے گلے

سرد مہری دیکھ دل کھٹکا جبھی
یہہ تو ہیں ساماں کچھ آفات کے

(۲)

مجھ کو سرتاپا پسینہ آگیا
وقت رخصت دیکھ کر یہ بے رُخی

جس کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہا
صبحِ عشرت پر شبِ غم چھاگئی

اپنے وعدوں کو بھلایا آپ نے
خوب لوگوں میں ہوئے بدنام آہ

ہر طرف چرچے یہی ہیں ہو رہے
آپ کے باعث ہوئے ہم بھی تباہ

(۳)

آپ کی باتیں بیاں کرتے ہیں سب
سن کے چلتی ہے مرے دل پر چھری

تن لرزتا ہے خیال آتا ہے جب
ہائے اس صورت پہ یہ سیرت تیری

لوگ کیا جانیں کہ تھے ہم آشنا
روز و شب تھیں صحبتیں اپنی کبھی

مدتوں تڑپائے گا صدمہ تیرا
تاب کہنے کی نہ اب جس کے رہی

(۴)

چھپکے خلوت میں کبھی ملتے تھے ہم
آج تنہائی میں یہہ فریاد ہے

آپ اور یوں بھول جائیں ہے ستم
محو کیوں دل سے ہماری یاد ہے

خیر قسمت نے جو درشن آپ کے
بعد برسوں کے دئے گر بے گماں

آئیں گے اس شان سے ہم سامنے
لب پہ ہوگی خامشی آنسو رواں

تنقیدیں

سفید جوگن

ازجناب بابو نارائن پرشاد صاحب مہر یونیا تقطیع ضخامت (۱۴۲) صفحے قیمت عہ
ملنے کا پتا۔ بابو بدری پرشاد ورما و برادران ۲/۲۶ بازار دانا اولی لشکر، گوالیار۔

یہ جناب مہر صاحب کا ایک قدیم ناول ہے جو اگرچہ ایک عرصہ پہلے لکھا گیا تھا مگر پہلی بار ۱۹۲۲ء میں چھپا اور اب شایع کیا گیا ہے۔ یہ ناول بہت دلچسپ ہے اور آخر تک اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس میں ہندو عورت کی شوہر پرستی بہت پاکیزہ اور موثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کی معاشرتوں کے خاکے پہلو بہ پہلو کھینچے ہیں۔ زبان بھی بہت شستہ اور ٹکسالی ہے۔

روحِ جذبات

ازجناب اکبر حیدری۔ درمیانی تقطیع ضخامت (۹۶) صفحے قیمت عہ ملنے کا پتا
دفتر رسالہ "نیرنگ" دہلی۔

جناب اکبر حیدری آج کل کے اچھے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے کچھ متفرق کلام اور چند نظموں کا یہ خوبصورت مجموعہ ہے جس کو رسالہ "نیرنگ" کے مدیر عشرت رحمانی صاحب نے شایع کیا ہے۔ اس مجموعے کی بہت سی نظمیں اردو رسالوں میں طبع ہو چکی ہیں اور انھیں پسندِ عام بھی حاصل ہے۔ ابتداء میں شاعر اور اس کی شاعری پر کوئی مقدمہ وغیرہ تو نہیں البتہ بعض احباب کی رائیں اور تقریظیں ہیں ایک ادیب نے مختصراً یہ دلچسپ رائے دی ہے۔ "مقدمہ شعر و شاعری مولانا حالی مرحوم کا وہ خواب تھا جو چالیس سال تک تشنۂ تعبیر رہا، روحِ جذبات (حضرت اکبر حیدری کا مجموعہ کلام) اس خواب کی تعبیر ہے مکمل اور غیر فانی۔"

جام شہادت

ازجناب حبیب اللہ صاحب وفا منشی فاضل، رائل تقطیع، ضخامت (۸) صفحے قیمت ۲ر
ملنے کا پتا مدرسہ فوقانیہ بیدر۔

وفا صاحب کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے۔ گو اس مختصر مجموعۂ سلام سے ان کی شاعری کی نسبت

کرتا ہے کہ وہ شاعری میں قدما کا تتبع کرتے ہیں ۔ یوں تو مظلومیت سید الشہدا پر ہندوستان اور ایران کے تقریباً تمام شعرا نے اشک ریزی کی ہے ۔ لیکن وفا صاحب کا انداز بیان ان سب سے بالکل الگ ہے ۔ اگرچہ وفا صاحب بوجہ افتاد طبیعت اپنے کلام کو عام طور پر اخبار و رسائل میں شایع کرانے سے محترز رہے لیکن ان کا نمونہ کلام جام شہادت کی صورت میں شائع ہو کر ہی رہا ۔

حیات جاوید

از جناب سید محمد شفاعت حسین صاحب منتظم (عدالت عالیہ) حیدرآباد، بونیہ تقطیع قیمت نامعلوم، ملنے کا پتہ محکمہ عدالت عالیہ سرکار عالی ۔

اس سے کون واقف نہیں کہ ۶۱ھ خانوادہ رسالت پناہی کے لئے بڑا ہی کٹھن سال تھا ۔ اشقیا نے اس بزرگ خانوادے پر جو مظالم توڑے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملسکتی ہے ۔ مولف نے کربلا کے واقعہ پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوے فلسفہ شہادت کے اہم مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ دوران بیان ہر دلیل کو قرآن و احادیث کے ذریعہ مستحکم کیا ہے ۔ نیز اپنے دعوی کی دلیل کو قوی تر بنانے کے لئے بر موقع حضرت اقدس و اعلی اور شہزادگان والا تبار کے کلام سے بھی مدد لی ہے ۔ عرض حال میں مولف نے ظاہر کیا ہے کہ " بعض احباب کے اصرار پر اس عظیم اور انقلاب انگیز واقعہ کو بالاختصار سپرد قلم کرنے کی سعی کی ہے "۔ جو حضرات فلسفہ شہادت کے اہم مسائل کو مختصر الفاظ میں سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے ۔

کتب موصولہ

۱ ۔ دیوان یقین	مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب		انجمن ترقی اردو
۲ ۔ سہ نظم ہاشمی	از مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی		"
۳ ۔ ارتقا	از جناب مشتاق احمد صاحب وجدی		
۴ ۔ مخزن ادب	از مولوی حافظ عبد الشہید صاحب ام ۔		ایجوکیشنل بک ہاؤز علیگڈہ

مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدر آباد دکن

علمی و ادبی کتابیں

۱- **اردو شہ پارے حصہ اول** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام، اے پی ایچ، ڈی۔ تاریخ اردوئے قدیم اور ابتدائے اردو سے لے کر ولی اورنگ آبادی تک نظم و نثر کا بہترین انتخاب مع نو تصاویر شعرائے قدیم ضخامت (۲۰۰) صفحے قیمت مجلد ۱۲ؔ/-

۲- **روح تنقید**۔ از ڈاکٹر صاحب موصوف اردو میں فن تنقید کی پہلی کتاب ضخامت (۳۰۵) صفحے قیمت عہ/۱۲

۳- **تنقیدی مقالات**۔ از ڈاکٹر صاحب موصوف۔ روح تنقید کا دوسرا پیش کردہ حصہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں چیدہ شعراکے کلام پر تنقید و تبصرہ ضخامت (۵۰۰) صفحے مجلد قیمت ہے/-

۴- **اردو کے اسالیب بیاں**۔ از ڈاکٹر موصوف ابتدائے اردو نثر سے لے کر موجودہ زمانے کے نثر نگاروں کے انداز تحریر و بیان کی ارتقائی تاریخ ضخامت (۲۰۴) صفحے مجلد عہ

۵- **محمود غزنوی کی بزم ادب**۔ از ڈاکٹر صاحب موصوف غزنوی دور کی علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت ۱۲ا/

۶- **ارباب نثر اردو**۔ از سید محمد ام اے۔ اردو نویسی کی تاریخ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین اردو کا تذکرہ ضخامت (۲۲۰) صفحے مجلد قیمت عہ/

۷- **دکن میں اردو**۔ از نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ، قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفجاہی دور کے شعرا کا تذکرہ اور دکن کے علمی تصانیف، رسائل، اخبارات کے مفصل حالات ضخامت (۳۸۰) صفحے قیمت عہ/-

۸- **آثار الکرام**۔ از حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر ایس اے ایران وسط اور جنوبی ہند کے اسلامی سلاطین کے علمی، ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے قیمت عہ/۱۲

۹- **گلشن گفتار**۔ مرتبہ سید محمد ام اے۔ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ یا جامع مقدمہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے کے دکن و ہندوستان کے مشہور شاعروں کے حالات نوشتہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی ضخامت (۸۵) صفحے قیمت ۱۲ا/

۱۰- **مقدمات عبدالحق حصہ اول**۔ مرتبہ مرزا محمود بیگ اسپیشل افسر۔ مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے علمی ادبی اردو مقدموں اور دیباچوں کا مکمل مجموعہ جو مختلف موضوعوں پر ... ضخامت ... قیمت عہ/

۱۱- مقدمات عبدالحق حصہ دوم

(زیر طبع)

۱۲- دنیائے افسانہ - از عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی - اردو افسانوں کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان پر تنقید اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ضخامت (۲۱۸) صفحے قیمت عہ

۱۳- کردار و افسانہ - از سروری - افسانہ نگاری میں کردار اہم جز ہے اردو کے چند مشہور افسانوی کردار عمر و عیار (داستان امیر حمزہ) نجم النساء (مثنوی میر حسن) (توبۃ النصوح) عون محمد (مراۃ العروس) تنقیدی مقالات

ضخامت (۲۳۲) صفحے قیمت عہ

۱۴- قدیم افسانے - از سروری - دنیا کے شہکار افسانوں میں سے قدیم ترین (۲۵) افسانوں کا مجموعہ ضخامت

(۱۷۴) صفحے قیمت عہ

۱۵- چینی اور جاپانی افسانے - بہ نگرانی سروری چین اور جاپان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت

(۷۲) صفحے قیمت ۹ر

۱۶- انگریزی افسانے - بہ نگرانی سروری - انگلستان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۱۸۰) صفحہ قیمت عہ

۱۷- مبادی فلسفہ - از میر حسن الدین بی اے ال ال بی ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن پی ایچ ڈی کی پرائمر آف دی فلاسفی کا

[illegible] صفحہ ۱۳۰

۱۸- مبادی نفسیات - از شیخ عبدالحمید شوق بی اے (آنرز) یہ اردو زبان میں نفسیات سے متعلق اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے

ضخامت (۱۹۰) صفحے قیمت عہ

۱۹- شاہ رفیع الدین قندھاری - از محمد عبدالغفور عابدی دکن کے ایک صاحب دل صوفی اور عالم کی دلچسپ سوانح عمری

ضخامت (۸۴) صفحے قیمت ۵ر

۲۰- نیلگری - از حمید اللہ ایم اے ال ال بی جنوبی ہند کے صحت افزا مقام کی تاریخی و جغرافی معلومات ضخامت (۸۴) قیمت ۵ر

۲۱- محمود گاواں - از ظہیر الدین - سلطنت بہمنیہ کے وزیر و مدبر خواجہ جہاں محمود گاواں کی معتبر سوانح عمری

ضخامت (۵۵) صفحے قیمت ۸ر

۲۲- عقائد الامام - از محمد عبدالغفور عابدی - حضرت امام اعظمؒ کی مقبول عام کتاب فقہ اکبر کا عام فہم اور سلیس

اردو ترجمہ ۳ر

۲۳- قاموس الاغلاط - از مولانا سید مختار احمد ذہین - پانچ ہزار الفاظ کی تحقیق اور اول اغلاط کی تصحیح تنقیح جو ادب کے اہل تحقیق کے لئے مفید کتاب ضخامت (۱۹۴) صفحے قیمت

۲۴- تنظیم الاخلاق - از سید عبدالعزیز عزیز - لڑکے اور لڑکیوں کے لئے اخلاقی نظموں کا مجموعہ ضخامت (۹۸) صفحے

قیمت ۱۲ر

۲۵- خزینہ اخلاق - از سید عبدالعزیز عزیز - اخلاقی اور ادبی نظم و نثر کا مجموعہ جو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بہت مفید ہے - ضخامت (۶۴) صفحے قیمت ۶ر

۲۶- سیرت خیر البشر - از ذہین۔ آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ نظم میں قیمت ۱ر

۲۷- چھوٹا شیطان - از ذہین۔ علم کی فضیلت اور جہل کی مذمت نظم میں قیمت ۱ر

درسی و تعلیمی کتابیں

ان میں سے اکثر کتابیں قلمروئے آصفیہ حضور نظام کے مدارس میں داخل نصاب ہیں

۱- خیابان اردو - از عارف مدیر صبح دکن، ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور شعراء گرامی کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب ضخامت (۴۳۲) صفحے قیمت مجلد عه

۲- حدائق الاخلاق - از مولانا ذہین کے نظم و نثر کا مجموعہ جو ہائی اسکولوں کے لئے نہایت مفید ہے ضخامت (۱۵۸) صفحے قیمت عه

۳- قاعدہ فارسی - از ابو المحاسن متین۔ ڈائرکٹ میتھڈ پر فارسی کا جدید قاعدہ قیمت ۶ر

۴- دروس فارسی حصہ اول از ابو المحاسن متین۔ ڈائرکٹ میتھڈ فارسی کی پہلی کتاب قیمت ۸ر

۵- مخزن القواعد - از میرزا علی رضا شیرازی لکچرار سٹی کالج۔ ہائی سکول کے لئے فارسی کی بہترین گرامر قیمت ۱۲ر

۶- قواعد مضمون نویسی حصہ اول - از مظفر الدین۔ اردو مضمون نگاری کی تعلیم و تربیت کی بہترین کتاب قیمت ۵ر

۷- قواعد مضمون نویسی حصہ دوم - از مظفر الدین۔ قیمت ۶ر

۸- طریقہ املا نویسی - از مظفر الدین۔ اردو املا سکھلانے کا مفید رسالہ قیمت ۱ر

۹- حمایت الحساب (۵ حصے) - از غلام رسول۔ ابتدائی جماعت سے لے کر چوتھی جماعت کے لئے حساب کی کارآمد و مفید کتاب ہر ایک کی قیمت بالترتیب ۴ر، ۶ر، ۶ر، ۲ر، ۱۲ر، ۱۴ر

۱۰- جبر و مقابلہ وسطانیہ - از سید انوار حسین بی اے۔ مڈل اسکول کے لئے کارآمد جبر و مقابلہ قیمت ۱۰ر

۱۱- مکمل ہندسہ عملی - از محمد منیر الدین بی اے۔ میٹرکیولیشن کے لئے نہایت کارآمد و مفید ہندسہ عملی قیمت عه

۱۲- تاریخ ہند حصہ اول - ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ جو ایک تجربہ کار ٹرینڈ گریجوایٹ نے لکھی ہے قیمت ۷ر

۱۳- جغرافیہ ریاست حیدرآباد - از غلام قادر بی اے، غلام رسول اساتذہ سٹی کالج قلمروئے آصفیہ حضور نظام کا بہترین جغرافیہ ضخامت (۱۶۷) صفحے قیمت ۱۲ر

۱۴- معلومات دیہی حصہ اول - از غلام رسول۔ قلمروئے آصفیہ کی زراعت کی ابتدائی معلومات اور دیہاتی انتظام کے متعلق مفید کتاب قیمت ۲ر۶

۱۵- معلومات دیہی حصہ دوم - از غلام رسول۔ زراعت اور انتظام سے متعلق مزید معلومات قیمت ۷ر

۱۶- بچوں کا قاعدہ - از مولانا مختار احمد ذہین۔ بچوں کے لئے اردو کا مفید قاعدہ قیمت ۳ر

۱۷- اردو کے حروف تہجی کا تختہ - مدارس کے لئے اردو کے ابجد پڑھانے کا رنگین با تصویر چارٹ ۴ر

۱۸- بالک پہاڑہ - بچوں کے لئے جمع تفریق ضرب اور تقسیم اور کسری پہاڑے ۱۲ر

آپ کے دیوان خانہ

کی

آرائش اور زینت نامکمل رہے گی

اگر اس میں

شاہ ذیجاہ حضرت سلطان العلوم

کی

شبیہ مبارک آویزاں نہ ہو

چنانچہ مولوی عظیم الدین صاحب صدیقی نے اپنے زمانہ تربیت بلاک سازی ہی میں ایک بڑے سائز کی سہ رنگی تصویر تیار کرکے بارگاہ خسروی میں گزرانی تھی اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر یہ تصویر تیار کی گئی ہے اتنے بڑے سائز پر اب تک کوئی تصویر تیار نہیں ہوی۔

قیمت معہ فریم۔ للعہ، صہ، لے، بلا فریم عہ

منیجر مجلہ مکتبہ سے طلب کیجیے

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم از کم چار جز ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ/) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہ) فی پرچہ ۶/

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کیلئے (صہ/) نصف کے لئے (سے/) اور چوتھائی کے لئے (عہ ۱۲/) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں (۱۲ ½) فی صدی سے (۲۵) فی صدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منتظم مجلۂ مکتبہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن) سے کیجیے۔

باہتمام محمد نظام الدین مددگار منیجر مکتبۂ ابراہیمیہ
مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

دار الاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن
کا
علمی و ادبی ماہوار مجلہ
مکتبہ
مدیر
عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی
شرکاء
سید محمد ایم اے
عمر یافعی
(MURTAZA.)

مجلّہ مکتبہ

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے "مجلّہ مکتبہ" بلاقیمت حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلّہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اسی طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵۶) | رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلشیہ (.........)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۷) | بابتہ ماہ مہر و آبان سنہ ۱۳۴۰ ف م اگست، ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء | شمارہ (۶۵۵)

تصویر :- میر مہدی مجروح مرحوم

فہرست

سرمایہ داروں کے لئے زرین موقع

ملک میں علم و ادب کی خدمت اور اہل ملک کے علمی و مالی فائدہ کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانے پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود کی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی کے تحت رجسٹری کرائی گئی ہے۔ انجمن کا کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہے (۱) شعبہ تجارت (۲) شعبہ اشاعت (۳) شعبہ طباعت۔ اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے یہ پانچواں سال ہے چار سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ دس فی صدی نفع علاوہ زکواۃ کے تقسیم کر رہی ہے۔ انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپیہ کے ایک ہزار حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ کی قیمت ایک سو روپیہ ہے۔ اور ہر حصے کی ادائی بیس اقساط میں۔ اجرا شدہ سرمایہ (۵۰۰) حصص پچاس ہزار۔ قیمت فروخت شدہ حصص چالیس ہزار۔ شرکت کے فارم اور قواعد و ضوابط کے لئے تمام درخواستیں حسب ذیل پتہ پر آنی چاہئیں۔

معتمد انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود محی الدین بلڈنگ

حیدرآباد دکن

شیر شاہ سوری

از

جناب شبیر علی مرحوم سابق متعلم کلیہ عثمانیہ

(۴)

شیر شاہ کے خصائل

شیر شاہی اوراق کا بیان ختم کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ پر مختلف نقطہ نگاہ سے نظر ڈال کر اس کی شخصی اہمیت کا اندازہ کریں چنانچہ ذیل میں سب سے پہلے ہم اس کے خصائل بیان کرتے ہیں:۔

شیر شاہ ایسا سخت اور خونخوار نہیں تھا جیسا کہ ہم اس کی طوفان خیز زندگی کے واقعات سے خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کے حق میں ایک خیر خواہ باپ اور سرکشوں کے لیے سخت تھا لیکن ساتھ ساتھ کمزور مفلس اور لاچار لوگوں کے لئے وہ نہایت مہربان اور ہمدرد بھی تھا مصنف واقعات مشتاقی رقمطراز ہے کہ اس نے لنگر فقراء کے روزانہ اخراجات کے لئے پانچ سو اشرفیاں مقرر کی تھیں اور شب و روز محتاجوں کی خبر گیری میں مستغرق رہا کرتا تھا اس نے ہر جگہ گاؤں اور شہر میں اندھے اور لاچار لوگوں کے لئے گذارے مقرر کئے تھے۔ اس نے یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جس مقام پر وہ قیام گزیں ہو وہاں سے کوئی شخص بھوکا نہ جانے پائے۔ یہ عام حکم تھا کہ شاہی باورچی خانہ میں جو کوئی بھی آئے اُسے کھانا کھلایا جائے اس طرح پر کئی ہزار لوگ ہر روز وہاں کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس کی لشکر گاہ میں بھی بھوکے اور غریب لوگوں کو کھانا تقسیم کرنے کے مقامات مقرر تھے ایسے جلیل القدر حکمران کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کی خبر گیری صرف مسلمان مفلسین کی حد تک تھی جو ان دنوں نسبتاً بہت کم تعداد میں تھے بہت ہی ناانصافی کا باعث ہوگا۔ ہم اس کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے امدادی باورچی خانے اور سراؤں میں ہر دو مذہب کے لوگوں کے لئے علحدہ علحدہ انتظامات تھے کیونکہ وہ اس سے واقف تھا کہ ہندو لوگ عموماً بھوکا مرنے کو مسلمان کے ہاتھ کے کھانے پر ترجیح دیتے ہیں۔

شیر شاہ کے مانند تاریخ میں بہت کم ہستیاں ایسی ہیں جن کے نام ان کے خصائل کے مظہر ہیں

بنگال کا شیر دل بادشاہ حقیقی شیر کا کامل نمونہ ہے ماسن کے قول کے مطابق وہ شیر اور لومڑی کے خصائل سے مرکب تھا
مساوی القوی دشمن کے ساتھ وہ بہ نسبت شیر کے لومڑی کا طرز عمل اختیار کرتا۔ اسی طرح وہ ہمایوں اور مالدیو پر فتحیاب ہوا
لیکن ماتحتین اور امرا کے حق میں وہ انصاف کا ایک خوف ناک شیر تھا جو کہ حقیقت میں اس کے خصائل کی ایک نمایاں
صفت ہے اس نے اپنے بڑے لڑکے کا نام عادل خان رکھا اور خود اپنے لئے سلطان عادل کا لقب پسند کیا۔
اس کے پانچ سال چھ مہینے کے مختصر دور میں اس اصول کے خلاف ہمیں ایک معمولی مثال تک نہیں ملسکتی بیکس اور
دادخواہوں کے متعلق وہ ہمیشہ صداقت پر زور دیا کرتا تھا اور کبھی ظالم پر مہربان نہیں ہوا۔ خواہ وہ اس کے قریبی رشتہ دار، عزیز
بیٹے، جلیل القدر امرا یا خود اس کے قبیلے کے افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ ظالموں کے سزا دینے میں اس نے کبھی کسی قسم
کی کوتاہی نہیں ظاہر کی۔ خلاصۃ التواریخ میں یہ قصہ منقول ہے کہ شاہزادہ عادل خان آگرے کی کسی ایک دیہاتی عورت
پر جبکہ وہ حمام میں نہا رہی تھی پان کا بیڑا پھینک کر اظہار عشق کیا تو وہ عورت بہت ناراض ہوئی اور اس کے شوہر نے شیر شاہ
کے پاس اس کی شکایت کی۔ شہزادہ اسی وقت طلب کیا گیا۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ قانون مکافات پر عمل کیا جائے
یعنے یہ کہ وہ دیہاتی بھی شہزادے کی بیوی پر حمام میں بحالت برہنگی پان کا بیڑہ پھینکے۔ سب لوگ اس فیصلہ کو سن کر ششدر
رہ گئے اور اس کی منسوخی کی ممکنہ کوشش کی لیکن وہ اپنے فیصلے پر جما رہا کہ شہزادے اور دیہاتی میں اس کے نزدیک
کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے۔ اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ شخص بادشاہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنی رعایا کو نقصان پہنچا سکتا ہے
جن کی حفاظت اس کے ذمہ ہے۔ ممکن ہے کہ حکایت مذکورہ بالا بالکلیہ صحیح نہ مانی جائے تاہم اس عظیم الشان
بادشاہ کے متعلق جو روایات عام طور پر مشہور ہیں ان پر ضرور روشنی پڑتی ہے اس طرح پر منجملہ اس کے استحکام سلطنت
کے اسباب کے ایک اس کی غیر معمولی مستعدی ہے جو اس نے ظالموں کی سزادہی میں ظاہر کی۔
شیر شاہ اپنی باریک بینی، خاص توجہ اور ان تھک کوششوں کے لحاظ سے پیٹر اعظم اور فریڈرک ثانی سے
کم نہیں۔ اس کے دربار میں کوئی ایسا قابل وزیر نہ تھا جو اس کے اصول حکمرانی کو سمجھتا ہو یا امور سلطنت میں اس کا
ہاتھ بٹاتا ہو۔ ہر محکمے کے تفصیلی کام میں اس کی خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ اس کے زبانی احکام اس کے افسیر
نوٹ کر لیا کرتے تھے اور اس طرح پر ایک دستور العمل تیار ہو گیا جس پر وہ بجز بادشاہ کے مزید احکام کے عمل پیرا ہوتے
وہ خود اس مشین کا ایک مرکزی یا چلتا ہوا پرزہ تھا جس کو اس نے مملکت کے انتظام کے لئے قائم کیا تھا۔ مورخ
عباس خان اور واقعات مشتاقی کے بیانات سے جن میں بہت کچھ توافق ہے اس کی روزمرہ زندگی کے دستور العمل
کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے ہر کام کے لئے رات اور دن کے کچھ حصے مقرر کئے تھے۔ دو ثلث رات گزرنے پر

اس کے نوکر اسے ہوشیار کرتے وہ حمام کرتا اور نماز پڑھتا بعد ازاں مختلف عہدہ دار اور معتمدین محکمہ جات اس کے پاس حاضر ہوتے تھے اور اپنے اپنے محکمے کے متعلق تمام روزمرہ کے واقعات پیش کرتے۔ چار گھنٹے تک وہ سرکاری محکموں کے متعلق جملہ خبریں تفصیل کے ساتھ سنا کرتا جو کچھ احکام وہ جاری کرتا فوراً ضبط تحریر میں لائے جاتے اور بغیر کسی فرق کے ان پر کما حقہ عمل کیا جاتا۔ اس طرح وہ ہمیشہ صبح تک مصروف رہتا۔ بعد ازاں اپنی فوج کا وہ ذاتی طور پر معائنہ کرتا۔ پرانی فوج کا جائزہ لیتا اور نو داخل شدہ سپاہیوں سے خود ہمکلام ہوتا۔ اپنے سامنے گھوڑوں کو داغ دلواتا اور خود تفصیلی حاضری لیتا۔ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے ہر شخص کو علٰحدہ علٰحدہ ہر ماہ کے اختتام پر اپنے سامنے تنخواہ تقسیم کرتا۔ اشراق کی نماز پڑھکر وہ ناشتہ کرتا۔ پھر دربار میں برآمد ہوتا اور بارہ بجے تک دربار کرتا تھا۔ اس وقفے میں حسابات کی تنقیح کی جاتی خزانوں کے حسابات کا وہ خود معائنہ کرتا تھا۔ جو ملک کے ہر حصے سے آیا کرتے تھے۔ پھر امراء زمیندار اور غیر ممالک کے ایلچیوں کو باریابی اور ہمکلامی کا موقع عطا کرتا تھا۔ عالموں سے واقعات سنتا اور انہیں مناسب جواب دیتا اور احکام جاری کرتا جن کو منشی لکھا کرتے۔ بارہ بجے کے وقت وہ پھر نماز پڑھتا اور پھر آرام کرتا۔ شام کے وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوجاتا۔ بحالت سفر اور قیام کسی صورت میں بھی اس دستور العمل کے خلاف عمل نہیں ہوتا تھا۔

شیر شاہ اپنی جد و جہد اور اپنی سرگرمی کے اعتبار سے جولیس سیزر اور نپولین اعظم کے مانند تھا نہ کہ فلپ ثانی جیسا جس کی تمام کوشش اپنی پیشرو کی محنت کے رائگاں کرنے میں صرف ہوئی۔ شیر شاہ کی مہموں کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ ایک نظر میں فوجی اہمیت کے مقامات کو جان لیتا تھا۔ اپنی افواج کو نہایت سرعت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کردیتا اور اس کے جنگ کا نقشہ بالکل نرالا ہوا کرتا تھا۔ غیر ضروری قتل و خون۔ بیرحمی اور ٹرائی کا وہ مخالف تھا۔ بایں ہمہ وہ ایک ایسا دل بھی رکھتا تھا جو کہ اکثر سپاہیوں اور مدبروں کے پاس شاذ ہی ہوتا ہے اس کو اپنے دشمن کی مصیبت کا بھی بہت احساس تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ جب مغل شاہزادی معہ اپنی سہیلیوں کے کیمپ سے باہر آکر اس کے سامنے محکومانہ حالت میں کھڑی ہوئی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اسکی سپاہیانہ بہادری اور مہربانی دشمنوں کے ساتھ الگزنڈر اعظم کے جیسی تھی۔ وہ بہت نرم دل اور مہرباں فاتحین میں سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہ نسبت ذاتی اغراض کے جذبات سے بہت کم متاثر ہوتا تھا اس کے نزدیک کسی دیسے ملک کو فتح کرنا بالکل بیکار تھا اگر وہ ویران ہوجائے۔ کیوں کہ ویرانی کے باعث وہ اس سے محصول وصول نہیں کرسکتا تھا۔ عباس کہتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کو غلام بنایا اور نہ کاشتکاروں کو یا ان کی کاشت کو برباد کیا اس کے عدل

وانصاف کی بنا پر لوگ جیسے کے ویسے رہتے اور اس کے لشکر کو امداد پہنچاتے۔ ایک ہمعصر مورخ نے لکھا ہے کہ اس کی فوج کی گذرگاہ سے نہ کبھی آتش زدگی کا کوئی شعلہ بلند ہوا اور نہ کسی ممالک مفتوحہ کے مظلومین کی فریاد یا چیخ پکار سنی گئی۔ کوئی عورت بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ اس کے شہوت پرست سپاہیوں کے پاس کبھی نہیں دکھائی دی وہ ایک سخت گیر طبیعت کا شخص تھا جو کہ گرو باد پر حکمرانی اور طوفان کی رہبری کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا اس کے خوف نے بھیڑیئے کو مجبور کیا کہ وہ اپنی غفلت سے باز آکر بکری کے بچے کی نگہبانی کرے۔ جیسا کہ عباس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شیر شاہ کا ایک قانون یہ تھا کہ اس کا منظور نظر علم لوگوں کی کاشت کی تباہی کا باعث نہ ہو اور جب وہ کوچ کرتا تو ذاتی طور پر خود زراعت کی حالت کا اندازہ کرتا۔ کھیتوں کے اطراف سواروں کو معین کرتا تاکہ لوگوں کو کھیت خراب کرنے اور سو کھنے سے باز رکھیں۔ اس کی نگاہ ہر طرف رہتی تھی اگر وہ کسی شخص کو کھیت کرتے ہوئے دیکھتا تو وہ خود اپنے ہاتھ سے اس کے کان کاٹ لیتا اور غلے کی پوٹلی اس کی گردن میں لٹکا کر پورے لشکر میں اس کو پھراتا۔ تاریخ داؤدی کا مصنف ایک قصہ یوں لکھتا ہے کہ ایک شتر سوار کو چند کچی پھلیاں توڑنے پر مالوے کے کوچ کے دوران میں جو وحشیانہ سزا دی گئی وہ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ شیر شاہ نے اس کی ناک میں سوراخ کیا اور اس کے پاؤں باندھ کر تمام شہر میں اس کو الٹا لٹکا کر لے گیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی کھیتوں پر دراز دستی کی جرأت نہیں کی۔ اور سڑک کی تنگی کی وجہ سے مجبوراً کوئی کھیت تباہ ہو جاتا تو وہ اپنے امرا کو ایک پیمایش کنندہ کے ساتھ تباہ شدہ پیداوار کا اندازہ کرنے کے لئے روانہ کرتا اور کاشتکاروں کو نقد رقم اس کا معاوضہ ادا کر دیتا۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے سپاہیوں کا کوئی خیمہ کسی کھیت سے قریب نصب ہوتا تو خود سپاہی کھیت کی نگہداشت کرتے تاکہ کوئی اس کو نقصان نہ پہنچا سکے نقصان رسانی کی صورت میں شیر شاہ انہیں ملامت کرتا اور سزائیں دیتا۔ اس کی اس قدر سختی کے باوجود بھی کوئی سپہ سالار اس کے سپاہیوں میں ہر دل عزیز نہیں تھا۔ خود اس کی ذاتی قدر و منزلت بہت بڑھی ہوئی تھی جو اس کے سپاہیوں کو بھاری سے بھاری کام بھی خوشی کے ساتھ کرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ سخت کوچ کے بعد بھی اس کے سپاہیوں کو آرام لینے کی اس وقت تک اجازت نہ تھی جب تک وہ اپنے لشکر کو مورچہ بند نہ کریں۔ ان تمام سختیوں کو بے کم و کاست اس کے سپاہی ایک مشرقی ظالم حکمران کے غلاموں کے مانند نہیں بلکہ ایک عزیز سپہ سالار کے دوستوں کی طرح برداشت کرتے تھے۔ ذیل کی حکایت سے شیر شاہ کے لشکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ مالوے میں جب ملا خان نے افغانوں کو زمین کھودتے ہوئے دیکھ کر یہ طعنہ دیا کہ تم لوگ بہت سخت محنت و مشقت کرنے کے عادی ہو گئے ہو۔ رات دن تمہیں آرام نہیں ہے۔ عیش و اطمینان جیسی چیزیں تمہارے لئے عنقا ہیں تو سپاہیوں نے جواب دیا کہ

ہمارے آقا کا طریق یہی ہے۔ عیش و اطمینان عورتوں کے لئے ہے۔ عزت دار سپاہیوں اور بہادروں کے لئے یہ بہت شرمناک بات ہے۔ اس جواب سے شیرشاہ کے اس قول کی بالکل تائید ہوتی ہے کہ محنت و مشقت بڑے لوگوں کو ہمیشہ چالاک بناتی ہے۔ شیرشاہ گو بادشاہ تھا لیکن شاہانہ عیش و عشرت سے نفرت تھی اس نے اپنے معمولی سپاہیوں کے مثل کدالی پکڑنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ چونسہ کے مقام پر جب ہمایوں کا ایلچی افغانی لشکر کے قریب پہنچا تو اس نے شیرشاہ کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سخت گرمی میں کدالی ہاتھ میں لیکر خندق کھودتے ہوئے دیکھا۔ اور شیرشاہ نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ پیغام سننے کے لئے زمین پر ہی بیٹھ گیا۔

شیرشاہ بحیثیت مدبر

شیرشاہ کی تخت نشینی سے رواداری اسلام کا وہ دور شروع ہوا جو کہ اورنگ زیب کے عہد کے انقلاب تک جاری رہا۔ وہ اس عہد سے جس میں کہ وہ پیدا ہوا بہت کم متاثر ہوا۔ شیرشاہ مخالفت، تعصب اور بت شکنی کے خراب ماحول میں پیدا ہوا اور پرورش پایا تھا جس کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں بہت ہی ترقی ہوئی تھی۔ اگرچہ مسلمان اس ملک میں مسلسل تین صدی سے رہتے آئے تھے تاہم ان کے زاویہ نگاہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے پائی تھی تنگ نظر متعصب لوگوں کے خیال کے مطابق اسلام اور روادارانہ حکومت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ شیرشاہ مذہب اور سیاست کو متحد کرنے اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کے لئے جس میں کہ ہندوستان کی تمام قومیں نامیابی اصول پر ترقی کریں پیدا ہوا تھا۔ مسٹر ڈبلیو کروکسن کے اس دعوی سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیرشاہ وہ بہادر شخص تھا جس نے ایک ایسی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی جو رعایا کی مرضی پر مبنی ہو۔ شیرشاہ کی نسبت اس کی رائے نہایت ہی قابل غور ہے وہ لکھتا ہے کہ اس غیر معمولی شخصیت کی نسبت جس نے ہمایوں کو اس کے تخت سے محروم کیا مشکل کہا جا سکتا ہے کہ معمولی تواریخ اس کے متعلق انصاف سے کام لیتے ہیں۔ وہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے متعلق غور کیا اس کے ذہن رسا نے اس بات کا پتہ چلا لیا کہ حکومت عام پسند ہونی چاہیئے۔ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر حکمرانی کرے۔ ہندو لوگ عدل و انصاف اور رواداری کے طریق عمل سے متحد کر لئے جائیں۔ زمین کے لگان کا تعین بالکل مساویانہ طریق پر مبنی ہو۔ ملکی ترقی کے تدابیر کو تقویت دیجائے۔ چنانچہ اکبر نے آئندہ انہی اصولوں پر عمل کیا۔ اس نے مسلمانوں کے سخت مجموعہ قوانین میں کچھ تخفیف کی اور عدل و انصاف کے لئے نو اور نافذ کئے اس نے اپنے اس پانچ سال کے مختصر دور میں اصلاحات اس قدر وسیع پیمانے پر کیں جن سے اس کی عالمانہ قابلیت کا نہایت شاندار ثبوت ملتا ہے۔ کہیں لکھتا ہے کہ اس

پٹھان کے مانند کسی حکومت حتی کہ برطانیہ سے بھی ایسی فراست اور دانشمندی کا اظہار نہیں ہوا۔

شیر شاہ نے اپنے زمانے کے اس زبردست سیاسی اصول کو کہ مملکت میں بغیر مذہبی یگانگت کے سیاسی اتحاد ناممکن ہے نظر انداز کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے مذہبی عادات کے طریق عمل کی پیروی کر کے اپنی ہندو رعایا کی اشک شوئی کی۔ اس کے متعصب مداح یا مخالف عیب جو بھی کسی مندریات کی تباہی کو اس کی طرف منسوب نہ کر سکے۔ یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ شیر شاہ کی پالیسی رواداری کی تھی۔ اشاعت اسلام کے جزو کو حکومت سے علیحدہ کرنے پر اس زمانے کے خیالات کا لحاظ کرتے ہوئے اگر یہ ایک غیر جانب دارانہ طرز عمل ہے تو پھر شیر شاہ کی پالیسی بھی ایک غیر جانبدارانہ مذہبی پالیسی قرار دیجا سکتی ہے۔ اگر جزیہ سیاسی اسباب کی بنا پر منسوخ نہیں کیا گیا تو کم سے کم وہ ان معنوں میں بھی یا اس سرگرمی سے عاید نہیں کیا گیا جس طرح قاضی مغیث الدین نے سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں کیا تھا۔ شیر شاہ کا طرز عمل ہندومت کے ساتھ حقارت آمیز نہیں تھا بلکہ وہ اس کو ایک خاص وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا اس کی مملکت میں ہندومت کو مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے متعلق ہندوؤں کے لئے بھی سراؤں میں اس کے انتظامات سے بہتر کوئی اور عمدہ ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا۔

شیر شاہ کا مقصد اپنی مملکت میں مذہب کے قطع نظر ایک عالمگیر دنیوی سرگرمی پیدا کرنا تھا۔ مذہب کا اس کے نزدیک زندگی عامہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا خیال تھا کہ مذہب ایک انفرادی خانگی معاملہ ہے اس نے اس اصول کو اپنے ہم مذہب اور اپنے ہمعصروں کے حالات میں بلند حوصلگی پیدا کرنے کے لئے ان کے سامنے پیش کیا۔ مذہب سے اسے جس قدر خاص لگاؤ تھا اس کے مقابل میں کوئی مسلمان اس سے نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر زندگی اس کا ساتھ دے تو وہ ایسے انتظامات کریگا کہ ایک غریب اور لاچار عورت بھی مکہ معظمہ جا کر حج کر سکے۔ مصنف زبدۃ التواریخ عہد جہانگیر میں لکھتا ہے کہ آج کے دن تک بھی مکے میں اس کی تعمیر کردہ ایک کارروان سرائے موجود ہے جہاں افغان فقرا قیام کرتے ہیں۔ اس پر بھی اس کی اس راسخ الاعتقادی سے حکومت کے معاملات پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ وہ ان اماموں اور علما کے لئے بہت سخت تھا جنہوں نے اس کی مملکت میں دغابازی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ وہ اسلام کے ان مقدس قوانین میں بھی دست اندازی کرنے کے لئے تیار تھا جن کو کہ وہ نامناسب اور اپنی ہندو رعایا کے لئے سخت خیال کرتا تھا۔ انگلستان کے ہنری دوم کے مانند وہ اپنی مملکت میں قانون کی حکومت رائج کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چند خاص قوانین بنائے تھے جن پر وہ خود سختی سے عمل کرتا اور دوسروں کو بھی اتنے خوفناک تشدد سے اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرتا۔

عباس اور مصنف واقعات مشتاقی کی تحریروں میں اکثر ان قوانین کے حوالے ملتے ہیں۔ عباس لکھتا ہے کہ "اس نے اپنی سلطنت میں خود اپنے اطمینان کے لئے کہ اس کے قوانین پر عمل ہو رہا ہے کتنے نصب کئے تھے۔ ہمیں اس مصنف کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ افغان لوگ جو قانون کی خلاف ورزی میں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے کے عادی تھے انہیں بھی اس کے سخت انتظام کا احساس تھا۔ اور انہیں جسمانی سزائیں حتیٰ کہ سزائے موت بھی دیجاتی تھی اور عہدوں سے بھی برطرف کئے جاتے تھے وہ اسباب پر مجبور کئے گئے کہ لڑائی اور جھگڑے سے باز آئیں جس کے وہ عادی ہو گئے تھے۔

ارسکن لکھتا ہے کہ اکبر سے پہلے کے بادشاہوں میں شیر شاہ کے مانند رعایا کی سرپرستی اور قانون سازی کا جذبہ بہت کم تھا۔ شیر شاہ کے قوانین خود اس کے ذاتی خیالات اور بلند پایہ مصنفین کے کتابوں کے اقتباسات پر مبنی تھے۔ عباس نے انہی قوانین میں پولیس، فوجی قواعد حکام کا تقرر اور ان کے فرایض کو بھی داخل کر دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی حکومت میں صرف انتظامی قوانین کا نفاذ کیا تھا کہ جس کے نمونے پر بے شک و شبہ اکبر کے قوانین کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چند خاص موجودہ قوانین بھی عدل و انصاف میں عقل سلیم کو کام میں لانے اور قاضیوں و مفتیوں کی بیجا مداخلت اور لوگوں کو ان کی گرفت سے بچانے کی خاطر نافذ کئے تھے۔ شیر شاہ نے اپنی سلطنت کو ترقی دینے کی خاطر سلطنت کی ہر ایک قوت سے فائدہ اٹھایا۔ ہندوستانیوں کا ایک معمولی فرقہ بھی حکومت سے علیحدہ یا اس کے خلاف سرکش اور غیر قناعت پسند نہیں تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی سرپرستی کرنے میں کبھی کسی قسم کا کوئی نسلی امتیاز یا حکمرانان سابق کے عزیز و اقارب کے ساتھ ادنیٰ قسم کی مخالفت کو بھی جاری نہیں رکھا۔ ترک اور خلجی اس کی ملازمت میں آزادانہ طور پر داخل ہوتے تھے۔ وہ خود اپنے ہم قبیلہ لوگوں کی تنگ خیالی سے متنفر تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں عادات کے خیالات کو پھیلانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی رعایا کو حکومت امرا کے خیال سے باز رکھنے میں ہمیشہ ہوشیاری سے کام لیا۔ یہ اس کا نہایت ہی زرین اصول تھا کہ ہر فرقہ اپنی گذشتہ سیاست کو بھول جائے اور ہندوستانی قومیت کی ترقی کے لئے ایک ایسا راستہ تیار کرے جو عوام کی دلچسپی اور احساسات پر مبنی ہو۔

شیر شاہ بحیثیت بانی قوم

شیر شاہ کا مقابلہ اکبر کے ساتھ اس بناء پر نہایت ہی عمدگی سے کیا جاسکتا ہے کہ شیر شاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے دو مخالف مذاہب کے لوگوں کو متحد کر کے ہندوستانی قومیت کی سب سے پہلے بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ ایسے شخص کے لئے

جس کا مطالعہ نہایت سطحی ہو یہ دعویٰ بہت مبالغہ آمیز معلوم ہوگا کیونکہ اس کے زمانے میں نہ جزیہ منسوخ ہوا اور نہ
گاؤکشی کی ممانعت میں فرمان جاری ہوئے اور نہ دونوں قوموں کے درمیان دماغی احساسات کی بالیدگی اور تمدنی
اتحاد کے لئے سنسکرت علم ادب کی سرپرستی کی گئی۔ نہ آپس میں شادی بیاہ کے رسم کو تقویت دیگئی جو زیادہ تر اکبر کے
نام کے ساتھ منسوب ہیں لیکن ایک اولوالعزم مدبر ایک ہی رات میں علاء الدین کے عجیب وغریب چراغ کے موکلین
کے مانند ہوائی محل نہیں بنا سکتا۔ اس نے ملک میں نہایت ہی عمدہ باضبط سخت اور عدل وانصاف کی حکومت
کی بنا ڈالی اس نے ہندوؤں کے سیاسی نمو اور معاش خوش حالی کے لئے راستہ تیار کیا۔ دونوں فرقوں کو ظاہری
اخلاص اور میل ملاپ قایم رکھنے اور اتفاق کے ساتھ کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ جیسے ماسن لکھتا ہے "اس نے
یہ سمجھ لیا کہ آپس کی مخالفت کی شدت اس طور پر کم کی جاسکتی ہے کہ دونوں فرقوں میں بظاہر اتحاد کی شکل پیدا کر دے
اور صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ایک مدبر اپنے زمانے کی اصلاح کرسکتا ہے۔ اور قدیم نسل اور ان
اصولوں کو تباہ کرنے سے ہی اس عالمگیر کشمکش کا دفعیہ ہوسکتا ہے۔ ہندوستانی قومیت کے نمو کے ابتدائی منازل
اس کے ذریعے طے ہوئے۔ اس نے راستہ تیار کر دیا تھا! اور بیج بو دیا تھا۔ یہ اس کا قصور نہیں کہ وہ زیادہ دن
تک زندہ نہیں رہ سکا یا یہ کہ سحر یا جادو کے ذریعے سے بوئے ہوئے درخت کو بار آور ہوتے ہوئے نہ دیکھا اس نے
نہایت عقلمندی کے ساتھ اس مکمل اتحاد کو پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جو ناممکن تھا بلکہ صرف اس پر قناعت کیا کہ بظاہر
اتحاد کی شکلیں پیدا کر دے جو ممکن تھا۔ اگر وہ اس سے زیادہ بڑھتا تو ضرور اسے ناکامی ہوتی اور خصوصاً ایک ایسے
زمانے میں جس میں کہ ابھی سلطان سکندر لودھی کے زمانے کے اثرات مسلط تھے۔ جزیہ کی موقوفی اور گاؤکشی کی ممانعت
بہت ہی نامناسب ہوتی اور بہت ممکن تھا کہ اس سے خود اس کی سلطنت کو نقصان پہنچے پس کے باوجود بھی ہندوؤں
اور مسلمانوں کے تعلقات اکبر کی تخت نشینی کے زمانے کی بہ نسبت اس کے انتقال کے وقت کچھ کم خوشگوار نہیں
تھے۔ اگر اکبر کی ذہنیت گمراہ کن نہیں ہوتی تو سترھویں صدی میں ہندوستانی قومیت ممکن ہے کہ مکمل ہوجاتی اگر اکبر
جزیہ کی منسوخی، گاؤکشی کی ممانعت، ہندوانی رنگ کے آئین سلطنت اور سنسکرت علم ادب کی سرپرستی پر ہی اکتفا کرتا
اور ہندو فلسفہ اور مذہب کی طرف راغب نہیں ہوتا تو ضرور تاریخ میں وہ ایک زبردست مدبر اور دنیا کے بڑے
بانیان قوم میں شمار کرنے کے قابل تھا۔ لیکن اس کے ایک نئے مذہب کے بانی یا پیغمبر اور اپنی رعایا کا دنیوی
کے مانند مذہبی حکمران بنجانے کے خیال نے اس کے تمام عمدہ تدابیر پر پانی پھیر دیا۔ اگر کوئی متحدہ قوم وجود میں نہیں لایا
سوائے چند مسلمان بدمعاشوں اور غلامانہ طبیعت کے چند محب وطن ہندو گروہوں کے جو اپنے بادشاہ کو

خوش کرنے کے لئے التدان پر لکھا کرتے اور خواہ وہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ ہی کیوں نہ ہو اس وقت تک پانی نہ پیتے جب تک کہ وہ شاہ دہلی کا درشن نہ کریں۔ اکبر نے اسلام کے ساتھ نہایت ہی ناانصافی کی اور غیر ضروری طور پر اس کو ذلیل کیا جس کی بنا پر تاریخ کبھی اسے فراموش نہیں کر سکتی کیونکہ یہ مملکت کے مقاصد کے تحت نہیں بلکہ ذاتی شوق کے حصول میں کیا گیا تھا خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی پر کیوں نہ مبنی ہو۔ تخت شاہی زیادہ عرصہ تک اتحاد کا نمونہ اور دونوں فرقوں کے لئے توجہ کا مرکز نہیں رہا۔ اگر اس کی توجہ ایک طرف ہندوں کے جانب رہی تو دوسری طرف مسلمان ذلیل ہوئے۔ مذہب اسلام سے علانیہ انحراف اکبر کی ذہنیت کی خرابی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اگر اس کی خواہش یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد دیرپا ہو جائے تو ہندوستان کے تمام حکمرانوں میں اکبر کو اپنی خانگی زندگی میں کم سے کم پکا مسلمان ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے کام کا سب سے مشکل حصہ اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے احساسات کے ساتھ رواداری برتنے کی طرف راغب کرنا تھا اور یہ کام مطلق العنان حکمران سے ممکن نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ایسے شخص سے جو اپنے تقوی اور اعلیٰ مذہبی زندگی کے اعتبار سے مسلمانوں میں ایک خاص عظمت اور وقعت رکھتا ہو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے مسلمان اکبر کی ہندوانیت لئے ہوئے قانون سازی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اور اس کے ہر فعل کو اسلام کے خلاف سمجھنے لگے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو گاؤ خوری اور ہندوؤں کی ہر ایک چیز سے نفرت کرنے کا مترادف قرار دیا اس طرح یہاں ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر اکبر اپنی غیر دانشمندی سے کام نہ لیتا تو وہ تاریخ ہند میں اپنے زمانے کا اکےناٹن گردانا جاتا۔ (اکےناٹن ایک مصری بادشاہ تھا جو تاریخ ہند میں پہلا سیاسی نظریہ ساز خیال کیا جاتا ہے) اگر دارا اکبر کا جانشین ہوتا تو بابر کے خاندان کو دوسری مرتبہ پھر جلاوطنی نصیب ہوتی۔ زمانہ موجودہ میں ہندوستانی قومیت کا تخیل برطانیہ کی فتح ہند سے شروع ہوتا ہے مشترکہ تہذیب کے اتحاد۔ اغراض اور احساسات میں یگانگت کا خیال سب سے اول ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ مشترکہ طور پر ایک اجنبی قوم کے جس کا مقصد مغربیت کی ترویج تھی محکوم ہو گئے۔ چنانچہ اس کے خلاف شمالی ہند میں غدر (بغاوت سپاہ) بھی اسی قسم کی ایک قومی سرگرمی تھی جس میں ناکامی ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی ترقی ازمنہ متوسط اور قدیم کے اتحاد پر منحصر نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے پر موقوف ہے۔

شہنشاہ کی تاریخ میں اہمیت

باوجود مواد کی کمی کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی سلطنت جس بنا پر قایم رہی اس کا زیادہ تر انحصار شہنشاہ کی ذات سے

وابستہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے شیر شاہ کا درجہ اکبر کے لئے بالکل وہی ہے جیسے چندر گپت کا اشوک کے لئے جولیس سیزر کا آگسٹس کے لئے۔ ہنری دوم شاہ انگلستان کا اڈورڈ اول کے لئے۔ ہنری چہارم شاہ فرانس کا لوئی چہارم کے لئے لیکن اکبر بہ نسبت آگسٹس ایڈورڈ اول اور لوئی چہار دہم کے بہت ہوشیار حکمران تھا۔ اس کی جد و جہد کی وسعت اور باقاعدہ مہمات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تاریخ میں اکبر شیر شاہ سے زیادہ رتبے کا مستحق ہے لیکن تعمیری تدبر (کن سٹرکٹیو اڈمنسٹریشن) عاملانہ قابلیت حکومت کے معاملات میں تفصیلی توجہ، ان تھک محنت و مشقت، اکملیت، بے چوک ہوشیاری، انصاف کا خیال، ذاتی فضائل کی عمدگی اور بہ حیثیت ماہر جنگ کے بے شک اکبر کی بہ نسبت شیر شاہ کا درجہ پہلا ہے۔ اکبر کی ذہنیت بہت اعتدال پسند اور ممتاز تھی صرف قومی اتحاد کے متعلق اکبر کی بلند خیالی ہی باوجود اس کے عملی پہلو کے خراب ہونے کے اس کا رتبہ دوسرے ہندوستانی حکمرانوں سے بہت بڑھا دیتی ہے۔ اس کی ذہنیت سکندر اعظم سے جو مشرق اور مغرب کو ایک کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا بہت ملتی جلتی ہے اس کی سرپرستی کی وجہ سے ہم زمانہ وسطیٰ کے ہندوستانی فن کاریگری کے نمونے اور تاریخی علم ادب کا معتد بہ ذخیرہ پیش کر سکتے ہیں۔ اکبر ہندوستان کے ہندوؤں کی سچی سرگرمی اور جوش کا مرکز اور حقیقی معنوں میں اشوک اور ہرش وردھن کا آبائی جانشین تھا اس کے معیار حکومت سے اس کی حقیقی عظمت ظاہر ہو جاتی ہے۔

ہندوستان جدید کے لئے زمانہ وسطیٰ کے تمام حکمرانوں میں شیر شاہ ایک نمونہ ہے کیونکہ یہ صرف شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کا زمانہ ہے جس کا مطالعہ بجز کسی خجالت کے ہندو اور مسلمان دونو کر سکتے ہیں۔ یہ وہ عہد ہے کہ جس کے زیر سایہ اگر مذہب اسلام کا بول بالا رہا تو اس کے ساتھ ہی ہندو مت سے بھی غفلت نہیں برتی گئی۔

شیر شاہ کی اقتصادی اصلاحات خصوصاً اصلاح سکہ، نیز محکمہ عدالت اور ڈاک کی تنظیم کے متعلق ہمیں جو معلومات حاصل ہوئے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیر شاہ کا ہمایوں پر غلبہ ہندی مسلمانوں کی محض ایک ہنگامی کامیابی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس کا عہد شمالی ہندوستان میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب اور اس شہرۂ آفاق سلطنت کا افتتاح کرتا ہے جو آئندہ مغل بادشاہوں سے انتساب اور مزید رونق و ترقی حاصل کرنے والی تھی، لیکن عہد اکبری کی شان و شوکت یا دربار جہانگیری کے جاہ و احتشام کے دلکش قصوں کو پڑھتے وقت ہمیں یہ نکتہ نہ بھولنا چاہیئے کہ بابر و ہمایوں باں ہمہ اوصاف و قابلیت تیرہ چودہ برس کے عرصے میں سلطنت کے اندر وہ استقلال اور نظم و نسق نہ پیدا کر سکے جو سہسرام کے ایک افغان سپاہی زادے نے پانچ سال کے اندر پیدا کر دیا تھا اور نیز یہ کہ نوجوان اکبر کی آئندہ شہرت و کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دور لامرکزیت کے لودھیوں کے بعد

نہیں آیا بلکہ عہد تجدید شہنشاہی کے شیر شاہی سلاطین کا وارث ہوئے۔

غرض اس لحاظ سے کہ ایک ادنیٰ رتبہ سے ترقی کرتے ہوئے تخت شاہی تک پہنچا شیر شاہ اس بادشاہی سلسلے کی آخری کڑی ہے جس کا سر حلقہ سلطان قطب الدین ایبک تھا کیونکہ اس کے بعد کسی غیر شاہی خاندان کے آدمی کو ہندوستان کی فرماں روائی کرنی نصیب نہیں ہوئی۔ اور یہی ایک واقعہ شیر شاہ کی غیر معمولی قابلیت کے ثبوت میں کافی ہے لیکن جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ شیر شاہ کو محض بہار و بنگال کے افغان بادشاہوں سے ہی لڑنا نہیں پڑا بلکہ اس نے مغلوں کی وسیع سلطنت کا مقابلہ کیا اور ان کی جمی جمائی قوت کو بزور بازو اکھاڑ دیا تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں اس کی عظمت سوا ہو جاتی ہے۔ اور مغلوں کے طرفدار مورخ اس کی کیسی بھی ناقدری کریں تمام واقعات کو پڑھ کر چار و ناچار سہسرام کے اس افغان سپاہی کا نام ہند کے شاہان اعظم کی فہرست میں درج کرنا پڑتا ہے۔

ماخذات

سطور بالا حسب ذیل کتب سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) مخزن افغانی مصنفہ نعمت اللہ صاحب (کتب خانہ آصفیہ) (۲) تاریخ فرشتہ (۳) تاریخ شیر شاہی مترجمہ الیٹ (۴) تاریخ رشیدی (ترجمہ انگریزی) (۵) ہمایوں نامہ گلبدن بیگم (ترجمہ انگریزی) (۶) ہمایوں نامہ جوہر (ترجمہ انگریزی) اس مضمون کی تیاری میں علاوہ کتب مذکورہ بالا کے زیادہ تر پروفیسر قانون گو کی کتاب دو شیر شاہ سے مدد لی گئی ہے۔

غزل

از

(حضرت صفی اورنگ آبادی)

تمھیں جب سے کیا ہے پیار بدنامِ خلائق ہیں
ہر اک ہم کو بتاتا ہے کہ یہ بھی ان کے عاشق ہیں

ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہر روز کی اک چھیڑ جاری ہے
خدا رکھے عدو بھی اپنی مرضی کے موافق ہیں

ترے ہر چاہنے والے پہ ہم دیتے ہیں جان اپنی
زمانہ تیرا عاشق، ہم زمانے بھر کے عاشق ہیں

لگا کر جھوٹ سچ اچھے دلوں میں دشمنی ڈالی
تمھاری انجمن کے لوگ بھی کتنے منافق ہیں

اگر دنیا میں کوئی چیز ہے تو وضع داری ہے
کبھی مشتاق میں اُن کا تھا، اب وہ میرے مشتاق ہیں

تمنائیں بھی بر آئیں مگر اے شومیِ قسمت!
جنونِ عشق کے انداز اب تک حسبِ سابق ہیں

غمِ جاگیرِ دل کے واسطے زخمِ جگر دیکھو
کہ کیسے معتبر اسناد ہیں کیسے وثائق ہیں

صفی اس اپنی شُد بُد پر ہی تم کو ناز ہے اتنا
ذرا دنیا میں دیکھو کیسے کیسے لوگ لائق ہیں

فریب

از

جناب محمد باقر کرمانی

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ کائنات پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر جنگ کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ہوا کے سرد اور تیز جھونکے درختوں کو سرنگوں کرکے پر شور آواز سے سنسناتے ہوئے نکل جاتے تھے اس گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں ــــ اسٹریٹ برقی قمقموں کی روشنی میں بقعہ نور بنی ہوئی تھی اسٹریٹ کے سیدھے جانب ایک دوکان تھی جس کے آگے آئینے لگے ہوئے تھے۔ اندر کی روشنی میں آئینہ پر لکھے ہوئے حروف صاف طور پر نمایاں تھے۔ لکھا تھا:۔

پیٹر اینڈ سنس، جواہرات فروش

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک شخص صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے آیا اور دوکان کے سامنے ٹہلنے لگا کچھ سوچ کر اس نے دوکان کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

صاحب دوکان، پیٹر ایک کونے میں بیٹھا، پنچ کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ وہ ایک نووارد کو آتے دیکھ کر اٹھا۔ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ فرمائیے! "آپ کیا چاہتے ہیں"؟ پیٹر نے پوچھا۔

"کیا آپ ہیرے یا جواہرات خرید فرمائینگے؟ نووارد نے پوچھا" میرے پاس ایک قیمتی الماس ہے"۔

"جی ہاں! بتائیے! دیکھوں! پیٹر نے کہا

نووارد نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اس کو کھول کر سامنے والی میز پر رکھ دیا۔ ڈبیا میں ایک بیش قیمت الماس برقی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

الماس کے دیکھتے ہی پیٹر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ خود جوہری تھا اور اس کا پیشہ جواہرات کی خرید و فروخت تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ الماس نہایت اعلیٰ اور بیش قیمت ہے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس الماس کو کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں؟" پیٹر نے پوچھا" اور یہ بھی بتلایئے کہ آپ کا اس کو کہاں تک بکانے کا ارادہ ہے۔"

"صاحب کچھ نہ پوچھئے!" نووارد کہنے لگا" زمانہ کے ہاتھوں اتنا تنگ آگیا ہوں کہ ــــ کیا بتاؤں خیر سنئے۔ میں بھی آپ کی طرح ہندوستان کا ایک جوہری تھا قسمت کی گردش دیکھئے اب صرف کچھ ہی ہیرے باقی رہ گئے ہیں۔ انہی میں کا یہ ایک ہے۔ اب مجھے اس کا بکالنا ضروری ہے۔ آٹھ ہزار پونڈ اس کی قیمت ہے۔"

پیٹر کچھ دیر تک الماس کو گھورتا رہا پھر اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا! اور آخر کار معاملہ پانچ ہزار پر طے ہوگیا۔

"کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟" پیٹر نے پوچھا۔

"مجھے جان ہیڈ لے کہتے ہیں۔"

جان ہیڈلے پانچ ہزار لیکر روانہ ہوگیا۔

اس واقعہ کو چند دن گذر گئے شام کا وقت تھا ایک شخص نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اسی جوہری کی دوکان پر آن کر رک گیا۔ سین بورڈ پڑھنے کے بعد اندر داخل ہوا۔ دوکان کے ملازم نے آگے بڑھکر سلام کیا

"دوکان کے مالک کہاں ہیں؟" نووارد نے پوچھا"

وہ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں میں بلوا بھیجتا ہوں۔"

نووارد کرسی پر بیٹھ گیا۔

"معاف کیجئے! میں حاضر نہ تھا" پیٹر نے آتے ہی کہا۔ "فرمایئے! کیا ارشاد ہے۔"

"مجھے ایک عمدہ الماس کی ضرورت ہے۔" نووارد نے کہنا شروع کیا۔ میں نے اور بھی دوکانیں دیکھی ہیں لیکن کوئی الماس میری مرضی کے موافق نہ نکلا۔ الماس عمدہ چاہیئے اور ملسکے تو دیجئے لوں گا!

پیٹر نے اس کو بہت سے الماس دکھائے لیکن اس نے کسی کو بھی پسند نہ کیا۔ آخر کار پیٹر نے جان کے پاس کا خریدا ہوا الماس بہت تعریف کے ساتھ اس کے سامنے رکھا۔

"ہاں! الماس تو اچھا ہے مگر افسوس کہ ایک ہی ہے۔" نووارد نے کہا" اچھا بتایئے اس کے کیا دام ہیں؟" "اگر آپ کو ایسی ہی ضرورت ہو تو میں ایک اور بھی آپ کے لئے مہیا کر سکتا ہوں۔ پیٹر نے کہا

"کیونکر؟" نووارد نے پوچھا۔

"جس شخص نے یہ الماس میرے ہاتھ فروخت کیا اس کے پاس ایسے اور بھی الماس ہیں۔" پیٹر نے کہا

اس لئے ممکن ہے کہ وہ معقول معاوضہ پر ایک اور بھی فروخت کردے۔

"اچھا! اس کی قیمت فرمایئے۔" نووارد نے الماس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی قیمت چھ ہزار پونڈ ہے" پیٹر نے کہا۔ "ایسا الماس آپ کو بہت کم ــــ خیر میں اپنے مال کی آپ تعریف کیوں کروں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

"اچھا! اس کو تو میں اب خرید ے لیتا ہوں" نووارد نے کہا۔ "اگر آپ ایسا ہی ایک اور الماس میرے لئے مہیا کردیں تو میں اس کی دگنی قیمت دونگا۔"

"آپ مطمئن رہیں۔" پیٹر نے کہا۔ نووارد کے اس آخری فقرہ کو سنکر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ "میں ضرور ڈھونڈ نکال لونگا۔"

"میرا نام اور پتہ یہ ہے" نووارد نے ایک ملاقاتی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔

جوزف ہاورڈ۔ کنگ ہوٹل ــــ

نووارد نے چھ ہزار کے نوٹ گن دیئے اور الماس لیکر روانہ ہو گیا۔

اس واقعہ کو بھی ایک ہفتہ گذر گیا۔ جمعہ کی شام تھی۔ وکٹوریہ پارک فیشنیبل لوگوں سے معمور تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ ایک شخص درختوں کے سایہ میں بیٹھا اپنے خیالات میں منہمک تھا۔ یہی ہمارا جوہری پیٹر تھا۔

کسی نے پیچھے سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ وہ معاً چونک پڑا جب اس نے مڑکر دیکھا تو اس کے پیچھے جان ہیڈ لے مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ پیٹر اپنے خیالات میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے جان کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"اہا! آپ ہیں! تشریف رکھئے۔" پیٹر نے کہا "عجیب حسن اتفاق ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہو گئی"

"میں یوں ہی تفریح کے لئے یہاں نکل آیا کرتا ہوں۔" جان نے کہا۔ "آپ کو یہاں بیٹھا پاکر ملنے چلا آیا"

"جناب کا شکریہ!" پیٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر دفعتاً پیٹر نے کہا۔

"آہا! خوب یاد آیا" پیٹر نے کہا۔ "مجھے آپ سے ایک بات دریافت کرنی ہے۔"

"فرمایئے!"

"آپ کو یاد ہوگا" پیٹر نے کہا۔ "کہ آپ نے میرے ہاتھ ایک الماس فروخت کیا تھا۔"

"جی ہاں! پانچ ہزار پونڈ پر" جان نے جلدی سے کہا۔

"میں نے اس الماس کو ایک معزز شخص کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔" پیٹر نے کہا۔ "اس کی خواہش ہے کہ میں اس کو اور ایک ویسا ہی الماس مہیا کردوں۔"

"تو کوئی آپ کے ہاتھ نہ لگا" جان نے پوچھا

"جی نہیں! میں نے بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔"

پیٹر تھوڑی دیر کے لئے رک گیا پھر کہنے لگا۔

"مجھے خیال ہے آپ نے کہا تھا کہ آپکے پاس اور بھی الماس ہیں۔ ممکن ہے کہ آپکے پاس کوئی ایسا ہی الماس نکل آئے۔" جان نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ہاں۔ ممکن ہے نکل آئے۔ لیکن اب میں ان کو فروخت کرنا نہیں چاہتا"

"آیئے تشریف رکھئے!" پیٹر نے یہ کہتے ہوے ایک کرسی اس کی طرف بڑھا دی۔

"کیا آپ کو ویسا ہی الماس مل گیا؟" جوزف نے پوچھا۔

"جی ہاں! ورنہ تکلیف کیوں دیتا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ شکریہ!"

پیٹر نے اپنے سامنے والی میز کا خانہ باہر کھینچا، ایک مخملی ڈبیا نکالی اور اس کو کھولکر جوزف کے سامنے رکھدیا

"واہ! یہ تو بالکل ویسا ہی ہے بلکہ وہی معلوم ہوتا ہے۔" جوزف نے استعجاب کے لہجے میں کہا۔

"خوبی تو یہی ہے!" پیٹر نے تپاک کے لہجے میں کہا۔ "اس میں اور پچھلے میں کوئی فرق نہیں۔"

"جناب کا شکریہ!" جوزف! کہنے لگا۔ "اس وقت میرے پاس نقد روپیہ تو نہیں ہے۔ آپ کو لندن بنک کے نام چک لکھے دیتا ہوں۔"

"جی ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں پر آپ کا کوئی جاننے والا بھی ہے" پیٹر نے پوچھا۔

"میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں آپ اس کے منیجر سے دریافت کرسکتے ہیں۔" جوزف نے کہا۔

"ہاں میں اس کو پہچانتا ہوں۔ کیا وہ آپ کو جانتا ہے!" پیٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں! اچھی طرح۔"

پیٹر تو ایک بھولا بھالا آدمی تھا۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ یہ الماس جس کو اس نے جوزف کے لئے

اتنی زیادہ قیمت پر لیا تھا کسی طرح اسی کے سر ڈالے۔ اس کے علاوہ جوزف اپنے لباس، وضع قطع سے ایک شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چیک کے پیسے پیر کو وصول کرسکتا تھا۔

"اچھا۔ میں ہوٹل کے منیجر سے دریافت کرلیتا ہوں" پٹیر نے آخر کار کہا۔

"جی ہاں! خوشی سے۔" جوزف نے جواب دیا۔

کچھ دیر تک پٹیر ہوٹل کے منیجر سے ٹیلیفون پر باتیں کرتا رہا جب اس کی تشفی ہوگئی تو اس نے جوزف سے بارہ ہزار کا چیک لیکر الماس اس کے حوالہ کردیا۔

دوسرا دن چونکہ اتوار تھا اس لیے پٹیر بنیک روانہ ہوا۔ بنیک پہنچکر اس نے چیک صراف کے حوالہ کیا۔ صراف کچھ دیر تک ہی کھاتہ الٹ پلٹ کرتا رہا آخر کار کہنے لگا۔

"ہمارے یہاں اس نام کا کوئی کھاتہ دار نہیں ہے" صراف نے سر ہلاتے اور چیک پٹیر کے حوالہ کرتے ہوئے کہا۔ دفعتاً چیک کو غور سے دیکھ کر پکار اٹھا "ہیں! یہ چیک تو جعلی ہے"

یہ سنتے ہی پٹیر کے حواس اڑ گئے۔ آنکھوں کے تلے اندھیرا چھاگیا۔

کیا یہ چیک جعلی ہے؟ پٹیر نے پریشانی سے تھوڑی دیر بعد پوچھا

صراف نے اثبات میں سر ہلایا۔ پٹیر سر جھکائے جلد باہر نکل آیا اور گاڑی میں سوار ہوکر کنگ ہوٹل روانہ ہوا ہوٹل پہنچکر اس نے گھنٹی بجائی۔ ملازم دوڑتا ہوا باہر آیا۔

"کیا منیجر صاحب ہیں؟ پٹیر نے اس سے پوچھا

"جی ہاں! تشریف لے چلئے۔ ملازم نے کہا۔

پٹیر ملازم کے ساتھ منیجر کے آفس میں داخل ہوا اور منیجر سے مصافحہ کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا میں جوزف ہاورڈ سے ملسکتا ہوں؟ پٹیر نے منیجر سے پوچھا۔ اس کے چہرہ سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ "وہ تو اپنے ملازموں کے ساتھ کل صبح یہاں سے چلے گئے۔" منیجر نے کہا

"کیا؟ کل صبح چلے گئے؟"

"کیوں؟ منیجر نے پوچھا

" اس نے ایک ہفتہ قبل میرے پاس سے ایک الماس خریدا تھا" پٹیر نے تھوڑی دیر بعد کہا" اس کی قیمت اس نے ادا کردی۔ اس نے ایک اور الماس بارہ ہزار پر خریدا اور اس کا چک لکھ دیا

آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپ نے مجھے اطمینان دلایا تھا۔"

"میں نے آپ کو اطمینان دلایا؟ کس کا؟ کب؟"

"آپ اطمینان رکھئے" پیٹر نے کہا۔ "میں اس کے دام پہلے سے زیادہ دونگا۔

"دیکھئے! گذشتہ مرتبہ مجھے روپیہ کی سخت ضرورت تھی اس لئے میں نے گھاٹے سے آپ کو دس ہزار کا مال پانچ میں دیدیا۔ لیکن اب میں بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ اگر آپ کو ایسی ہی ضرورت ہے تو میں اس مرتبہ دس ہزار سے ایک پائی کم نہ لونگا۔"

"ہیں! دس ہزار! پیٹر پکار اٹھا۔

"جی ہاں! دس ہزار۔"

پیٹر نے سگریٹ کے دو ایک کش لئے اور سوچنے لگا۔ اگر وہ دس ہزار پر بھی خرید لے تو اس کو دو ہزار کا نفع تھا۔ پھر اس میں دیر کی کیا بات تھی۔ اُس نے آخر کار رضامندی ظاہر کردی۔

"آپ اپنی دوکان پر رہیں۔ میں ابھی الماس لے آتا ہوں۔"

جان یہ کہکر روانہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جان پیٹر کی دوکان میں داخل ہوا۔ اس نے ڈبیہ کھولکر میز پر رکھدی۔ پیٹر الماس کو دیکھتے ہی بہت خوش ہوگیا۔ دونوں الماس میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ ایک کو چھپاؤ اور دوسرے کو نکالو۔ جان دس ہزار کا چک لیکر روانہ ہوگیا۔

دوسرے ہی دن یعنے ہفتہ کو پیٹر نے ایک خط اس مضمون کا جوزف ہاورڈ کے نام لکھا:۔

جوزف ہاورڈ۔ کنگ ہوٹل۔

"آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ ہم نے آپ کے حسب الحکم اسی وضع قطع کا الماس مہیا کرلیا ہے جلد تشریف لاکر تصفیہ کرلیں۔"

پیٹر اینڈ سنس جواہرات فروش

ہفتہ کی شام تھی پیٹر دوکان میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ دوکان کا دروازہ کھلا اور جوزف اندر داخل ہوا۔ پیٹر دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہی جوزف ہاورڈ تھا۔

"پرسوں اسی جوزف کے بارے میں جس کا چک جعلی ثابت ہوا۔" پیٹر نے کہا۔

"چیک جعلی ثابت ہوا!" "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" منیجر نے استعجاب کے لہجہ میں کہا۔
"تو آپ نے پرسوں مجھ سے ٹیلیفون پر بات نہیں کی تھی؟" پیٹر نے آخرکار پوچھا۔
"جی نہیں! بالکل نہیں۔" منیجر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں تو پرسوں آکسفورڈ میں تھا۔"
پیٹر اس پیچیدہ معمہ کو سمجھ نہ سکا۔ منیجر بھی حیران تھا کچھ بتلا نہ سکتا تھا۔ جوزف ایک نووارد تھا۔ منیجر اس کے بارے میں پیٹر سے زیادہ نہ جانتا تھا۔ پیٹر آخرکار حیران و پریشان پولیس میں رپورٹ دینے کے خیال سے روانہ ہوا۔
پیٹر اپنے آفس کے کمرہ میں داخل ہوکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بیحد تھکا ہوا تھا۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ انہیں خیالات میں منہمک تھا کہ آفس کا دروازہ کھلا اور ملازم کشتی میں ایک خط رکھے داخل ہوا اور کہنے لگا۔
"حضور! اس خط پر اشد ضروری لکھا ہے اس لئے میں اسی وقت حاضر ہونا مناسب جانا۔"
پیٹر نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے خط پڑھتا جاتا تھا ویسے ویسے اس کا رنگ اڑتا جاتا تھا آخرکار اس نے خط سامنے کی میز پر ڈالدیا۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر آگے کی طرف جھک گیا۔
خط کا مضمون یہ تھا۔

"جناب من!
میں نے آپ کو بیحد تکلیف دی۔ میں جانتا تھا کہ آپ لندن بنک سے ناکام پھرینگے اور ہوٹل کے منیجر سے بھی کچھ پتہ نہ چلے گا۔ میں نے مناسب جانا کہ اس معمہ کو جس کے سمجھنے سے آپ قاصر ہیں حل کردوں سنئے اصل میں جان ہیڈلے اور جوزف ہاورڈ، دو جدا جدا اشخاص نہیں بلکہ دونوں ایک — لندن کا مشہور ڈاکو ولیم ہیں۔ اب اور سنئے۔ آپ سے ہوٹل کے منیجر کی بجائے بات کرنے والا میرا ہی آدمی تھا۔ چونکہ منیجر آکسفورڈ گیا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے پہلے ہی سے اپنا آدمی ٹیلیفون پر متعین کردیا تھا کہ اگر آپ میرے بارے میں دریافت کریں تو آپ کو اطمینان دلاوے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔
معافی کا خواستگار
ولیم

بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

از

حضرت حکیم آزاد انصاری

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ عشق نہیں ہے، آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کے گن کیا گاتا ہے حسن تباہی لاتا ہے
حسن گلے کٹواتا ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کے ارمان ٹھیک نہیں جی کا نقصان ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں، ہاں ٹھیک نہیں بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن پہ جی کیوں کھوتا ہے تخم غم کیوں بوتا ہے
حسن کسی کا ہوتا ہے؟ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا دم کیوں بھرتا ہے خون دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن پہ ناحق مائل ہے یہ تو دام ہر دل ہے
پھر چھٹکارا مشکل ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کی ناحق چاہت ہے حسن نہیں ہے، آفت ہے
فتنۂ روز قیامت ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حُسن سے دھوکا کھائیگا رنج و اذیت پائیگا
دیکھ بہت پچھتائیگا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

حُسن کو پہلے زر دے گا بعد ازاں کل گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

عالم روئے حُسن نہ دیکھ جلوۂ موئے حُسن نہ دیکھ
پھو لگے سوئے حُسن نہ دیکھ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن بُتاں سے بات نہ کر دشمنِ جاں سے بات نہ کر
خصم جہاں سے بات نہ کر بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

دل کو لگا کر کیا لے گا جان کھپا کر کیا لے گا
زیست گنوا کر کیا لے گا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

لعل جادو فن کو نہ چاہ جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ
دشمنِ جاں! دشمن کو نہ چاہ بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

چشم نہیں ہے، ڈاین ہے زلف نہیں ہے، ناگن ہے
عشوہ نہیں ہے، رہزن ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اہل ادا سے بچکر چل چشم قضا سے بچکر چل
راہ خطا سے بچکر چل بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حُسن کی چاہت پر بھی نہ جا چشم عنایت پر بھی نہ جا
لطف نہایت پر بھی نہ جا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ اس کی صباحت پر بھی نہ ریجھ

ناز و نزاکت پر بھی نہ ریجھ بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے وصل کا سَم بھی قاتل ہے
کم سے کم بھی قاتل ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

شوق وفا بھی مہلک ہے ذوق جفا بھی مہلک ہے
کم بھی سوا بھی مہلک ہے بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

جتنے حسین کہلاتے ہیں دشمن دیں کہلاتے ہیں
دوست نہیں کہلاتے ہیں بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

دل کو وفا کا اذن نہ دے ذوق جفا کا اذن نہ دے
ایسی خطا کا اِذن نہ دے بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

دولتِ دین و دل نہ گنوا بے جا۔ لاحاصل نہ گنوا
ہوش میں آ۔ غافل! نہ گنوا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

حسن کا ہوکر کیا لے گا سر سے پا تک کھالے گا
بھاگ، نہیں تو آلے گا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

آزاد! اپنی جان بچا دین بچا، ایمان بچا
نادان! کہنا مان۔ بچا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

غزل

از

جناب سید علی محمد صاحب اجلال فاضل لکھنوی

لحد پر بھی نہ آئیں گے یہ باور ہو نہیں سکتا
مرا ایسا تو برگشتہ مقدر ہو نہیں سکتا

اگر تم سا زمانہ میں ستمگر ہو نہیں سکتا
تو مجھ سا بھی جفاکش بندہ پرور ہو نہیں سکتا

قیامت ہو گیا بیمار شام غم کا مر جانا
وہ سمجھے تھے کہ محشر قبل محشر ہو نہیں سکتا

قفس میں ہمصفیر و عیش گلشن یاد آتا ہے
وہ سامان خواب میں بھی اب میسر ہو نہیں سکتا

بسان داغ ہے اب سینۂ رنگین گلشن پر
وہ اجڑا آشیانہ جو مرا گھر ہو نہیں سکتا

سرایت کر گیا ہو زہر غم جس کی رگ و پے میں
وہ مایوس شفا بیمار جانبر ہو نہیں سکتا

مزاج بحر آنسو میں سمویا عشق نے ورنہ
حقیقت میں جو قطرہ ہو سمندر ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کر کھینچ لی تصویر قاتل چشم بسمل نے
کہ اب اس سے سوا دلچسپ منظر ہو نہیں سکتا

کوئی روتا ہے رونے دو کوئی ہنستا ہے ہنسنے دو
کسی کے دل پہ قابو بندہ پرور ہو نہیں سکتا

نہ رکھ امید ناصح ترک مے کی رند میکش سے
یہ ایسا کام ہے جو زندگی بھر ہو نہیں سکتا

مرا دل خون ہو کر آ گیا ہے نوک مژگاں پر
مجھ ایسا خوگر آزار نشتر ہو نہیں سکتا

کہو اجلال ان سے درد غم کچھ تو اثر ہوگا
اگر انسان کا دل ہے تو پتھر ہو نہیں سکتا

افریقہ اور الجزائر میں مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات

از

(جناب محمد ذکریا صاحب مائل)

رقبہ و حدود

الجزائر بھی انہیں یادگار ممالک میں ہے جو مسلمانوں کے مرکز و مستقر سے ہزاروں میل دور ہونیکے باوجود نہایت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ان کے دائرۂ فتوحات میں داخل ہو گئے۔

الجزائر جزیرۃ العرب کی مغربی سمت میں واقع ہے اور موجودہ جغرافیائی حیثیت سے اس کا رقبہ تقریباً، لاکھ مربع میل ہے۔ جب اس عریض و طویل ملک میں عربوں کے قدم آئے تو انہوں نے الجزائر کو مشرق میں برقہ، مغرب میں بحر اطلانتک، شمال میں بحر روم اور جنوب میں صحرائے اعظم افریقہ کے ساتھ محدود کر دیا۔

اب ذرا ان حدود کی وسعت کو دیکھئے اور عربی فتوحات کی چند سالہ مدت پر نظر کیجئے خصوصاً اس خیال کے ساتھ کہ یہ وہ ممالک ہیں جہاں کے رسم و رواج اور جغرافیہ کا فاتحوں کو ذرا بھی علم نہ تھا۔ اسی حالت میں ان کا اس سرعت کے ساتھ بڑھنا اور اپنی فتوحات کو غیر محدود ترقی دیتے رہنا اس تیقن کے لئے کافی ہے کہ "یہ صرف ان کی روحانیت کا سچا جوش تھا جس نے ان کو غیر فانی تاریخی عظمت کا مالک بنا دیا اور اس جوش کا نشوونما اور اس کی کرشمہ کاری یقیناً انسانی اختیار و قابو سے باہر ہے اور بغیر کسی زبردست غیر مرئی طاقت کی تحریک کے ایسی فتوحات کا بروئے کار آنا محال ہے"

میں نے سطور ذیل میں الجزائر و افریقہ کے متعلق مسلمانوں کی ابتدائی کوششیں اور ان کی فتوحات کی مفصل کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور عقبہ وغیرہ نامور مجاہدوں کے حالات نسبتاً تشریح کے ساتھ درج کئے ہیں جو عام تاریخوں میں نہیں ملتے۔ اور ملتے ہیں تو بہت کچھ تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کے مطالعہ سے، تمہید میں جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے، اس کی صداقت پر کافی روشنی پڑ سکے گی

اس مضمون کے متعلق میری معلومات مبارک ابن محمد الہلالی کے تازہ تالیف تاریخ الجزائر کی ممنون ہیں جو مطبعۃ الجزائریہ قسطنطنیہ سے شائع ہوئی ہے۔

افریقیہ میں عربوں کا داخلہ

حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عربوں نے شام، مصر اور طرابلس فتح کئے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں افریقیہ[1] میں داخل ہوئے۔

پہلی مہم

سب سے پہلے سنہ ۲۶ھ مطابق سنہ ۶۴۷ء میں ۔ خلافت سے عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح عامری افریقیہ کی مہم پر مامور ہوئے اور (۲۰ ہزار) سپاہی فراہم کرکے افریقیہ کی جانب بڑھے۔
عبداللہ ابن سعد کے لشکر میں عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن جعفر، عبداللہ ابن عباس اور عقبہ ابن نافع جیسے بڑے بڑے خبری، دانشمند اور عالی مرتبت صحابی شریک تھے۔
مسلمانوں کی پیش قدمی کی خبر سنکر جرجیر[2] فرمانروائے سبیطلہ ایک لاکھ بیس ہزار رومی و بربری سپاہیوں کی جمعیت سے مقابلہ کے لئے بڑھا سبیطلہ پہنچنے میں ایک شبانہ روز کی مسافت باقی تھی کہ دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے آپہنچیں اور مقابلہ شروع ہوگیا یہ جنگ پوری شدومد کے ساتھ ہوئی۔ سخت خونریزی ہوئی مگر اس کا انجام جرجیر کے قتل اور اس کے لشکر کی ہزیمت پر ہوا۔ مسلمان فتحیاب ہوئے۔
اس معرکتہ الآرا فتح کے بعد عرب پایہ تخت سبیطلہ[3] میں داخل ہوگئے اور ملک کے مختلف حصوں میں اپنے عسکری مرکز بناکر رومیوں اور بربریوں پر تاخت وتاراج کرنے لگے رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے حملوں کو اتنی ترقی دی کہ قفصہ تک پہنچ گئے اور قصر الجم کو بطریق صلح مسخر کرلیا۔

---

[1] فریقیہ اور افریقہ میں وہی نسبت ہے جو ہندوستان اور براعظم ایشیا میں، عموماً افریقیہ سے تونس کا ملک مراد ہوتا ہے مصنف کتاب المونس کا قول ہے کہ افریقیہ کا اطلاق قیروان اور اس حصہ پر ہوتا ہے جو وادی طلمیس اور شہر باجہ کے درمیان واقع ہے اور سارا مغرب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

[2] جرجیر، افریقیہ کا والی تھا، یہ اور ہرقل سپہ سالار عساکر روم دونوں قسطنطنیہ کے غاصب فرمانروا فوقاص کو شکست دیکر سلطنت روم پر خود قابض ہونا چاہتے تھے۔ اس غرض سے دونوں کے بیٹے اپنی اپنی فوجیں لیکر بڑھے۔ بحری راستہ ہرقل کے بیٹے نے اور بری جرجیر کے بیٹے نے اختیار کیا مگر کامیابی ہرقل ابن ہرقل کو ہوئی، جرجیر نے اس مقصد میں ناکام ہوکر سلطنت روم سے افریقیہ کی علیحدگی اور اپنے استقلال حکومت کا اعلان کردیا۔ یہ واقعات سنہ ۶۰۲ء میں پیش آئے۔

[3] سبیطلہ قیروان سے تقریباً (۱۳۰) کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اس مقام کو جرجیر نے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔

صلح اور مراجعت

جب عربی لشکر ایک سال تین ماہ تک افریقیہ ہی پر مسلط رہا تو اہل افریقیہ نے صلح کی درخواست کی اور تصفیہ صلح کے لئے عبداللہ ابن سعد کے پاس بہت سا مال لیگئے عبداللہ نے صلح منظور کرلی اور بے شمار و گراں قدر اموال ساتھ لیکر مصر کی جانب مراجعت کی۔

ہرقل قیصر روم کا اہل افریقیہ پر غصہ

ہرقل قیصر روم کو رومیوں اور بربریوں کی ہزیمت کا حال معلوم ہوا اور اس مال و دولت کا بھی علم ہوا جو عبداللہ ابن سعد کو معاوضہ صلح میں اہل افریقیہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرقل نے غضبناک ہو کر عربوں کو فائدہ پہنچانے کے الزام میں اہل افریقیہ کے ذمہ یہ تاوان عاید کیا کہ وہ قیصر روم کو بھی اتنا ہی مال نذر دیں جتنا عربوں کو دے چکے ہیں۔ اور اس تاوان کی وصولی کے لئے ایک بطریق کو مامور کیا۔

بطریق سے اہل افریقیہ کی جنگ اور بطریق کی فتح

بطریق بہت سا لشکر لے کر قرطاجنہ[1] پہنچا اور افریقیہ والوں کو شہنشاہ روم کے فرمان سے مطلع کیا یہ سنکر وہاں کے باشندے بہت برہم ہوئے اور انہوں نے احتجاج کیا کہ "ایسے موقع پر ہماری امداد لازم تھی نہ کہ اور ہم پر تاوان عاید کیا جاتا ہے" ان لوگوں کی حجت اور بطریق کے اصرار نے آخر کار جدال سے قتال کی صورت اختیار کرلی۔ اور تلوار ہی کا فیصلہ ناطق قرار پایا۔ جنگ ہوئی اور بطریق کو فتح ہوئی۔ اس وقت جو شخص اہل افریقیہ کی طرف سے جرجیر کی جگہ وہاں کا حکمران تھا۔ بطریق کے حکم سے معزول ہوا اور اہل عرب سے مدد حاصل کرنے کے لئے ملک شام کی طرف چلدیا۔

عبداللہ ابن سعد کی واپسی کے بعد خلافت کا رنگ

عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح کے افریقیہ سے رخصت ہو جانے کے بعد رومیوں اور بربریوں نے پورے اٹھارہ سال طوائف الملوکی و خود سری میں گزارے۔ کیونکہ عرب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ کے ہولناک واقعہ شہادت اور بعض اور اہم معاملات کی وجہ سے، جنگ افریقیہ کی طرف سے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۵)
ستہ قمرایم کا دوسرا نام تیسدروس بھی ہے، افریقیہ کا سرحدی مقام ہے اور قیروان سے تقریباً ۵۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر آباد ہے

[1] قرطاجنہ، دریائے مجردہ کے ساحل پر واقع ہے اور افریقیہ کا مشہور سرحدی شہر ہے۔

غافل ہو گئے تھے۔ پھر اس کے بعد ہی انہیں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور امیر معاؔویہ کی لڑائیوں میں کافی حصہ لینا پڑا۔

امیر معاویہ کی خلافت اور افریقیہ کی دوسری مہم

جب امیر معاؔویہ ابن ابی سفیان کو خلافت پر دسترس ہوئی تو ان کے عہد میں افریقیہ کے معزول فرمانروا نے بارگاہ خلافت میں درخواست پیش کی کہ میری مدد فرمائی جائے اور میری بازرفتہ حکومت مجھے دلائی جائے۔ امیر معاؔویہ نے ایک لشکر معاؔویہ ابن حدیج سکونی الکندی صحابی کی سرکردگی میں رئیس افریقیہ کے ساتھ روانہ کیا قسمت کی بات ہے کہ جب یہ مہم اسکندریہ پہنچی تو رئیس معزول کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس لشکر کو تو افریقیہ پہنچکر فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کی ہدایت تھی اس لئے معاویہ ابن حدیج نے کوچ جاری رکھا اور بڑھتے چلے گئے۔

افریقیہ میں معاویہ ابن حدیج کا داخلہ اور بطریق سے جنگ

معاویہ ابن حدیج سنہ ۴۵ھ مطابق ۶۶۵ء میں دس ہزار جری سپاہیوں کے ساتھ افریقیہ میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ بھی عرب کے مشہور و سربرآوردہ سردار تھے جن میں عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ ابن عباس اور عبد الملک ابن مروان وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں عربوں کی اس فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے بطریق بھی تیس ہزار کی جمعیت سے نکلا مگر مقابلہ کے وقت عربوں کی ٹکر نہ روک سکا اور کثرت افواج کے باوجود قصر اَلجم کے پاس ہزیمت کھائی۔ اس جنگ میں سوسہ[1]، بنزرت[2]، جربہ[3] اور صقلیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور معاویہ ابن حدیج نے اپنی لشکروں کی قیامگاہ بنانے کے لئے آباد کو انتخاب کیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں بعد میں قیروان کی بنا پڑی۔

معاویہ ابن حدیج کی ولایت اور واپسی و معزولی

سنہ ۴۶ھ یا سنہ ۴۷ھ میں امیر معاویہ نے معاویہ ابن حدیج کو بلا کر مصر و افریقیہ کا باقاعدہ والی مقرر کیا۔ پھر کچھ مدت بعد پہلے افریقیہ لے لیا اور سنہ ۵۰ھ میں ولایت مصر سے بھی معزول کر دیا۔

---

[1] سوسہ بھی سرحدی مقام ہے اور قیرواؔں سے اس کا فاصلہ تقریباً ۶۰ کیلو میٹر ہے۔

[2] بنزرت کا دوسرا نام ہپوزریتوس ہے اس کا فاصلہ قرطاجنہ سے تقریباً ۱۰۰ کیلومیٹر ہے۔

[3] جربہ ایک جزیرہ کی شکل میں آباد ہے اور اَلجم سے اس کا فاصلہ تقریباً (۲۰۰) کیلومیٹر ہے۔

افریقیہ میں عقبہ ابن نافع کی ولایت

معاویہ ابن حدیج کے بعد حضرت معاویہ نے عقبہ ابن نافع الفہری کو افریقیہ بھیجا۔ ان کے سنہ ولایت میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ سنہ ۴۶ھ بتلاتے ہیں اور بعض سنہ ۵۰ھ۔ فرانسیسی تاریخوں میں لکھا ہے کہ عقبہ ابن نافع سنہ ۶۶۷ء میں لڑتے ہوئے آئے اور سنہ ۶۶۹ء میں افریقیہ کے والی مقرر ہوئے۔ اس روایت کو جمع بین الروایتین کی حیثیت دی جاسکتی ہے اور اکثر عرب مورخوں کے مختلف بیانات میں تطبیق کا ذریعہ نکل آتا ہے۔ یعنی ہم عقبہ ابن نافع کی آمد اسلامی فوج کے جنرل کی حیثیت سے سنہ ۴۶ھ یا اس کے کچھ بعد تسلیم کریں اور سنہ ۵۰ھ مطابق سنہ ۶۶۹ء کو ان کی ولایت کا سال کہیں۔ اس سے اختلاف دور ہو کر ایک فیصلہ کن بات نکل آتی ہے۔

قیروان کی تاسیس عقبہ کی معزولی اور سلمہ ابن مخلد کی ولایت

عقبہ نے افریقیہ آکر بربریوں اور رومیوں کو اپنی حکومت کے تابع کرنے اور افریقیہ میں عربی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے بڑی جد و جہد کی اور سنہ ۵۰ھ مطابق سنہ ۶۷۰ء میں شہر قیروان کی بنا ڈالی اور اسی میں رومانی کھنڈروں کا ملبہ صرف کیا۔ مگر اس کے بعد ہی حضرت عقبہ کو حضرت معاویہ نے معزول کر دیا۔ اور مسلمہ ابن مخلد کو مصر کے ساتھ افریقیہ کی حکومت بھی تفویض کر دی۔

افریقیہ پر ابو مہاجر کی ماموری اور عقبہ کے ساتھ بدسلوکی

مسلمہ ابن مخلد نے حکمران ہو کر اپنی طرف سے اپنے آزاد غلام ابو مہاجر کو افریقیہ پر نظم و نسق کا اختیار دیا اور عقبہ سے جائزہ لینے کی ہدایت کی ابو مہاجر نے افریقیہ پہنچکر عقبہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور جائزہ حکومت حاصل کر کے لوگوں سے ان کی معزولی کا واقعہ برے عنوان سے بیان کیا پھر یہی نہیں کہ اس طرح عقبہ کی توہین کرنے پر اکتفا کی ہو بلکہ رشک وحسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے بنا کردہ شہر قیروان پر بھی آفت لایا اور اسے ویران کر کے اسی کے قریب ایک دوسرے شہر کی بنیاد ڈالی۔

---

[1] چونکہ الجزایر و افریقیہ وغیرہ ملک عرب کے مغربی جانب واقع ہیں اس لئے اہل عرب ان ممالک کو مغرب کہتے تھے اور مغرب کی انہوں نے حسب ذیل تقسیم کی تھی:۔ مغرب ادنیٰ:۔ وہ حصہ جو مشرق میں برقہ اور مغرب میں بجایہ کے درمیان واقع ہے۔ مغرب اوسط:۔ وہ حصہ جو مشرق میں بجایہ اور مغرب میں وادی ملویہ کے مابین ہے۔ مغرب اقصیٰ:۔ وہ حصہ جو مشرق میں وادی ملویہ اور مغرب میں بحر محیط (اطلانتک) سے محدود ہے

ابو مہاجر اور کسیلہ میں جنگ

بربری رئیسوں میں سے ایک شخص کسیلہ بھی تھا جس نے مغرب وسطیٰ میں بہت سی فوج جمع کر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاری کی، ابو مہاجر کو علم ہوا تو اس نے کسیلہ پر حملہ کر دیا اور اسے تلمسان کے قریب شکست دی۔ گروٹ کا بیان ہے کہ کسیلہ کا مقام ہزیمت تلمسان نہیں ہے بلکہ وادی آسر ہے، بہر حال شکست کے بعد کسیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو ابو مہاجر نے اس کی بہت عزت کی اور اسے اپنا مقرب دوست بنا لیا الزیانی کا بیان ہے کہ اس فتح کے بعد ابو مہاجر نے دوسرے بربریوں سے جنگ شروع کی، اس سلسلہ میں تلمسان پہنچا اور ان چشموں کے قریب قیام کیا جو تلمسان کے نشیب میں واقع ہیں۔ ابو مہاجر کے قیام ہی کی وجہ سے یہ چشمے اس وقت سے اب تک عیون ابی مہاجر کے نام سے مشہور ہیں۔

اختلاف روایت

قیروان کی تخریب اور دوسرے شہر کی تعمیر کے متعلق الزیانی کا قول ہے کہ ابو مہاجر نے مغرب وسطیٰ کی جنگ سے واپس ہو کر قیروان اجاڑا اور مسلمانوں کے لئے ایک اور حصار بنایا۔ پھر امیر معاویہ کی خبر وفات آنے تک اسی حصار میں مقیم رہا برخلاف اس کے گروٹ لکھتا ہے کہ ابو مہاجر نے افریقیہ کا پایہ تخت بجائے قیروان کے میلہ کو مقرر کیا تھا مگر سوائے گروٹ کے اور کسی مورخ کے یہاں یہ روایت نظر نہیں آتی۔ اس لئے الزیانی کی روایت ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یزید کا عہد اور افریقیہ میں عقبہ کا دور ثانی

امیر معاویہ کی وفات کے بعد جب یزید ابن معاویہ خلیفہ ہوا تو اس نے عقبہ کو دوبارہ افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ عقبہ سنہ ۶۲ھ میں افریقیہ آئے اور ابو مہاجر سے[1] انتقام لینے کے لئے اسے قید کر دیا۔ ساتھ ہی ابو مہاجر کے دوست کسیلہ کو بھی گرفتار کیا اور ابو مہاجر نے جو شہر بسایا تھا اسے ویران کر کے پھر سے قیروان کو آباد کیا۔

فتح باغایہ

تخریب و تعمیر کے اس کام سے فارغ ہو کر عقبہ رومی و بربری فوجوں سے لڑنے میں مشغول ہو گئے اور لڑتے لڑتے شہر باغایہ تک جا پہنچے۔ اسی شہر میں رومی و بربری افواج سے عقبہ کا

---

[1] واقدی کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابو مہاجر نے جب عقبہ سے افریقیہ کا جائزہ لیا تھا تو انہیں قید بھی کر دیا تھا۔ جب یزید ابن معاویہ کو اس کا حال معلوم ہوا تو اس نے ابو مہاجر کے پاس عقبہ کی رہائی کا حکم بھیجکر عقبہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس صورت میں عقبہ کا انتقام دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یعنی خواہ اپنی قید کا انتقام لیا ہو یا بدسلوکی کا۔

مقابلہ ہوا۔ البکری کا بیان ہے "عقبہ اور ان افواج کے درمیان نہایت زبردست معرکے ہوئے مگر فتح آخرکار عقبہ کو ہوئی اور انہوں نے اہل باغایہ کو ہزیمت دیکر بری طرح قتل کیا۔ اس جنگ سے جان بچاکر اہل باغایہ قلعہ بند ہو گئے اور عقبہ کو بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا جس میں جبل اور اس کے گھوڑے اتنے عمدہ تھے کہ اس سے پہلے کی لڑائیوں میں ان سے زیادہ مضبوط اور تیز رفتار گھوڑے کہیں نہ ملے تھے۔ اس فتح کے بعد عقبہ نے باغایہ سے بہت جلد کوچ کیا اور اس خیال سے وہاں زیادہ نہ ٹھہرے کہ کہیں وہاں کے لوگوں میں مشغول ہوکر دوسری مہموں اور دشمنوں سے غافل نہ ہوجائیں۔

فتح لمبس

اب عقبہ لمبس (تازولت) کی طرف بڑھے۔ اس مقام کی حفاظت کے لئے بربریوں اور رومیوں نے جان لڑادی اور بڑی سختی سے مقابلہ کیا مگر نصرت تو عربوں کی کنیز ہے۔ یہ مقام بھی مسخر ہو گیا۔ اس کے بعد زاب کی طرف پیشقدمی کی اور اس ملک کے بڑے بڑے شہروں کا کھوج لگایا۔

شہر اربہ کی تسخیر

شہر اربہ کا پتہ ملنے پر عقبہ نے جانب اربہ کوچ کیا اور شام کو اس سرزمین میں داخل ہوکر صبح کو وہاں کے باشندوں پر دھاوا بول دیا۔ بربری عقبہ سے بہت ڈرے ہوئے تھے فوراً پناہ لینے کے لئے قلعہ بند ہو گئے۔ اور جب عقبہ نے چڑھائی کی تو مدافعت کرتے رہے۔ ان لڑائیوں نے بہت طول کھینچا مگر آخر میں ان کا سلسلہ بھی بربریوں کی ہزیمت پر ختم ہوا۔ جس میں بربری کثرت سے مارے گئے۔

تیہرت پر فیصلہ کن جنگ اور فتح کی تکمیل

اربہ سے روانہ ہوکر عقبہ نے تیہرت پر چڑھائی کی اس مقام پر ایسی زبردست جنگ ہوئی کہ تمام بربری و رومی افواج عقبہ کا لوہا مان گئیں اور ایک ہمہ گیر فتح کے بعد یہاں سے عقبہ نے مغرب اقصیٰ کی طرف قدم بڑھائے اور اپنی زبردست سرعت رفتار سے اطراف ملک میں خداداد ہیبت و نصرت کا سکہ جماتے ہوئے بحر اطلانتک تک جا پہنچے اب چونکہ سمندر آپہنچا تھا اور زمین ختم ہو چکی تھی اس لئے قیروآن کی جانب واپسی کا عزم کیا اور لشکروں کو قیروآن پہنچنے کی ہدایت کی۔

کسیلہ کے ساتھ عقبہ کی بدسلوکی اور ابومہاجر کی خیر اندیشی

ان معرکوں میں ابومہاجر اور کسیلہ دونوں بحالت قید عقبہ کے ساتھ رہے، عقبہ کا سلوک کسیلہ کے ساتھ اہانت آمیز اور سخت تھا اور وہ بروایت ابن خلدون روزانہ کسیلہ پر مسلط ہو کر

کسیلہ سے اپنے مطبخ کی مذبوحہ بکریوں کی کھال کھنچواتے تھے۔

اگرچہ ابو مہاجر اور عقبہ کے درمیان شخصی عداوت و منافرت کی آگ مشتعل تھی مگر باوجود اس کے ابو مہاجر نے دشمن کے مقابلہ میں عقبہ کا ساتھ چھوڑ کر اپنے دین و دولت کی تباہی پسند نہ کی اور کسیلہ کے ساتھ عقبہ کے اس سلوک کو ان کے حق میں خطرناک سمجھ کر عقبہ کو سمجھایا کہ اس طرز عمل سے باز آ جائیں اور سرکشان عرب کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز سیاست بیان کر کے توجہ دلائی کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں پر قابو پا کر مہربانی فرماتے تھے ویسے ہی آپ بھی کسیلہ کے ساتھ پیش آئے۔ آپ کا موجودہ سلوک اور سیاست کا یہ انداز ہر حیثیت سے قابل اصلاح ہے" مگر ان تمام باتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور عقبہ کے تشدد میں کوئی فرق نہ آیا۔

قیروان کی طرف لشکروں کا کوچ اور کسیلہ کا انتقام

جب عقبہ شہر طبنہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے لشکروں کو پہلے سے قیروان روانہ کر دیا۔ اب ان کے پاس ایک مختصر سی فوج باقی تھی جس میں صرف وہی بہادر اور چیدہ سپاہی تھے جن کے متعلق عقبہ کو یقین تھا کہ ان کا بربریوں پر ظفریاب ہونا مسلمہ ہے" اس قلیل جمیعت کے ساتھ عقبہ تہودا میں قیام کرنے کے ارادے سے چلے۔

کسیلہ کو جب عقبہ کی سپاہ کا یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے مخفی ذرائع سے رومی اور بربری جتھوں کو خبر پہنچا دی اور کاہنہ والیہ جبل اوراس کو بھی اطلاع کر دی خبر پہنچتے ہی بے شمار رومی و بربری فوجیں پوری قوت کے ساتھ مجتمع ہو کر بڑھیں اور عقبہ اور ان کی باقی ماندہ فوج کو اچھی طرح گھیر لیا۔ عقبہ نے ان کی کثرت اور اپنی قلت فوج پر نظر کی تو سمجھ گئے کہ اب شہادت کے سوا چارہ نہیں اور ابو مہاجر کو قید سے آزاد کر کے کہا" امداد کا وقت آ پہنچا" قیروان کا حق ادا کرو، اٹھو اور مسلمانوں کے لئے جانیں لڑا دو" میں تو اس وقت شہادت کو غنیمت سمجھتا ہوں، تم بھی اپنا فرض ادا کرو"

ابو مہاجر کی حمیت و فرض شناسی

یہ وقت ایسا نازک تھا کہ اگر ابو مہاجر کی حمیت میں ذرا بھی ضعف پیدا ہوتا تو کسیلہ کی دوستی اس کے لئے نجات کا ذریعہ بنجاتی اور اس کا بال بھی بیکا نہ ہوتا مگر اس نے اپنی جان بچانے کے لئے عقبہ کو ہلاکت میں ڈالنا گوارا نہ کیا اور عقبہ کو مخاطب کر کے جواب دیا۔ "میں خود شہادت کو غنیمت سمجھتا ہوں اور ہمارے اسلاف کا بھی یہی حال تھا کہ اگر ان کے درمیان کچھ ذاتی مناقشات ہوتے تھے تو وہ مصیبت و امداد کے وقت اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لاتے اور مصالح عامہ کو مدنظر رکھ کر سب کچھ بھلا دیتے تھے۔"

مقابلہ اور شہادت

اس مختصر سی گفتگو کے بعد یہ اور ان کے ساتھ سارے بہادر اپنے گھوڑوں پر سے اترے اور بے شرمی و ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو بدرجہا عزیز جانکر دشمنوں سے لڑنے میں مشغول ہو گئے ۔ اور اس شدومد سے لڑے کہ ایک ایک کر کے سب نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر پیٹھ دکھانا گوارا نہ کیا ۔ جان نثاروں کی اس جماعت میں تین سو صحابہ اور عالی مرتبہ تابعین تھے

ابن خلدون لکھتے ہیں "سرزمین زاب میں جو اس عہد کی قبریں پائی جاتی ہیں یہ انہیں صحابہ کی ہیں جو عقبہ کے ساتھ شہید ہوئے تھے ۔ عقبہ کی قبر پر پہلے یونہی ایک پشتہ سا بنا ہوا تھا پھر گچ سے پختہ کیا گیا ۔ اور اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کر دی گئی جو مسجد عقبہ کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ مقام تبرک زیارتگاہوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ عظمت و برکت کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ساری دنیا کے مزارات سے بڑھکر ہے کیونکہ اس میں صحابہ اور تابعین کے بہت سے مشہد دفن ہیں جن کے مرتبۂ شہادت کو کوئی نہیں پہنچا"

ابن خلدون کی اس روایت میں جس مسجد عقبہ کا ذکر ہے ، یہ اس گاؤں کی مشہور و معروف مسجد ہے جو آج کل سیدی عقبہ کے نام سے مشہور ہے ۔ عقبہ کی قبر اسی مسجد میں واقع ہے ۔

عقبہ کی صحابیت پر تبصرہ

بظاہر ابن خلدون کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ عقبہ صحابی تھے ، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ، کیونکہ صرف ان کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہوئی تھی ۔ اسی لئے اہل رجال انہیں صحابی بالمولد کہتے ہیں ایسی حالت میں انہیں صحابہ کے گروہ میں داخل کرنا زیادتی ہے ۔

اور یہ جو ابن خلدون نے لکھا ہے کہ الجزائر کا یہ مقام تمام زیارتگاہوں سے اشرف ہے تو اس کا صریح مدعا یہی ہے کہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مزارات اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ اس نے اپنے قول کو صحابہ و تابعین کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے ۔ اور انبیا سے قطع نظر کر کے اس قول کی اہمیت پر نظر کیجئے تو اس کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہتا ۔ کیونکہ الجزائر کو وہ مخصوص فضائل حاصل ہیں جو کسی سرزمین کو میسر نہیں اور ان بزرگوں کا مذہب و تاریخ میں وہ مرتبہ ہے جو کسی کا نہیں ، مذہب میں اس لئے کہ یہ لوگ ایسے زمانہ کے ہیں جو خیر القرون ہے اور بعد کے زمانہ سے افضل ہے پھر یہ لوگ شہادت کی شریف ترین عزت سے ممتاز ہیں اس لئے ان کو ہمارے مذہب میں وہ فضیلت حاصل ہے جسے عزیز ترین حیثیت دی جاتی ہے ۔ وہ ہمارے لئے ایک بہترین ورثہ چھوڑ گئے ہیں ۔ اور تاریخ میں ان کی عظمت اس لئے مسلم ہے کہ وہ شمالی افریقیہ میں گھستے ہوئے

تین سال کے اندر تونس سے اقصائے سوس تک فتح کرتے چلے گئے ۔ حالانکہ نہ انہیں اس ملک سے واقفیت تھی نہ یہاں کے باشندوں نے ان کی کوئی مدد کی ۔

عقبہ کے فضائل پر ایک نظر

عقبہ کے جتنے اوصاف لکھے گئے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ عقبہ نامور ان تاریخ میں عظیم ترین شخصیت کے مالک تھے ، انہوں نے مصر سے اپنی مہم شروع کر کے رومیوں سے بحری جنگ کی ، غدامس فتح کیا وہاں سے ودان اور فزان سر کرتے ہوئے سودان پہنچے اور وہاں کے کئی ضلعے فتح کئے ۔ ان کی یہ سب فتوحات جنگ افریقیہ شروع کرنے سے پہلے کی ہیں ۔ ان فتوحات کے ساتھ جب عقبہ کے خطوط جنگ کے فاصلے ، آلات جنگ کی کمی، ذرائع نقل و اطلاع کا فقدان بھی ملحوظ رکھا جائے تو فتوحات کی اس کثرت پر حسرت کی انتہا نہیں رہتی ۔ اور عقبہ کی تاریخی عظمت کا درجہ کہیں بلند ہو جاتا ہے ۔

ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون قارئین کے دلوں میں عقبہ کی غیر فانی عظمت اور اکابر اسلاف کے کارناموں سے ہماری غفلت کا صحیح احساس پیدا کر سکے گا اور اگر اس مقصد میں ذرا بھی کامیابی ہو جائے تو اسی کو ہماری محنت کا ثمرہ سمجھئے !

ایک خاندان کی قبریں

ہمنس کی شہرہ آفاق نظم کا ترجمہ

از

جناب سید بادشاہ علی نقش حیدرآبادی

حسن میں بڑھتے گئے جو ساتھ ساتھ — تھے خوشی کے سب خزانے جن کے ہاتھ
ان کی قبریں ہیں جدا از یک دگر — راہ میں حائل ہیں دشت و بام و در
رات کو ماں ہوتی تھی جس دم جدا — بوسہ پیشانی پہ دیتی تھی سدا
تھے کھلے اس کے چمن میں چار پھول — پڑ گئی کیا جلد اُس گلشن پہ دھول
ایک تو مغرب میں ہے مصروفِ خواب — بہتا ہے جس کے قریں دریائے آب
مغربی ہیں جانتے اُس کا مزار — ہیں جہاں پتے پڑے صدہا ہزار
دوسرا تھا جو عزیزِ خاندان — بحر نے اس کا مٹا ڈالا نشاں
موتیوں میں حسن اُس کا ہے عیاں — ہے مگر وہ چشمِ مردم سے نہاں
ایک کا زیرِ صنوبر ہے مزار — جس پہ دائم برگ ہوتے ہیں نثار
گلشن اٹلی میں اک مرجھا گئی — ہائے یہ کیسی تباہی آ گئی
اس طرح سے ہو گئے سارے جدا — کھیلتے تھے مل کے جو باہم سدا
اُن کی آوازیں تھیں گو یا راگنی — جن کو آتی تھیں دعائیں مانگنی
مسکراہٹ سے چمک جاتا تھا گھر — اور خوشی سے دیتے تھے وہ دل کو بھر

ہے محبت کام کی اور با اثر
ہے ضرورت صبر کی اس میں مگر

دعوت میں جانا

(جناب "ناکارہ" حیدرآبادی)

مجھے توان بے وقوفوں پر بڑا غصہ آتا ہے، جو دعوتی رقعہ تو لیکر رکھ لیتے ہیں مگر دعوت میں نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کو کبھی بھولکر بھی دعوت نہ دینی چاہیئے۔ مگر ایسا کرنا بھی ایک مصیبت ہے جس کسی سے ملیں گے بس علیک سلیک کے بعد کہنا شروع کردیں گے کہ "دیکھا! ان کے ہاں بسم اللہ کی دعوت تھی سارا محلہ مدعو تھا۔ مگر ہم کو کون پوچھتا؟ غریب آدمی ہیں نا۔ کل بازار میں ملے تھے رقعہ نہ بھیجا نہ بھیجا زبانی ہی کہدیتے کہ میاں کل شام میں دعوت ہے ضرور آنا۔" وغیرہ وغیرہ وغیرہ ـــــ اور اگر کوئی ان بدتمیزوں سے پوچھے گا کہ "آپ دعوت میں کیوں نہیں آئے؟ رقعہ ملا تھا نا؟" تو کہیں گے :۔

"جی ہاں ملا تو تھا۔ مگر نہ آسکا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"آپ کا بڑا انتظار رہا۔ مگر آپ کاہیکو آتے؟ ہم ناچیز اس قابل تھوڑی ہیں کہ آپ ــــ"؟

(ہنسکر) "جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ مجھے پرہیز ہے۔ حکیم صاحب ــ آپ جانتے ہی ہوں گے مولوی بشیر احمد صاحب کو۔ انہوں نے ـــــ"

"آپ کو پرہیز ہے تو کھانا نہ کھایا ہوتا۔ کم از کم تشریف تو لاتے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔"

"جی مجھے اس روز بخار تھا۔"

"کم از کم لکھ بھیجتے کہ میں نہیں آسکتا"

"جی بڑی ناتوانی تھی۔"

"کہلا بھیجتے؟"

"جی آدمی نہیں تھا"

"جلدی مرجاؤ۔"

"نامعقول کہیں کے !"

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کوئی دعوت ناغہ کی ہو۔ دعوت کا قبول کرنا سنت ہے ۔ اور پھر خیال کیجئے کہ آپ کے حق میں اس نیک نفس شخص کے دل سے کتنی دعائیں نکلیں گی جس کا گھڑا بوتے" آپ از صبح تا نصف النہار" بتاریخ ۲۵ ہر ذی الحج ۱۴۰۰ھ بمکان مولوی نادر الزماں خاں صاحب وکیل درجہ سوم' جاتے ہیں ـــ جب کبھی کوئی دعوتی رقعہ میرے ہاتھ میں پہنچتا ہے' تو سب سے پہلے میں تاریخ اور وقت اور پتہ نوٹ کرلیتا ہوں ۔ پھر دیکھتا ہوں کہ "الداعی" کون ہیں ۔ اُن کی دختر نیک اختر کی شادی خانہ آبادی ہے یا فرزند دلبند کی تقریب ولیمہ ۔ پھر رقعہ کی عبارت کو ادبی نقطۂ نظر سے جانچتا ہوں پھر اندازہ لگاتا ہوں کہ اس رنگین رقعہ کی قیمت سوا روپیہ ہے یا دو روپیہ دو آنہ ۔ پھر دیکھتا ہوں کہ رقعہ کون سے مطبع میں چھپا ہے ۔ اچھا چھپا ہے یا برا ۔ پھر لفافہ لیکر دیکھتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ "معہ فرزند" لکھا ہوا ہے کہ نہیں ـــ اس کے بعد بلند آواز سے گھر میں اعلان کرتا ہوں کہ "اجی! ہم کو پرسوں صبح دعوت ہے ۔ شریف بھی ہمارے ساتھ چلے گا ۔" جس کی تفسیر کتابوں میں یوں درج ہے کہ "پرسوں ہمارا کھانا مت پکاؤ ۔"

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دعوت میں جانا اس کو نہیں کہتے کہ ساڑھے گیارہ کو گئے دسترخوان بچھتے ہی بھوکوں کی طرح لپک کر بڑھے اور بڑھکر دسترخوان پہ جا ڈٹے' اور "دست خود دہان خود" کی تصویر بن گئے ۔ اور تناول ماحضر کے دوران میں وقفہ سے کہتے رہے کہ "گرم کھانا لائیے" ـــ "چٹنی دو" ـــ "دیکھئے اس میں گوشت نہیں ہے" ـــ "پانی !" وغیرہ ـــ اور تازہ دم بلکہ شکم سیر ہو کر ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئے ۔ اور یہ تک نہ پوچھا کہ میزبان صاحب کہاں ہیں ـــ جی نہیں ۔ اس کو دعوت میں جانا نہیں کہتے ۔ ایسا تو وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو بلا دعوت کے گھر میں گھس آتے ہیں ۔ پھر آپ میں اور ان میں کیا فرق رہا ؟ ہاں اگر آپ دعوت میں پیٹ بھرنے کی غرض سے جاتے ہیں تو یہ دوسری بات ہے ۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ۔ بلکہ میں تو مشورہ دوں گا کہ آپ دعوت سے ایک روز قبل مسہل لے لیں تو بہت بہتر ہوگا ۔

میں ایک آئیڈیل انسان ہوں ۔ میرا ہر کام باضابطہ اور قاعدہ کی رو سے ہوتا ہے ۔ میں شادی کی دعوت میں جاتا ہوں تو اس شان سے کہ شرکت محفل عقد میرے لئے لازمی ہے "تناول ماحضر" کو میں اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ جوڑ

بادام اور مصری لوٹنے کو اس وقت کی کیفیت دیکھ کر مجھے اپنے سارے رنج و غم بھول جاتے ہیں۔ کیا بڑا کیا چھوٹا، کیا جوان، کیا ضعیف، سب اس طرح ایک کے اوپر ایک گرتے ہیں کہ مزا آجاتا ہے "احمد کی ٹوپی محمود کے سر" جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا مضمون ہوتا ہے۔ کتنی بدنصیبی ہے کہ اس وقت کی کیفیت کو کسی مصور نے اب تک اپنے موقلم کی جنبش کا منت کش نہ بنایا۔ (چغتائی صاحب اس طرف توجہ کریں!) ورنہ یہ ایک موضوع کسی مصور کو مانی و بہزاد کی صف میں لا کھڑا کرنے کو کافی سے زیادہ ہے۔ مجھے وہ دن ہرگز نہ بھولے گا جب کہ نکاح کے بعد بادام مصری لوٹنے کے دوران میں ایک بزرگ کی "بقدر ایک مشت و چار انگشت داڑھی گڑبڑ میں میرے ہاتھ میں آگئی تھی اور میں نے اسے جلدی سے یوں چھوڑ دیا تھا گویا جلتا ہوا کوئلہ ہے۔ اور اس بزرگ فرشتہ صفت نے اپنی اس سفید داڑھی کے لئے بادام و کھجور کے نقصان کو گوارا نہ فرمایا تھا۔ مگر یہ تو ایک اتفاق تھا (میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میرے عزم کو اس میں بالکل دخل نہ تھا) اور ایسے اتفاق بار بار نہیں پیش آتے۔

مطلب کہنے کا یہ کہ جب آپ کو رقعہ ملتا ہے تو دعوت میں ضرور جائیں۔ اور محفل عقد میں شریک ہوں بادام مصری لوٹیں اور دھول دھپے کھائیں۔ اور دسترخوان پر بیٹھنے میں جلدی نہ کریں۔ اور تاخیر بھی نہ کریں کہ لوگوں کو گمان ہونے لگے کہ یہ شخص دو لہا کے بے تکلف دسترخوان پہ ڈٹنے کے لئے پیٹ پر پتھر باندھ کر انتظار کر رہا ہے

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو صرف میں ایک بار دعوت میں دیر سے گیا۔ اُس روز کا واقعہ یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ پڑھنے والے اس سے سبق حاصل کریں۔ جمعہ کا دن تھا۔ سوا نو بجے بیدار ہوا۔ نہانا دھونا تھا۔ پکار کر کہا "پانی گرم کرو" اور لوٹا اٹھا کر اس مقام کی طرف خراماں خراماں چلا جہاں اکثر بیں افسانوں کے پلاٹ سوچا کرتا اور انعامی معمے حل کیا کرتا ہوں۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد وہاں سے نکلا۔ اور پوچھا۔

"پانی گرم ہوگیا؟ ارے بھئی جلدی کرو۔ دعوت میں جانا ہے۔"

یہ کہہ کر کمرہ میں داخل ہوا۔ یکایک کچھ خیال دل میں آیا۔ باہر آیا۔ اور پکارا۔

"شریف! شریف کہاں ہیں؟ ——— چلو بیٹا۔ تیار ہو جاؤ۔ دعوت میں جانا ہے۔"

کمرے میں جا کر الماری کھولی۔ کپڑے نکالے۔ اور کھونٹی پر ٹانگ دئیے۔ پھر آواز دی۔

"اجی! ادھر آؤ۔ ذرا اس پائجامہ میں ازار بند تو ڈال دو ——— پانی حمام میں رکھدیا ہے بھئی دیر ہو رہی ہے دعوت میں جانا ہے۔"

سیفٹی ریزر سے جلدی جلدی داڑھی مونڈ کر حمام میں داخل ہوا۔

"صابون کہاں ہے؟ اری جلدی ــــ افوہ! بہت گرم ہے جی۔ ٹھنڈا پانی لاؤ۔ جلدی۔ دعوت میں جانا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد آواز دی۔

"دلپسند! اری او دلپسند! چل۔ ذرا پیٹھ رگڑ دے ــــ بس بس تولیہ کہاں ہے؟ سلیپر لے آ۔ جلدی۔ آئی؟ دعوت میں جانا ہے۔"

غسل کے بعد جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہدایات بھی دیتا رہا۔

"ہاں۔ ذرا ٹوپی پہ برش تو پھیر دو ــ دلپسند! چل جوتہ پونچھ ــ چائے لاؤ ــ تیار ہو گئے بیٹا؟ 'ٹرپ' 'ٹرپ' 'ٹرپ'! ــ چلو بیٹا۔ چلو۔ افوہ! گیارہ بج گئے۔ چھڑی لاؤ چھڑی۔ رقعہ جیب میں ہے نا؟ چلو"

راستہ میں ننھے شریف سے آداب مجلس کے متعلق چند باتیں کہنا مناسب سمجھا چنانچہ کہنے لگا۔

"دیکھو بیٹا۔ وہاں شرارت مت کرو۔ وکیل صاحب باہر نظر آئیں گے۔ اُن کو جھک کر سلام کرو۔ اِدھر دیکھو۔ یوں اس طرح۔ اچھا؟ ــ اور دسترخوان پر بیٹھو تو تمیز سے۔ کھانا نیچے مت گراؤ۔ اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ اور یہ دیکھو۔ جس ــ "

"ابا! ویسا پتنگ دلاؤ۔ سلیمان۔ سلیمان۔ میرا پتنگ پھٹ گیا ہے۔ سلیمان پتنگ لوں گا ہاں"۔

دسترخوان پر جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لو۔ سنا؟ اور بار بار پانی مانگنا اچھا نہیں۔ ہاں نوالہ حلق میں اٹک رہا ہو تو جب مانگ سکتے ہو ــ اور میں یہ کئی بار کہہ چکا ہوں کہ پانی پیتے وقت حلق سے غٹ غٹ کی آواز مت نکالو۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ جانوروں کی طرح آوازیں نکالنا لوگوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور ہاں خوب یاد آیا ــــ"

"ابا۔ وہ دیکھو۔ چنو آ رہا ہے۔ چنو! چنو! کہاں سے آ رہے ہو؟ ہم دعوت میں جا رہے ہیں۔ وہ میرا لٹو کہاں ہے؟ کل ضرور مدرسہ میں لانا۔ بھولنا مت"

"شریف! چلو۔ بری صحبت چھوڑ دو بیٹا۔ ؎ صحبت صالح ترا صالح کند ۔ صحبت طالح ترا طالح کند۔ اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر قمیص سے مت پونچھنا ــ ابے ادھر کیا دیکھ رہا ہے؟ ایسا تھپڑ ماروں گا کہ منہ پھر جائے۔ نالائق!"

اسی طرح اپنی گراں مایہ نصائح کو بیکار جاتا دیکھ کر میں چپ ہو گیا۔ اور چھڑی ہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ نہیں معلوم وکیل صاحب کیا کہتے ہیں۔ دیر ہو گئی ہے۔ طنز سے کہیں گے "بہت جلدی آئے رخصت آپ!" میں مسکرا کر کہوں گا "جی ہاں۔ آج ذرا دیر ہو گئی معاف فرمائیے۔ جمعہ کا دن ہے غسل وغیرہ سے فارغ ہونا پڑتا ہے"— "یہ آپ کے صاحبزادے ہیں؟"— "جی ہاں! شریف بیٹے۔ وکیل صاحب کو سلام کرو" "جیتے رہو۔ لائق باپ کا لائق بیٹا۔ آہاہاہا!— دسترخوان تیار ہے۔ چلئے۔ ادھر! ادھر!" طعام کے بعد کہیں گے "یہ لیجئے۔ پان۔ سگریٹ بھی لیجئے— بڑی زحمت ہوئی آپ کو۔ معاف فرمانا"— جی نہیں۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ بڑی مسرت ہوئی— دولہا میاں اوپر ہیں گانا ہو رہا ہے!"

گلی میں مڑا تو چند لوگ پھاٹک سے غصہ میں نکلتے نظر آئے۔ میں نے سوچا۔ شاید انتظام اچھا نہیں تھا کباب ہے تو چٹنی غائب۔ کھیر ہے تو مزعفر ندارد کا حساب تو نہیں؟ بریانی اچھی نہیں پکی تھی؟ یا ان کے ساتھ دسترخوان پر برا سلوک ہوا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ناظم صاحب کے لئے ایک علیٰحدہ دسترخوان ہے تو اہلکاروں کے لئے ایک معمولی دسترخوان— ایک بات ہے جو یہ لوگ غضبناک نظر آرہے ہیں؟— پھاٹک کے باہر ایک دوست ملے۔ پوچھا "اب آرہے ہو؟" میں نے کہا "ہاں۔ دیر ہو گئی۔ وکیل صاحب پوچھ رہے تھے؟" اس نے کہا "نہیں۔ مگر اب آنے سے کیا فائدہ؟ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "بھئی کیا بات ہے میرے دماغ میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ اپنا مطلب صاف صاف بیان کرو" اس نے کہا "بریانی ختم ہو گئی!"

اس دن کے بعد سے میں دعوت میں کبھی دیر سے نہیں گیا۔

غزل

از

(حضرت فروغ مرحوم)

نہ بیٹھے ہم کسی شب اس مہ کامل کے پہلو میں
رہا یہ داغ حسرت کا ہمارے دل کے پہلو میں

الٰہی! چٹکیاں لیتا ہے کوئی دل کے پہلو میں
کہیں بیٹھے نہ ہوں وہ دشمن جاہل کے پہلو میں

جگر اس طرح سے بے تاب ہے اس دل کے پہلو میں
کہ بسمل ہو تڑپتا جس طرح بسمل کے پہلو میں

بنی کوئے حسیناں میں پس مردن مری تربت
مجھے منزل ملی فردوس کی منزل کے پہلو میں

رہا جب نیم کشتہ خنجر ابروئے قاتل سے
لگایا چرخ نے تیر قضا بسمل کے پہلو میں

پس مُردن لحد میں اشک یوں آنکھوں سے جاری ہیں
رواں جس طرح دریا ہو کسی ساحل کے پہلو میں

ہوئے شوق شہادت میں خوشی سے سر بکف ہم بھی
نظر آیا اگر خنجر کسی قاتل کے پہلو میں

الٰہی! موت دے دل اور جگر سے تنگ آیا ہوں
یہ ایذا روح کو دیتے ہیں دونوں مل کے پہلو میں

فلک پر مجھ کو شمشیر مہ نو یوں نظر آئی
کہ جیسے تیغ بُراں ہو کسی قاتل کے پہلو میں

گیا تیغ ادا سے نیم کشتہ کر کے جب قاتل
قضا رونے لگی بیٹھی ہوئی بسمل کے پہلو میں

کھڑا رویا کیا محفل میں مثل شمع میں شب بھر
عدو بیٹھا رہا اس رونق محفل کے پہلو میں

ہوا جب وصل دلبر جان نکلی فرط شادی سے
پہنچ کر غرق کشتی ہو گئی ساحل کے پہلو میں

تمنا وصل کی اس میں ہو اس میں رنج فرقت کا
الٰہی! اور اک دل دے مجھے اس دل کے پہلو میں

وہ عرض وصل پہ ہو کر خفا پہلو سے جب اٹھے
تمنائیں لگیں رونے گلے مِل مِل کے پہلو میں

فروغ آسان نہیں ہے داغ فرقت دل پہ کھا لینا
نہ بیٹھو تم کسی رشک مہ کامل کے پہلو میں

شعراء عرب

ابی الفضل بدیع الزماں الھمدانی

از

جناب محمد عبدالمجیب صدیقی (عثمانیہ)

عیسیٰ ابن ہشام بیان کرتا ہے کہ "ایک دفعہ مجھ کو سفر نے ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں وہ مجھ کو لیجانا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں ملک جرجان کی انتہائی سرحد تک پہنچ گیا میں نے حوادث زمانہ کے مقابلہ کے لئے جاگیر سے مدد چاہی۔ وہاں ایک مکان تعمیر کیا اور اپنے مال و متاع کو تجارت میں لگا دیا میں نے اپنی دوکان رفقا سفر کے لئے کھولدی اور ان کو اپنا ساتھی بنا لیا (مطلب یہ ہے کہ مسافروں کو اپنی دوکان سے حتی الامکان آرام و آسائش کی سہولتیں بہم پہنچاتا) میں صبح و شام گھر جاتا اور باقی وقت دوکان پر ہی گذارتا۔"

"ایک دن ہم عربی اشعار اور شعراء عرب کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ ایک نوجوان جو قریب ہی بیٹھا ہوا تھا ہمارے پاس آیا۔ وہ خاموش سن رہا تھا گویا کہ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور خاموش تھا گویا وہ لاعلم ہے یہاں تک کہ ہماری گفتگو نے آخر کار اس کو ہماری طرف متوجہ کر ہی لیا جب ہماری یہ گفتگو بڑھی اور جھگڑے کی نوبت آپہنچی تو اس نوجوان نے کہا کہ 'تم اب انگور کے خوشہ تک پہنچ گئے ہو'' (تم نتیجہ تک پہنچ گئے ہو" اور تم ٹھکانے پر آگئے ہو) اگر میں چاہتا تو بات کرتا اور تم کو فیض پہنچاتا اگر میں کہتا تو تم کو سیراب کر دیتا'' (کوئی تشنگی باقی نہ رہتی)" اور وہ بات تم پر ظاہر کر دیتا کہ بہرا تک سنتا اور پہاڑی ہرن تک اتر آتا''

"جب اس نے یہ باتیں کہیں تو میں نے کہا کہ اے فاضل قریب آ! تو نے ہم کو آرزومند کر دیا ہے اور جس بیان کی تو نے اتنی تعریف کی وہ ہم کو سنا، وہ قریب آیا اور کہنے لگا کہ "مجھ سے سوال کرو کہ میں جواب دوں اور سنو کہ متعجب کر دوں''

"ہم نے کہا کہ امرؤالقیس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے، جواب دیا کہ وہ پہلا شخص ہے جو شہروں

اور میدانوں میں کھڑا رہا (شہروں کی ویرانی پر آنسو بہانے والا، جنگلوں اور میدانوں کی تصویر کھینچنے والا وہ پہلا شخص تھا) "وہ اتنی صبح نکلا کہ ابھی پرندے اپنے اپنے گھونسلوں ہی میں تھے گھوڑے کی تعریف اس کے کل صفات کے ساتھ کی اس نے شعر بطور کسب کبھی نہ کہا اور نہ اس نے مال کی رغبت کی ....

"ہم نے کہا کہ 'تم نابغہ کے متعلق کیا کہتے ہو، کہا کہ 'جب غصہ میں آتا ہے تو گالیاں دیتا ہے جب محبت کرتا ہے تو تعریف کرتا ہے جب ڈرتا ہے تو معذرت چاہتا ہے جب تیر مارتا ہے تو نشانہ پر ہی مارتا ہے (جس مطلب سے شعر کہتا ہے اس کو حاصل ہی کر کے چھوڑتا ہے)"

"ہم نے کہا کہ "زہیر کیسا شاعر تھا، کہا کہ 'وہ شعر کو پگھلاتا ہے اور شعر اس کو پگھلاتا ہے (وہ شعر نہایت ہی آسان کہتا ہے اور اس کے اشعار اس کو خود متاثر کر دیتے ہیں) جب وہ کلام باندھنا چاہتا ہے تو اس کو سحر بیانی جواب دیتی ہے (وہ سحر بیان شاعر ہے)"۔

"ہم نے دریافت کیا کہ 'طرفہ کے متعلق کیا کہتے ہو، تو کہا کہ وہ اشعار کا آب وگل ہے وہ قافیوں سے بھرے ہوئے خزانوں کا مالک ہے وہ مر گیا مگر اس کے پوشیدہ خزانے کسی پر ظاہر نہ ہو سکے اور اس کے خزانوں کے قفل نہ کھلے"۔

"ہم نے کہا کہ 'جریر و فرزدق کے متعلق کیا کہتے ہو ان دونوں میں کون سبقت لے گیا ہے، اس نے کہا کہ 'جریر رقیق تر اشعار کہتا ہے اور لطیف و کثیر المعنیٰ الفاظ استعمال کرتا ہے فرزدق ٹھوس اور شان و شوکت سے بھرے الفاظ استعمال کرتا ہے اور فخر و مباہات میں مشہور ہے۔ جریر ہجو کرنے میں سب سے زیادہ تکلیف دینے والا ہے اور کارنامے بیان کرنے میں سب سے زیادہ شریف ہے فرزدق قصیدہ کہنے میں سب سے آگے ہے اور نسباً شریف الخاندان ہے جریر جب غزل کہتا ہے تو غمگین کر دیتا ہے جب عیب بیان کرتا ہے تو ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے اور جب تعریف کرتا ہے تو بلند مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے اور فرزدق جب فخر کرتا ہے تو پورے طور پر کرتا ہے جب حقارت سے دیکھتا ہے تو عیب لگاتا ہے اور جب وصف بیان کرتا ہے تو کافی طور پر بیان کرتا ہے"۔

"ہم نے کہا کہ 'شعراء متقدمین و شعراء متاخرین کے متعلق کیا خیال رکھتے ہو تو کہا کہ 'متقدمین عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور معنیٰ میں ان کا بڑا حصہ ہوتا ہے (عمدہ اور کثیر المعانی الفاظ استعمال کرتے ہیں) متاخرین صنعت شعری کے لحاظ سے لطیف تر ہیں اور بندش الفاظ کے لحاظ سے رقیق تر"۔

ہم نے کہا کہ کاش ہم تیرے اشعار سنتے اور تو ہم کو اپنے حالات سے آگاہ کرتا! تو کہا "اچھا!

ان دونوں کو ایک ہی جگہ سن لیجے، اشعار پڑھنا شروع کیا۔"

۱۔ "اما ترونی اتغشی طمراً ممتطیاً فی الضرّ امراً مرّاً	(۱) کیا مجھ کو نہیں دیکھتے ہو کہ پرانی چادر اوڑھے ہوئے ہوں اور تنگدستی اور امر تلخ مجھ پر سوار ہے"
۲۔ مضطبناً علی اللیالی غمراً ملاقیاً منہا صروفاً حمراً	(۲) میں اپنی بغل میں حوادث زمانہ سے کینہ دبائے رکھتا ہوں کہ ان حوادث سے مجھ کو شدید مصائب ملنے والے ہیں۔
۳۔ اقصی امانی طلوع الشعری فقد عنینا بالامانی دھراً	(۳) میری انتہائی آرزو یہ ہے کہ گرمیوں کا ستارہ شعریٰ نکل آئے ہم کو امنگ نے ایک زمانہ تک تکلیف پہنچائی ہے
۳۔ وکان ھذا الحر اعلی قدراً وماء ھذا الوجہ اغلی سعراً	(۴) یہ شریف آدمی بلند مرتبہ والا تھا اور اس کی آرزو گراں قدر تھی۔
۴۔ ضربت للسراء قباً خضراً فی دار دارا وایوان کسری	(۵) میں نے اپنی خوش حالی کے زمانے میں قصر دارا اور طاق کسریٰ پر سبز خیمے نصب کیے تھے۔
۵۔ فانقلب الدھر لبطن ظھراً وعاد عرف العیش عندی نکراً	(۶) پس زمانہ بدل گیا اور بہتر عیش میرے پاس قبیح ہوگیا
۶۔ لم یبق من وفری الا ذکراً ثم الی الیوم ھلم جراً	(۷) میری اس دولت وافر میں سے سوائے ذکر کے اور کچھ باقی نہ رہا اور اسی طرح رفتہ رفتہ میں اس حال پر پہنچا ہوں
۷۔ ولا عجوز لی بسر من رای وافرخ دون جبال بصری	(۸و۹) اگر وہ بڑھی (ماں) سر من رای میں نہ ہوتی اور بصریٰ کے پہاڑ کے درے بچے نہ ہوتے اور ان کا زمانہ تکلیف و
۸۔ قد جلب الدھر علیھم ضراً قتلت یا سادة نفسی صبراً"	تنگ دستی اور فقر و فاقہ میں نہ گذرا ہوتا تو میں اے سردار اپنے آپ کو مار ڈالتا۔"

عیسیٰ ابن ہشام نے کہا کہ جو کچھ میسر آیا میں نے اس کو دیا وہ ہمارے پاس سے پھرا اور چلا گیا میں اس کے متعلق نفی کرتا تھا پھر اثبات کرتا تھا انکار کرتا تھا گویا میں اس کو جانتا ہوں اس کے سامنے کے دونوں دانتوں نے میری رہبری کی اور میں اس کو پہچان لیا تب میں نے کہا کہ قسم ہے خدا کی کہ وہ تو الاسکندری ہے کہ ہم سے بچپن میں جدا ہوا تھا اور اب بڑی عمر میں قوی و مضبوط ملا، اس اعتبار سے میں اس کے نقش قدم

پر چلا پھر میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے شانے کو پکڑا اور کہا کیا ابو الفتح نہیں ہے کیا تو نے بچپن میں ہمارے ساتھ تربیت نہیں پائی اور کئی سال تک ہم میں رہا مگر من رائی میں کون بڈھیا ہے، تو ہنسا اور کہا :

۳ۂ ویحک ہذا الزمان زور — (۱) افسوس ہے اس جھوٹے زمانہ پر دھوکہ تجھ کو غافل
فلا یغرنک الغرور — نہ کردے ۔

۴ۂ ولا تلتزم حالۃ ولکن — (۲) ایک ہی حال پر نہ رہ بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ تو بھی
در باللیالی کما تدور — اپنی حالت بدلتا رہ ۔

غزل

از

جناب مرزا اسد اللہ بیگ صاحب حیدرؔ

علاجِ وحشتِ دل کر نہیں سکتا قدم میرا
الٰہی تنگیٔ صحرا سے گھبراتا ہے دم میرا

وفورِ لذتِ آزار کی شادی سے زندہ ہوں
رہے کیونکر نہ بعد مرگ کا عالم کو غم میرا

گئے وہ دن کہ کچھ آیا تھا مجھ کو لطف جینے کا
مری ہستی پہ اب ہر صبح ہنستا ہے عدم میرا

دعائے زود فرو کس وقت میرے دل سے نکلی تھی
وہ کہتے ہیں پسند آیا کچھ اندازِ ستم میرا

ہوائے تلخ کامی سرد کر دیتی ہے دل زارا!
ابھر کر ڈوب جاتا ہے جو آتا بھی ہے دم میرا

زبس ممنون ہے دیوانگی کی زندگی میری
تماشا دیکھنا اہلِ جہاں کھاتے ہیں غم میرا

میں سرمستِ دو جامِ نرگسِ ساقی ہوں اے حیدرؔ
تہی دستی سے ہو سکتا نہیں کچھ کیف کم میرا

از

جناب محمد سرفراز علی ہوش متعلم جامعہ عثمانیہ

میرے رحمدل مقدس باپ آپ مجھے معاف کریں میں اپنے قصور پر اشک ندامت بہاتی ہوں۔ میرے شوق کی چیزیں جس کو میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی میری تمام خوشنما چڑیاں پنجرے سے باہر نکل گئیں تھیں انہی کے پکڑنے میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ ورنہ ایسی غلطی مجھ سے کبھی نہ ہوتی۔ پاک مریم کا واسطہ دیتی ہوں۔ اس مرتبہ آپ مجھے معاف کریں آیندہ پھر کبھی ایک منٹ کی بھی دیری نہ ہوگی۔

پادری ڈیڈل، ایک پیورٹن[1] قصبہ کے پیورٹن چرچ کا بہت ہی متقی پرہیزگار اور سخت گیر پادری تھا۔ ہر اتوار کو قصبے کے جملہ ساکنین کی چرچ میں حاضری بہت ہی ضروری اور لازمی تھی۔ اور جو عمداً نہیں آتے تھے ان کے لئے سخت سے سخت سزا پادری تجویز کر کے قصبہ کے گورنر کے پاس روانہ کر دیتا اور پھر اس کے قصور کے لحاظ سے اس پر فرد جرم لگائی جاتی تھی۔

ہسٹر پرائین! افسوس ہے کہ تمہارا جرم بہت ہی سنگین ہے۔ اول تو تم بہت دیر سے چرچ میں آئیں۔ دوسرے چرچ کے اندر ایسی ہانپتی کانپتی اور بھاگتی ہوئی آئیں کہ جملہ حاضرین اور سامعین کے روحانی خلوص میں مخل ہوئیں اور سب کے خیال کے انتشار کا باعث ہوئیں۔ لہذا تم پر دو جرم عاید رکھے جاتے ہیں اور مفصل رپورٹ قصبے کے حاکم کے پاس روانہ کر دیجاتی ہے۔ میں کوئی سزا تمھارے لئے تجویز نہ کروں گا۔ یہ تمھاری قسمت اور گورنر کی طبیعت پر ہے کہ تم کو بلا سزا ہی کے رہا کر دے۔

---

[1] پیورٹن عیسائیوں کا ایک مشہور فرقہ ملکہ الزبتھ کے عہد میں اور اسٹورٹ بادشاہوں کے زمانہ میں اپنی بہت ہی سخت مذہبی زندگی کے لئے مشہور تھا۔ جو ادنی سے ادنی جرائم کے ارتکاب پر بہت ہی سخت اور نظارہ سوز سزائیں دیتا تھا۔

ہسٹر پرائین | ایک نوجوان مہ وش تھی جس کی اداؤں میں سحر اور جس کی مخمور گلابی آنکھیں مرغ دل کے لئے دام فریب سے کہیں بڑھکر تھیں پتلی سی کمر۔ خمدار اور گھنے ابرو۔ پتلے پتلے ہونٹ متوسط قد۔ ان تمام خوبیوں سے بڑھکر اس کی مستانہ چال اور سادہ لباسی کی وہ دلفریبی تھی کہ تمام قصبے کے لوگ ملکہ حسن کے لقب سے پکارا کرتے تھے
ہسٹر پرائین، میرے اچھے پادری کہہ کر اس کے سامنے دوزانو ہو گئی اور کہنے لگی اس دفعہ رپورٹ بھی نہ کیجائے آیندہ سے وہ بہت ہی احتیاط برتیگی۔

ڈیمیڈیل پادری اس کے انداز معشوقانہ اور بلا ایک فریب حسن سے ضرور مسحور ہو گیا تھا۔ مگر زمانے کے رسم و رواج سے مجبور تھا۔ ہاتھ اس کے خلاف اس کی شکایت لکھ رہے تھے۔ مگر دل اس مست شباب کا نخچیر بنا ہوا تھا۔ اور اس کے اس ظلم و ستم پر نفرین کر رہا تھا۔ عجب کشمکش کے عالم میں مجبوراً اس کو رپورٹ لکھنا ہی پڑی۔

(۲)

ہسٹر پرائین | دوسروں کی عبرت کی خاطر سربازار رسوا کی گئی۔ اس کی پھول جیسی نازک کلائیوں میں آہنی زنجیریں ڈالی گئیں۔ اور ایک شکنجہ میں جکڑ کر کھڑی کر دی گئی۔ اس کی پیٹھ پر یہ تختی لگا دی گئی "کہ جو اتوار کو نماز میں دیر سے آتا ہے اس کی یہی سزا ہو گی" پادری ڈیمیڈیل کا اتفاق سے اس طرف گذر ہوا ہسٹر دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سرتاپا پسینہ میں غرق تھی۔ اس کے سرخ سرخ شاداب رخسار نے آفتاب کی تمازت سے پژمردہ ہو کر سیب کی رنگت اختیار کر لی تھی۔ زبان پیاس سے باہر نکلی پڑتی تھی۔ گردن نیچے ڈھلک گئی تھی۔ پادری کو اب ضبط نہ ہو سکا وہ بے اختیار ہو کر اپنے اختیارات سے ہسٹر کو شکنجہ سے نکالا اس کی حلق میں پانی ٹپکایا۔ اور ہسٹر کو اس کے مکان پہنچا دیا۔

(۳)

ایک دن ہسٹر پرائین قصبے کے باہر دریا کے کنارے اپنے گون اور دوسرے کپڑے دھو رہی تھی کہ اس طرف پادری صاحب نکل آئے ہسٹر پرائین شرم سے عرق عرق ہو گئی۔ اور سب سے بڑھ کر خوف سے لرزنے لگی اس لئے کہ قصبے میں یہ بھی حکم نافذ تھا کہ "اگر کسی عورت کا کوئی گون یا اور کوئی پوشیدہ لباس کبھی کسی مرد کو کہیں پر بھی اسکے جسم سے علٰحدہ نظر آجائے تو وہ قابل دست اندازی قانون ہے اور اس کا چالان بھی حاکم قصبہ کے پاس ہو گا اور وہ مستوجب سزا ہو گی"۔ پادری صاحب ہسٹر سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا چیز دھوئی جارہی ہے۔ ہسٹر کی آواز خوف سے بند ہو گئی۔ اور وہ اس نیم عریانی کی حالت میں جنگل کی طرف بھاگی۔ پادری

اس کا تعاقب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک گھنی جھاڑی میں جاکر مسٹر پریشان ہوگئی۔ اور کانٹوں سے الجھ کر نیچے گر پڑی۔
پادری صاحب اور مسٹر آرائین جب دونوں جھاڑی سے باہر نکلے ہیں تو شرم گناہ سے دونوں کی نظریں نیچی تھیں۔

(۴)

پوشیدہ طور پر مسٹر آرائین اور پادری صاحب میں دن بدن محبت کی پینگیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ اور قدرت کے مقررہ وقت پر مسٹر آرائین جو قصبے میں بالکل یکہ و تنہا رہتی تھی ایک لڑکے کی ماں کہلانے لگی۔ اتنا بڑا سنگین جرم ہرگز چشم پوشی کے قابل نہ تھا۔ گورنر خود بہ نفس نفیس واقعہ کی تفتیش کے لئے آیا۔ ہزار طریقہ سے پوچھا گیا۔ مگر واہ رے مسٹر آرائین بچہ کے گمنام باپ کا نام نہ بتلانا تھا نہ بتلایا۔ مجلس شوریٰ میں نومولود معصوم بچہ کی صورت دیکھ کر مسٹر کے متعلق صرف یہ سزا تجویز ہوئی کہ قصبے کا کوئی شخص اس سے نہ ملے بلکہ اس کے سایہ سے بھی گریز کرے اور ایک تختی پر زانیہ لکھ کر اس کے گلے میں لٹکا دیا جائے جس کو وہ کسی وقت بھی اپنے گلے سے جدا نہ کرے۔ مکان میں اور مکان سے باہر بھی جہاں کہیں وہ جائے وہ تختی اس کے گلے میں حمایل رہے تاکہ لوگ دیکھیں اور ایسے اخلاق شکن اور حیا سوز گناہ سے احتراز کریں۔

(۵)

مسٹر آرائین کا شوہر ایک جہاز پر ڈاکٹر تھا۔ جب وہ وطن واپس آرہا تھا تو ایک مقام پر ایک وحشی قبیلہ نے جہاز پر یورش کی۔ اور خوب لوٹا اور لوگوں کو پکڑ کر اپنے جزیرہ میں قید کر لیا۔ سات سال بعد وہ اپنے قصبہ میں واپس آیا لوگوں کی زبانی اس تازہ واقعہ کی اطلاع ملی۔ ڈاکٹر کی حالت وصورت وحشی قبایل میں رہنے سے بالکل بدل گئی تھی۔ اس کے بال بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ کسی صورت سے بھی وہ پہچانا نہ جاسکتا۔ اور یہاں قصبے بھر میں یہ شہرت پھیل گئی تھی کہ ایک بہت ہی قابل ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ جو جنگلی جڑی بوٹیوں سے بہت لاجواب علاج کرتا ہے۔ ہفتہ بھر سے مسٹر کا نومولود بچہ شدید بخار میں بھن رہا تھا۔ مسٹر بچاری ماماتا کی ماری ڈاکٹر کے مکان پر ایک رات جب بچہ کی حالت بہت خراب ہوگئی تو وہ دوڑی ہوئی سراسیمہ و پریشان ڈاکٹر کے گھر آئی اور بہت منت وسماجت سے استدعا کی کہ وہ ایک نظر چل کر بچہ کو دیکھ لے۔ ڈاکٹر نے مسٹر کو پہچان لیا اور کہنے لگا کہ چلتا تو ہوں مگر ذرا تم میری انگشتری اور صورت کو بغور دیکھو۔ مسٹر آرائین کی نظر جوں ہی انگوٹھی پر پڑی وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر مسٹر کو ہوش میں لایا اور کہنے لگا او مکار دغاباز ریاکار عورت کیا نکاح کے وقت مقدس پادری کے سامنے اسی دن کے لئے حلف اٹھایا تھا۔ اچھا لے تو بھی مزہ چکھ لے۔ یہ کہہ کر

پستول کی نالی پیشانی سے لگادی مگر پھر خود ہی ہاتھ روک لیا اور کہنے لگا صرف تیرا ہی نہیں بلکہ تیرے ساتھی سے بھی انتقام لونگا ۔اچھا چل تیرے بچہ کو دوا دیتا ہوں ۔

(۶)

ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد ہسٹر رات کی تاریکی میں پادری ڈیمیڈیل کے پاس افتاں وخیزاں پہنچی اور پورا واقعہ سنایا کہ اس کا گم گشتہ شوہر سات سال بعد پھر اسی قصبے میں وارد ہوگیا ہے ۔ پادری کی اور ہسٹر کی دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ کسی نہ کسی طریقہ سے آیندہ ہفتہ "اسٹار" نامی تجارتی جہاز پر چھپکر نکل بھاگیں اور پھر اس وقت ہمارے ارادوں میں کوئی بھی مزاحمت کرنیوالا باقی نہیں رہے گا ۔ یہ کہہ کر پادری نے ہسٹر کو اپنی آغوش محبت میں لے لیا ۔اور ہونٹوں پر ایک دلی کی مہر ثبت کرنا چاہتا تھا کہ پیچھے کھڑکی سے ایک بڑا سیاہ بے ترتیب بالوں کا جھنڈدار چہرہ نمودار ہوا ۔اور پکار کر کہنے لگا کہ "ہاں" "میں تمھارے ارادوں کا توڑنے والا ہوں گا اور کبھی تم کو اطمینان کی نیند سونے نہ دوں گا" ۔ہسٹر کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی وہ بیہوش ہوگئی اور پادری نے فوراً پستول سے اس پر فیر کیا ۔مگر گولی پہنچنے سے پیشتر وہ سیاہ ہیبتناک انتقامی چہرہ غایب ہو چکا تھا ۔

(۷)

پادری ڈیمیڈیل کی حالت دن بدن ردی ہوتی گئی ۔ اختلاج قلب اس کو آٹھوں پہر رہنے لگا ۔ایک اتوار کو پادری صاحب نے نہایت ہی فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا ۔ اور دنیا کی بے ثباتی پر بہت ہی پرمغز اور دلسوز لکچر دیا ۔اور یہ بھی کہا کہ شاید یہ خدمت میری آخری خدمت ہو ۔ اس لئے کہ میں اختلاج قلب سے بہت کمزور ہوگیا ہوں اور اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں ۔بہت سے لوگ جن کو پادری صاحب سے حد درجہ کا حسن عقیدت تھا رونے لگے اور اس کی صحت و سلامتی کی دعا مانگنے لگے ۔

(۸)

تمام قصبے بھر میں پادری صاحب کے گذشتہ وعظ کا تہلکہ مچا ہوا تھا ۔ اس مرتبہ حسب الطلب پھر سب لوگ جمع کئے گئے ۔اور قصبہ کا گورنر بھی بلایا گیا ۔تھوڑی دیر میں پادری صاحب ایک دم منظر عام پر ہسٹر کا ہاتھ پکڑ کر اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے ۔اور پبلک سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ جو ہسٹر کو سزا ملی ہے اس سے زیادہ کا میں مستحق ہوں ۔میں نے جیسی بھی ریاکاری غداری آپ لوگوں کے ساتھ کی ہے ازالہ ناممکن ہے ۔اس بچہ کا باپ میں ہوں ۔پبلک اس حیرت انگیز انکشافات سے آئینہ حیرت بنی ہوئی تھی اور جس دن

ہسٹر کو زانیہ کی تختی پہنائی گئی ہے ۔ اسی دن میں نے بھی اپنے سینہ پر زانی کا داغ جلتے ہوئے سرخ لوہے سے ڈال لیا تھا ۔ یہ دیکھو" یہ کہہ کر اپنا قمیص پھاڑ کر پھینک دیا اور سینہ سب کے سامنے کر دیا ۔ تھوڑی دیر میں اس پر ایک تشنجی کیفیت طاری ہوئی اور ہسٹر کے قدموں پر گر پڑا اور روتے ہوئے کہنے لگا پیاری ہسٹر مجھے معاف کرنا میں تیری وفاداری پر مثل پروانہ نثار ہوا چاہتا ہوں ۔ ابھی ہسٹر جھک کر اس کے سر کو بوسہ بھی نہیں دینے پائی تھی کہ معترف گناہ پادری کی بےچین روح قفس عنصری سے ہمیشہ کے لئے پرواز کر گئی ہسٹر کے گرم گرم آنسو اس کے چہرے پر ٹپک رہے تھے کہ ایک دم وحشی ڈاکٹر اسٹیج پر آ دھمکا اور ہسٹر کو گھسیٹ کر مجمع سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ "یہ میری بیوی تھی اس نے جو کچھ میری عدم موجودگی میں گناہ کیا ہے ۔ اس کا یہ بدلہ ہے ۔ یہ کہہ کر پستول اس کی طرف داغا ۔ گولی ہسٹر کی کنپٹی کو توڑ کر باہر نکل گئی ۔ اور ایک منٹ کے اندر تڑپتے ہوئے جسم سے اس کی روح بھی پرواز کر گئی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ میں اس روسیاہی کے ساتھ پھر اس قصبے میں زندہ رہ کر کیا کروں گا ۔ لو میں اپنا قصہ بھی تمام کیے لیتا ہوں ۔ یہ کہہ کر دل پر پستول کی نالی رکھی اور ایک سکنڈ میں اس کا لاشہ بھی ان دونوں کے بازو تڑپ رہا تھا ۔ گورنر کے حکم سے تینوں نعشوں کا جلوس ایک ساتھ نکالا گیا ۔ قصبے سے باہر بڑے شاہ بلوط کے درخت کے نیچے یہ تینوں شہیدان محبت ہمیشہ کے لئے محو خواب ہیں ۔ (ماخوذ)

حیات مومن

فخر روزگار، ہم عصر و ہم پلہ غالب حکیم مومن خان مومن کی مفصل سوانح عمری جس میں مومن مرحوم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ تحقیق اور صحت کے ساتھ مندرج ہے اور مومن کے ادق اشعار کی شرح بھی لکھی گئی ہے یہ کتاب بہار کے مشہور انشا پرداز و شاعر عرش گیاوی شاگرد تسلیم (سلسلہ مومن) کے زور قلم اور تحقیق بلیغ کا نتیجہ ہے کتاب کا طرز بیان اردو کے مشہور انشا پرداز محمد حسین آزاد کی آب حیات کا جواب ہے ۔

قیمت (عہ)

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) متصل صدر پٹہ خانہ انگریزی حیدرآباد دکن

کیفِ اضطراب

از

(جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری)

کچھ کہہ رہا ہے پردۂ محمل کا اضطراب
اے جوشِ قیس اور بڑھے دل کا اضطراب

اے کاش ایک وار میں ہو جائے فیصلہ
مجھ کو خدا دکھائے نہ قاتل کا اضطراب

اتنا اثر تو ہو کسی بسمل کی آہ میں
مڑ کر ذرا وہ دیکھ لیں محفل کا اضطراب

سیرِ چمن میں اہلِ نظر کے لئے ہے خار
گلچیں کی دست بُرد عنادل کا اضطراب

آنکھوں میں سیلِ اشک لبوں پر ہجومِ آہ
گویا سوال ہے رُخِ سائل کا اضطراب

میرے لئے تو نیم نگاہی جو ہے سو ہے
ان کی نظر میں کھیل مرے دل کا اضطراب

موجِ نفس میں کاوشِ نشتر ہے بار بار
اللہ! کیا دکھائے گا اب دل کا اضطراب

اب مجھ میں کیا رہا ہے مگر دیکھ لیجئے
کشتی شکستہ لبِ ساحل کا اضطراب

ساغر بدست، چیں بجبیں، خندہ زیرِ لب
کوکبؔ وہ دیکھتے ہیں مقابل کا اضطراب

سترھویں صدی کا ایک مشہور سائنسداں

رابرٹ بائل[1]

از

جناب سید شاہ محمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

سترھویں صدی کا آخری نصف حصہ یورپ کے ذہنی ارتقار کی تاریخ میں ایک اہم دور ہے اس وقت علوم انسانی کے ہر شعبہ میں لاادریت (SCEPTICISM) تجسس (ENQUIRY) اور اصلاح (REFORM) کی سپرٹ عمل پیرا تھی۔ اس کا اثر لندن کی رائل سوسائٹی فلورنیس میں اکاڈیمیا۔ پیرس میں اکاڈمی رائل اور برلن اکاڈیمی کی تشکیل کے طور پر ظاہر ہوا۔ کیمیا اب کوئی مقدس چیز نہ تھی (جس سے محض پادریوں کو واقفیت ہو) اہل کلیسار کی حکومت پر سائنس نے ناک بھوں چڑہائے اور اسی طرح قدامت پرستوں سے نفرت کا اظہار کیا۔ علم تجربہ اور مشاہدہ کا ایک حدتک عام رواج ہونے لگا۔ قدمار کے خیالات کے بجائے نظریوں کا چرچا ہونے لگا اور ان کے خالص استخراجی (DEDUCTIVE) طریقوں کی بجائے صحیح سائنٹفک اصول بننے لگے۔ قدیم فلسفہ یا (سائنس) کی فوقیت پر سب سے پہلے رابرٹ بائل نے حرفگیری کی اور اس کو چیالنج دیا۔

رابرٹ بائل اپنے والدین کا چودھواں بیٹا تھا۔ وہ لسمور (LISMORE) واقع آئرستان میں ۱۶۲۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ رچرڈ آئرستان کا لارڈ چانسلر تھا۔ بائل کی تعلیم (ETON) ایٹن کالج میں ہوئی اس مشہور درسگاہ میں دنیا کی اور بڑی ہستیوں کو بھی تعلیم کا موقع ملا تھا۔ بائل کے اساتذہ میں مشہور سر ہنری ووٹن (SIR HENRY WOTTON) ہے جو اس عہد کے مشاہیر علمار سے تھا۔ اور اس کو فلسفہ اور سائنس کے ساتھ ادب و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ اپنے زمانۂ اسکول کے اختتام پر رابرٹ بائل نے براعظم کی حفظ

---

[1] ROBERT BOYLE

صحت کی خاطر سیر و سیاحت کی کیونکہ وہ ہمیشہ مریض اور ناتواں رہتا تھا۔ سفر سے انگلستان کو واپسی کے وقت اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور اسی عمر میں اس نے سائنٹفک مسائل پر سنجیدہ کام شروع کر دیا۔ اپنے علمی شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ان وزیبل کالج (INVISIBLE COLLEGE) کا رکن ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی انجمن تھی جو جدید فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والوں پر مشتمل تھی۔ اس انجمن کے اجلاس لندن میں مختلف اراکین کے مکانوں پر منعقد ہوتے تھے جن میں انجمن کے اراکین "فلسفیانہ تحقیقات اور ان کے متعلقات پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ کرتے تھے"۔ لیکن بعد میں اس انجمن کے جلسے آکسفورڈ میں ہونے لگے اور بائل نے بھی ۱۶۵۴ء میں وہاں سکونت اختیار کر لی۔ آکسفورڈ میں انجمن کو خوش قسمتی سے مشہور علما کی رکنیت نصیب ہوئی جن میں قابل ذکر ولکنس (WILKINS) جان والس (J. WALLIS) سیتھ ورڈ (SETH WORD) تھامس ولس (T. WILLIS) کرسٹوفر رن (C. WREN) ہیں۔ ان علماء نے جدید فلسفہ و سائنس کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ "ان کا خیال تھا کہ معتبر علم تک پہنچنے کا کوئی موثق ذریعہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ اشیائے فطرت پر مختلف تجربات عمل میں لائے جائیں۔ فطرت کے مظاہر کی چھان بین میں انہوں نے اس طریقہ کو بڑی محنت سے استعمال کیا اور ایک دوسرے کو اپنے مشاہدات اور تحقیقات سے آگاہ کیا۔" تھوڑے عرصہ بعد ان وزیبل کالج (INVISIBLE COLLEGE) رائل سوسائٹی میں منتقل ہوا۔ خوش قسمتی سے اسے شاہ چارلس ثانی کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ۱۶۶۳ء میں اس نے اپنا منشور حاصل کیا۔ رائل سوسائٹی کے اجلاس لندن میں ہونے لگے۔ بائل نے بھی ۱۶۶۸ء سے وہیں سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۶۹۱ء میں اس کی وفات ہوئی۔

بائل ایک محنتی آدمی تھا وہ بہت شرمیلا اور سادہ مزاج تھا۔ بائل سائنس کا شوقین اور حقیقی متعلم تھا اور اپنی تمام زندگی اسی کھوج میں صرف کر دی۔ اس کا سماجی رتبہ (سوشیل پوزیشن) نہایت باوقار تھا اس کی خانگی زندگی پرخلوص تھی اور اس کے علمی تحقیقات نے اس کی شہرت میں اضافہ کر دیا اور اس کے ذاتی اثر کو بہت بڑھا دیا اور یہ سائنس کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کا تجربی کام بہت بڑا رتبہ رکھتا ہے۔ اس نے ہوائی پمپ کی ایجاد کی اور اپنے ہوائی انجن کی مدد سے اس نے گیس کے بہت سے اساسی خواص دریافت کئے جن میں سے اہم وہ رشتہ ہے جو حجم اور دباؤ میں پایا جاتا ہے۔ اور جسے علمی زبان میں عام طور پر کلیۂ بائل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور کلیۂ بائل طبعی کیمیا کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ کلیۂ بائل کو عام طور پر اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ اگر تپش مستقل ہو تو گیس کا حجم اس کے دباؤ کے

بالعکس متناسب ہوتا ہے۔ بائل نے اپنے تجربات سے یہ بھی بتایا کہ کسی مائع کا نقطۂ جوش کرۂ ہوائی کے دباؤ پر منحصر ہوتا ہے۔ کم دباؤ پر نقطۂ جوش کم ہو جاتا ہے چنانچہ اسی اصول کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیدرآباد میں پانی کا نقطۂ جوش سطح سمندر کی بہ نسبت کمتر ہوتا ہے۔ کیونکہ حیدرآباد ایک مرتفع سطح پر واقع ہے اور یہاں کرۂ ہوائی کا دباؤ کمتر ہے۔ بائل نے اپنے تجربات سے یہ بھی واضح کیا کہ آواز کی اشاعت اور رقاص کے اہتزاز پر ہوا کا اثر ہوتا ہے . . . .

. . . . ہوا آواز کی اشاعت کے لئے واسطہ کا کام کرتی ہے اس کی کثافت کی کمی زیادتی سے آواز کی رفتار پر بھی اثر پڑتا ہے۔ بائل نے شعلہ کی نوعیت کو سمجھانے کی کوشش کی اور احتراق و تنفس کیساتھ ہوا کو جو گہرا تعلق ہے اس پر تجربات کئے بائل نے نامیاتی کیمیا کی بھی تھوڑی بہت خدمت کی۔ اسی نے سب سے پہلے سیسے اور چونے کے ایسیٹیٹس (ACETATES) کو کشید کر کے ایسیٹون تیار کیا اور لکڑی کی کشید فارق کے ماحصل سے میتھل الکوہل کو جدا کیا۔ یہ طریقے ابھی تک مروّج ہیں۔

اس نے قلموں کے اشکال کے مطالعہ کو بڑی اہمیت دی۔ اس کا خیال تھا کہ اندرونی حرکات، تشکیل اور اندرونی حصص کے مقامات کا قلموں کی ظاہری شکل سے بہت تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر اس مشہور کیمیا دان کو (CRYSTALLOGRAPBY) قلموں کی ساخت (CRYSTAL STRUCTURE) کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اور آئندہ محققین کے لئے راستہ صاف تھا۔ بائل ایک بڑا ماہر تجربات بھی تھا اور اپنے تجربات کے لئے مخصوص آلات بنا لیا کرتا تھا لکچر روم کے بعض توضیحی آلات اسی کی ایجاد ہیں۔

بائل کی علمیت کثیر پہلو رکھتی تھی۔ جہاں وہ ایک عمدہ تجرباتی (EXPRIMENTALIST) تھا وہیں نظریات سے بھی اس کو دلچسپی تھی۔ طبعیات اور کیمیا کی مختلف شاخوں میں اس کو دلچسپی تھی۔ لیکن عام طور پر وہ ایک بڑے کیمیا دان کی حیثیت سے مشہور ہے اس کی یہ شہرت حق بجانب بھی ہے کیونکہ کیمیا سے اس کو بہت زیادہ شغف تھا اور اسی نے اس کو سائنس کے دیگر شعبوں کی صف میں برابر کی جگہ دلوائی۔

بائل ہی نے سب سے پہلے عنصر کے جدید خیال کو پیش کیا جو قدیم یونانیوں اور قرون وسطی کے طبی کیمیا دانوں (CHEMISTS) کے نظریات سے بالکل مختلف ہے اس کے خیال کی رو سے ارسطو کی عناصر۔ خاک، آب، آتش، باد۔ حقیقی عناصر نہیں تھے اور نہ پیراسلس (PARACELSUS) کے عناصر۔ گندک، نمک، پارہ۔ اس نام کے مستحق تھے اسی نے سب سے پہلے مرکب اور عنصر کے

تعلق کو واضح کیا اور مرکب و آمیزہ میں تفریق کی اس نے کیمیائی ترکیب کی توجیہہ کیمیائی الف (AFFINITY)
کی بنا پر پیش کی یعنی عناصر میں دیگر عناصر سے ملنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور وہ اندرونی طاقت جو ان کی
ترکیب کا باعث اور اس ترکیب میں ممد ہوتی ہے اس کو بائل نے کیمیائی الف (یا رغبت) سے موسوم کیا
اس نے اعلان کیا کہ کیمیادان کا اہم فریضہ ہے کہ مرکبات کی ماہیت دریافت کرے۔ اس طرح اس نے تشریحی
کیمیا (ANALYTICAL CHEM) کو فروغ دیا۔ بائل نے کئی کیفی تعاملات دریافت کئے اور ان کو اشیاء کی
شناخت میں استعمال کیا۔

بائل کی سب سے بڑی علمی خدمت یہ تھی کہ اس نے کیمیاء میں نئی سپرٹ کو داخل کیا اس وقت تک
کیمیاء کو علم طب کا ایک شعبہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب اس نے ایک آزاد علم کی حیثیت اختیار کر لی جس کے
اصول محض تجربات کے ذریعہ اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اور جس کا مقصد اپنے متعلقہ مظاہر کے کلیات کی دریافت
تھی۔ یونانیوں کی قدیم سائنس نے طبی کیمیاء کی شکل اختیار کی تھی اور اس کے اطراف پیراسلس نے تصوفی
غبار و بادل لگا دئے۔ بائل نے اس کو ان سب سے پاک کیا اور نئی سپرٹ کو سائنس میں جاری و ساری
کر دیا۔ اس کا اثر اختتام سترھویں صدی کے کیمیائی ادب کے عام معیار کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے
کیمیاء کی کتابیں اب صوفیانہ اور اشاراتی زبان میں نہیں تھیں بلکہ صاف اور واضح زبان میں لکھی جانے لگیں۔

۱۶۶۱ء بائل اپنی معرکتہ الآرا کتاب (THE SCEPTICAL CHM) "لاادری کیمیادان" کی اشاعت
کی وجہ سے تاریخ کیمیا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں ان "شبہات" کا بیان ہے جو پیراسلس
اور اس کے ہمنواؤں کے خیالات کے متعلق بائل کے دل میں پیدا ہوئے اور جن کی بنا پر بائل نے
تمام ماسبق خیالات کا خاتمہ کر دیا۔ اس کتاب میں بائل نے بتایا کہ قدیم علماء کے خیالات عناصر کے
متعلق نہایت ناقص ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس نے ارسطو اور پیراسلس ہر دو کی مخالفت کی۔ اس نے
بتایا کہ "عنصر" "اصول" سے مراد ابتدائی اور سادہ اجسام ہیں جن سے مرکبات کی پیدائش ہوتی ہے اور
جن میں مرکبات بالآخر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ تمام اشیاء کا مادہ چھوٹے چھوٹے
ذرات میں تقسیم ہو سکتا ہے اور ان ذرات میں حجم، شکل اور حرکت کے ہمہ گیر خواص پائے جاتے ہیں۔ ان
ذرات کی مدد سے ہم کئی مرکبات بنا سکتے ہیں۔ بائل کے متذکرہ خیالات میں ہم ڈالٹن کے نظریۂ جوہر کی پیش لفظ پاتے ہیں
الغرض بائل ایک بڑا سائنسدان تھا اور اس نے ترقی سائنس میں حتی الامکان کوشش کی اور متعلمین سائنس کسی طرح
اس کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے۔

میرزا ایرج کا مقبرہ

از

جناب محمد عبد الحمید انصاری وکیل کھٹر

میرزا ایرج میرزا عبد الرحیم خانخاناں کا فرزند کلاں تھا۔ خانخاناں کے اور دو لڑکے میرزا داراب میرزا فارن[1] تھے میرزا ایرج اور شاہزادہ[2] مراد فرزند اکبر کی تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ امرائے دربار اکبری میں ہوئی۔

اکبری جلوس کے چالیسوں سال ۱۰۰۴ھ میں جب خانخاناں دکن کی مہم پر روانہ ہوا ہے تو شاہزادہ مراد اور میرزا ایرج ہمراہ تھے۔ میرزا ایرج ہر لحاظ سے خانخاناں ثانی تھا۔

دکن میں برہانپور[3] میرزا عبد الرحیم خانخاناں کی چھاونی کا صدر مقام تھا جب ملک عنبر حبشی نے تلنگانہ میں جنگ و جدال پر کمر باندھی تو وہاں کے اکابر نے خانخاناں کو متواتر درخواستیں کمک کے لئے روانہ کیں۔ خانخاناں سے میرزا ایرج کو ملک عنبر کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا۔ بہت زبردست جنگ ہوئی ایرج نے ایسی داد شجاعت دی اور وہ نمایاں کامیابی حاصل کی کہ باپ دادا کا نام روشن ہوگیا۔ اس کامیابی نے دربار اکبری سے خطاب "بہادری" دلوایا۔ جلوس کے چالیسویں سال ۱۰۰۹ھ میں جب کہ خود اکبر نے قلعہ آسیر و برہانپور فتح کیا اور سلطان ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے پیش کش گزران کر اکبر سے رشتہ اتحاد قائم کیا تو اکبر نے سید جمال الدین حسین انجو کو عادل شاہ کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ سلطان بیگم دختر عادل شاہ کی شادی شاہزادہ دانیال[4] سے ہوجائے۔ ابراہیم عادل شاہ نے مصلحت اسی میں دیکھی اور بخوشی

---

[1] میرزا فارن کا نام خود اکبر نے رکھا تھا۔

[2] شاہزادہ مراد فرزند اکبر کا انتقال موضع شاہ پور متصل برہانپور ہوا۔

[3] برہانپور دہلی سے (۶۴۷) میل اور بمبئی سے (۳۱۰) میل ہے۔

[4] شاہزادہ مراد کے انتقال کے بعد شاہزادہ دانیال کو اکبر نے خانخاناں کے ہمراہ رکھا تھا۔ دانیال خانخاناں کا داماد بھی تھا

منظور کرلیا۔ دونوں طرف سے تیاریاں شروع ہوئیں۔

جلوس اکبری کے انچاسویں سال یعنے ۱۰۱۳ھ میں بہادر میرزا ایرج برہانپور سے شاہزادہ دانیال کی برات مع پانچہزار سپاہ وچند امراء کے لیکر احمدنگر گیا۔ شہزادہ نے جشن شادی بمقام پٹن ضلع اورنگ آباد دکن مقرر کیا تھا۔ احمدنگر سے دولہن کو لیکر بہادر ایرج پٹن پہنچا اور بعد جشن شاہانہ برات برہانپور روانہ ہوئی جب قریب برہانپور پہنچے تو چودہ ہزار سواروں کی جمعیت سے خانخاناں نے استقبال کیا اور برات لشکر شاہی میں داخل ہوئی۔

شاہزادہ سلیم ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر اپنے جلوس کے چھٹے سال ۱۰۲۰ھ میں بہادر ایرج کی شجاعت و عالی دماغی و کارگذاری سے اس قدر خوش ہوا کہ اس کو "شاہنواز خاں"[1] کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

جلوس جہانگیری کے ساتویں سال ۱۰۲۱ھ میں جہانگیر نے منصب ہزاری سے سرفراز کیا۔

جلوس جہانگیری کے آٹھویں سال ۱۰۲۲ھ میں جہانگیر نے خوش ہوکر شاہنواز خان کو بارہ ہزار سوار جرّار خوش اسپہ عنایت کئے میرزا نے ان کو لیکر بالاگھاٹ دکن کا رخ کیا۔

جلوس جہانگیری کے دسویں سال ۱۰۲۴ھ میں مہم دکن میں ملک عنبر پر ایسی فتح نمایاں حاصل کی کہ دوست دشمن شاہنواز خاں کی بہادری کا لوہا مان گئے اور ہر شخص کی زبان سے صدائے آفریں نکلی۔ جہانگیر اپنی تزک میں جابجا اس کی تعریف لکھتا اور خوشی کا اظہار کرتا ہوا ان سے آئندہ بھی جانفشانی کی توقع رکھتا ہے۔

---

[1] شہنشاہ اکبر نے میر عبدالرزاق کو شاہنواز خاں کا خطاب دیا تھا جو بعد میں صمصام الدولہ شاہنواز خان کے خطاب سے ممتاز ہوا۔ تاریخ ماثرالامرا اسی شاہنواز خاں کی لکھی ہوئی ہے جو مطبع کلکتہ میں طبع ہوئی ہے۔

جہانگیر کے عہد میں ایک اور شخص بہرام الزماں ایرانی سردار تھا جس نے جہانگیر و شاہجہاں کے زمانہ میں اعلیٰ خدمات کی بدولت بہت نام پایا تھا بہرام الزماں کا خاندان ایران میں خاص طور پر شہرت رکھتا تھا بعہد شاہجہاں بہرام الزماں کو شاہنواز خاں کا خطاب ملا تھا اور یہ شخص شاہنواز خاں صفوی کے نام سے مشہور ہوا ۱۰۴۳ھ میں شاہزادہ عالمگیر کی شادی اسی شاہنواز خان صفوی کی لڑکی سے ہوئی۔

جہانگیر نے جلوس کے تیرھویں سال ۱۰۲۷ھ میں شاہنواز خان کو فتح دکن کی خوشی میں ہزاری منصب کے ساتھ دو ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ عنایت کئے ۔

شاہنواز خان زمانہ قیام برہان پور میں دُختِ رز کا عاشق ہو گیا تھا ۔ جب دربار جہانگیری سے ۱۰۲۸ھ میں ایک اتالیق برہانپور روانہ ہو رہا تھا جہانگیر نے تاکید کی کہ سنا گیا ہے کہ شاہنواز خاں بہت شراب پیتا ہے اگر سچ ہے تو بہت افسوس ہے کہ اس عمر میں جان کھو بیٹھے گا ۔ اگر حقیقت یہی ہے تو اس کو اسی حال پر نہ چھوڑنا اگر تم اچھی طرح حفاظت نہ کر سکو تو صاف لکھو ہم حضوری میں طلب کر لیں گے ۔ اس کی اصلاح حال پر توجہ کریں گے جب اتالیق برہانپور پہنچا ۔ شاہنواز خاں کو بہت ہی نحیف پایا حاذق اطبار سے علاج کرایا طبیبوں نے بہت بہت معالجے اور تدبیریں کیں کچھ فائدہ نہ ہوا عین جوانی اور دولت و اقبال کے عالم میں اس دنیا سے ۱۰۲۹ھ میں سفر آخرت کیا ۔

برہانپور میں اتونی ندی کے کنارے امرائے جہانگیری نے اس بہادر کو سپرد خاک کیا ۔

چند ماہ کے بعد بہادر شاہنواز کی بیگم کا بھی برہانپور میں انتقال ہوا اور حسب وصیت اس کے پہلو میں دفن کی گئیں ۔

مرزا رحمن دار خان فرزند شاہنواز خان نے خام قبروں پر ایک پختہ مقبرہ بنوا دیا جو وسط شہر برہانپور سے جانب شمال ڈیڑھ میل پر واقع ہے ۔ اہل برہانپور شاہنواز خاں کو "پہلوان" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس مقبرہ کو شاہنواز خاں پہلوان کا مقبرہ یا صرف پہلوان کا مقبرہ کہتے ہیں مقبرہ اب تک اچھی حالت میں ہے درمیان میں گنبد ہے اور عمارت مربع شکل کی ہے گنبد کے باہر ۔ ہر سمت ایک سہ درہ ہے اور ہر گوشہ میں ایک کمرہ ہے مقبرہ میں جانے کے لئے دروازہ جنوب رویہ ہے اور اسی کی سیڑھیوں کے نیچے سے ایک راستہ تہ خانہ میں جاتا ہے ۔ جہاں وسط میں دو قبریں خام ہیں جس میں ایک قبر اس نامور شخص بہادر میرزا ایرج شاہنواز خاں کی اور دوسری قبر اس کی اہلیہ کی ہے ۔

مقبرہ کے سامنے جنوب رویہ نقار خانہ خراب حالت میں ہے اور ندی کے کنارہ شمال رویہ دو گنبد اور ہیں جن میں سے ایک مشرقی سمت کا تو ندی اتونی کے بہاؤ میں نصف گر گیا ہے اور نصف اب تک اپنے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۷۷) اور شرافت خاندانی کی بدولت شاہنواز خان صفوی کا خاندان شاہی سے رشتہ ہو گیا ۔

اپنے بانی کی یاد کو تازہ کرتا ہے اس کے مقابل جانب مغرب ایک گنبد اب تک موجود ہے جس میں ایک قبر موجود ہے مگر اب تک یہ نہ معلوم ہوا کہ کس کی ہے۔

اس مقبرہ کے قریب محلات کے کھنڈر موجود ہیں جو اس زمانہ میں ممکن ہے خانخاناں اور شاہنواز خاں کے محلات ہوں اسی کے قریب دو بہت وسیع باغ ہیں جس میں پختہ باؤلیاں ہیں گو اب زراعت ہوتی ہے مگر آثار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ انہی محلات سے متعلق باغ ہوں گے۔

اہل برہانپور اکثر تفریح کے لئے اس مقبرہ کو جاتے ہیں۔ مقام بہت ہی پر فضا ہے۔ اس مقبرہ کے قریب ہی سے دہلی کی سڑک برہانپور میں آتی ہے۔

اب محکمہ آثار قدیمہ نے اس پہلوان کی قبر کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اور جالی کے دروازے وغیرہ نصب کر دیئے ہیں اور مرمت وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔

تین سو برس سے زائد زمانہ گذرا مگر گنبد کے اندرونی حصہ میں رنگ کا کام اب تک بہت اچھی حالت میں ہے جو اس زمانہ کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

از

جناب محمد عبدالسلام صاحب ذکی (عثمانیہ)

ہے صورت مجاز حقیقت نما مجھے
ظاہر پرست شیخ نے سمجھا ہے کیا مجھے

ہر دم سجود تیرے قدم پر کیا کروں
کعبہ سے بھی سوا ہے ترا نقش پا مجھے

کہتی ہے خلق درد محبت کو لا علاج
لیکن ہے اس کی دید کا شربت دوا مجھے

توحید و معرفت کے کھلے مجھ پر راز سب
دونوں جہاں ہیں رتبۂ اعلیٰ ملا مجھے

احساس دردِ عشق ہے میرے وجود سے
الفت کا درس دینے کو پیدا کیا مجھے

سوز و گداز ہے مری فطرت کا جزو خاص
پروانہ وار عشق میں جلنا ملا مجھے

نادانی سے جو بات تھی رکھ لی کسی کی کل
کن مشکلوں سے اس کو نبھانا پڑا مجھے

کحل بصر ہے خاک شفا ہے مرے لئے
اکسیر و کیمیا ہے تری خاک پا مجھے

ہے ذرہ ذرہ حسن ازل سے فروغ گیر
ملتا ہے پتہ پتہ سے اس کا پتہ مجھے

میں حل کروں تو کیسے کروں چیستان دہر
معلوم ابتدا ہے نہ کچھ انتہا مجھے

اے شوق بھر دے دل میں مرے کل جہاں کا درد
اے عشق کر دے قطرۂ دریا نما مجھے

یارب وسیع تر ہے غضب سے ترا کرم
ہوں گو گناہ گار نہ دے پر سزا مجھے

عشق بتاں نے ظلم نہ کیا کیا ذکیؔ
ایمان و ہوش چھین کے رسوا کیا مجھے

تنقیدیں

ارتقا مولفہ مشتاق احمد صاحب وجدی ۔ پونیا تقطیع ضخامت (۱۰۵) صفحات مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۔

یہ ایک مفید رسالہ ہے جو مسئلہ ارتقا پر محنت اور توجہ سے لکھا گیا ہے۔ اگرچہ ڈارون اور اس کا نظریہ ارتقا بہت شہرت رکھتے ہیں لیکن اردو میں اس موضوع پر شاید ہی کوئی ایسی دلچسپ کتاب اس سے قبل لکھی گئی ہو جس میں اس پیچیدہ مسئلہ کو اس قدر سلیس اور سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ مؤلف شکر کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہت ہی سادہ اور شگفتہ طرز بیان میں اردو دانوں کے لئے مسئلہ ارتقا پر قابل مطالعہ مواد کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دلائل ختم نبوت مؤلفہ مولانا حسام الدین صاحب فاضل ۔ بڑی تقطیع (۳۲) صفحے قیمت ۴/ مؤلف صاحب ساکن محلہ پنجہ شاہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے ۔

اس رسالہ میں عقلی و نقلی دلائل، قرآن مجید، احادیث شریف، قدیم کتب آسمانی توریت وغیرہ، غیر مسلم افراد کے اقوال سے بحث کر کے حضور اکرم صلعم کا خاتم النبیین ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ طرز بیان عام فہم ہونے کے باوجود خالص عالمانہ ہے ۔ مولانا حیدرآباد کے مشہور و مقبول واعظ ہیں اور ان کی اس کتاب کا طرز بیان بھی اسی رنگ کا ہے ۔ عامۃ المسلمین اس کے مطالعہ سے اچھے معلومات حاصل کر سکتے ہیں ۔

رفیق مدرسین از مولوی مخدوم علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ چھوٹی تقطیع (۸۰) صفحات قیمت ۴/ یہ مختصر رسالہ فی الحقیقت اضلاع و دیہات کے مدارس تحتانیہ کے مدرسین کے لئے ایک رفیق مفید ہے ۔ مؤلف نے جو سررشتہ تعلیمات کے ایک واقف کار رکن ہیں، مدارس تحتانیہ ملکی کے تمام مضامین کی پڑھائی کے اصول اور طریقے اچھے پیرائے میں بیان کئے ہیں ۔ ہماری ریاست کے ابتدائی مدارس کے اکثر مدرسین ہنوز غیر تربیت یافتہ ہیں اور ان میں اپنے مفوضہ مضامین کی اصولی تعلیم دینے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں، مؤلف ناظر مدارس ہونے کی وجہ سے ان سے بخوبی واقف ہیں۔

اس لیئے اس بارے میں ان کی ہدایات تجربے پر مبنی ہونے کے لحاظ سے بہت کار آمد ثابت ہوں گی۔ ہمارے اساتذہ مدارس تحتانیہ کے لیئے مناسب ہوگا اگر وہ اس رسالے کا بغور مطالعہ کر کے اپنی دشواریاں رفع کریں اگرچہ اس رسالے میں نمونے کے اسباق کا فقدان ایک حد تک بہت بڑی کمی ہے لیکن بہ صورت موجودہ بھی یہ رسالہ بہت مفید ہے۔ بہت اچھا ہوگا اگر مولف آیندہ اس رسالے میں اس کا بھی اضافہ کردیں گے۔ اس سے گو قیمت میں خفیف سا اضافہ ہوجائے گا لیکن کتاب کی زیادہ تعداد میں اشاعت اس کا بدل ہوسکتی ہے۔

ذہنی حساب از مولوی مخدوم علی صاحب چھوٹی تقطیع ۳۲ صفحے قیمت (۱/)

اس مختصر رسالے میں مؤلف نے سادہ اور مکسور پہاڑے، سکے، وزن، طول، گنتی، وقت اور سطح کے پیمانے، تجارتی گر، بیان کر کے ذہنی وزبانی سوالات کے ذریعہ ان کی مشق کا خاصا مواد جمع کیا ہے یہ رسالہ بھی مدارس تحتانیہ کے مدرسین حساب کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جغرافیہ اور اس کی تعلیم از مولوی مخدوم علی صاحب۔ (ہر شخص کو مفت دیجائیگی)۔

اس رسالے میں مؤلف نے بتایا ہے کہ جغرافیہ کس قدر مفید مضمون ہے اور ابتدائی مدارس میں اس کی تعلیم کس طریقے پر دیجانی چاہیئے۔ اس کے لکھنے سے مؤلف کا مقصد جغرافیہ جیسے مضمون کو جو مدارس ابتدائیہ میں آج کل بہت خشک اور بے مزہ بنا ہوا ہے، دلچسپ بنا کر پڑھانے کا طریقہ پیش کرنا ہے۔

مخدوم علی صاحب کی تینوں کتابیں خود اُن سے یا مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے ملسکتی ہیں۔

مثنوی ناسخ مرتبہ جناب حبیب اللہ خان صاحب غضنفر ام، اے۔ چھوٹی تقطیع (۸۰) صفحات ٹایپ کا چھاپہ۔ قیمت (۱۲/) ملنے کا پتہ کتابستان الہ آباد۔

اگرچہ یہ مثنوی جو شیخ ناسخ نے امیرالمومنین حضرت علیؓ کی منقبت میں تصنیف کی ہے ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے، لیکن اس کے مرتب نے جو شیخ موصوف کی سوانحعمری اور کلیات دونوں کو الگ الگ شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ریاست رام پور کے ایک قلمی نسخے سے مقابلہ کر کے اس کو مختصر مقدمے اور "مغلقات" کی فرہنگ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ یہ مثنوی شیخ کا ایک بالکل غیر مشہور کلام ہے یہ حضرت علیؓ کے مناقب وفضائل کی نسبت جو روایات عام طور پر کتب دینیہ میں پائے جاتے ہیں

ان کا نظم میں ترجمہ کردیا ہے۔ بعض جگہ تو زبان خاصی صاف اور شستہ ہے اور بعض جگہ نہایت مغلق اور ادق الفاظ کی بھرمار ہے، اس کی تفہیم و تسہیل کے لیئے مرتب نے کتاب کے آخر میں "فرہنگ مغلقات" کا اضافہ کیا ہے۔ مرتب کا مقدمہ جو شیخ کے حالات، مثنوی کی تاریخ اور تنقید پر مشتمل ہے، نہایت مختصر اور ناکافی ہے۔ البتہ مرتب نے بڑی کوشش سے ان تمام روایات کو اصلی صورت یعنے عربی زبان میں نمبروار نقل کردیا ہے، جو شیخ نے نظم کی ہیں ان کا اردو ترجمہ اس خیال سے نہیں دیا گیا کہ خود شاعر نے ان کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور کوئی کمی بیشی سوائے ضرورت قافیہ کے ردوبدل کے نہیں کی۔

سعید ایڈیٹر ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، قیمت سالانہ تین روپے۔ مقام اشاعت:۔ کوچہ چیلان دہلی۔

وہ حسن نظامی "ایسٹرن لٹریچر کمپنی" کے قیام کے ساتھ ہی "کامیابی" کے نام سے جو رسالہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی ادارت میں نکل رہا تھا وہ کمپنی کی برخاست کے ساتھ بند ہوگیا اور اب آپ نے اپنے ہی نام پر ایک رسالہ جاری کیا ہے جو عام طور پر کارآمد اور دلچسپ معلومات اور مضامین کا ماہوار مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سلیس اور سادہ طرز بیان کی بدولت بہت سے قارئین کو متوجہ کرسکتے ہیں اور ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کارآمد مضامین لکھا کرتے ہیں امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب اور قارئین "کامیابی" کے لئے اس کا نعم البدل ثابت ہوگا۔

ایوان ایڈیٹر جناب مجنوں گورکھپوری۔ قیمت سالانہ (صہ) مقام اشاعت:۔ ایوان اشاعت گورکھپور۔

یہ اس علمی و ادبی انجمن کا ماہوار رسالہ ہے جو ....

.... جناب مجنوں نے گورکھپوری "ایوان اشاعت" کے نام سے قایم کی ہے۔ اس کے اکثر مقالے فلسفیانہ مضامین ترجمہ ہوتے ہیں اور عموماً مجنوں صاحب اور ان کے ارکان انجمن یا احباب کے ہیں۔ جو نمبر اس وقت تک وصول ہوے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ اس کو زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

صاعقہ ایڈیٹر امین سلونوی صاحب۔ قیمت مقامی (عہ) بیرونجاتی (عہر) مقام اشاعت چینی گنج لکھنو

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو جیبی تقطیع کے (۳۲) صفحات کا حامل ہے۔ اغراض و مقاصد تو وہی ہیں عام طور پر ہر رسالہ کے ہوتے ہیں لیکن شذرات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص مقصد ان نا اہل ہستیوں کے تار و پود بکھیر کر رکھ دینا ہے، جو خواہ مخواہ ادبی خدمت گزار بن بیٹھے ہیں اور زمانے کی ابلہ فریبی سے بہت بڑے ادیب و انشا پرداز سمجھے جا رہے ہیں۔

مطبوعات دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

علمی و ادبی کتابیں

۱۔ **اردو شہ پارے حصہ اول** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ایم اے پی ایچ ڈی۔ تاریخ اردوئے قدیم اور ابتدائے اردو سے لیکر ولی اورنگ آبادی تک نظم و نثر کا بہترین انتخاب مع نو تصاویر شعرائے قدیم ضخامت (۴۰۰) صفحے قیمت مجلد ہے

۲۔ **روح تنقید**۔ از ڈاکٹر صاحب موصوف اردو میں فن تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت عہ

۳۔ **تنقیدی مقالات** از ڈاکٹر صاحب موصوف روح تنقید کا دوسرا حصہ پیش کردہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں چیدہ شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ ضخامت (۵۰۰) صفحے مجلد قیمت ہے

۴۔ **اردو کے اسالیب بیان** از ڈاکٹر موصوف ابتدائے اردو نثر سے لے کر موجودہ زمانے کے نثر نگاروں کے انداز تحریر و بیان کی ارتقائی تاریخ ضخامت صفحے مجلد

۵۔ **محمود غزنوی کی بزم ادب** از ڈاکٹر صاحب موصوف غزنوی دور کی علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت ۱۲

۶۔ **ارباب نثر اردو** از سید محمد ایم اے۔ اردو نثر نویسی کی تاریخ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین اردو کا تذکرہ ضخامت (۲۲۰) صفحے مجلد قیمت عا

۷۔ **دکن میں اردو** از نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل۔ ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصفجاہی دور کے شعرا کا تذکرہ اور دکن کے علمی تصانیف رسائل اخبارات کے مفصل حالات ضخامت (۳۸۰) صفحے قیمت عا

۸۔ **آثار الکرام** از حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس ایران وسط اور جنوبی ہند کے اسلامی سلاطین کے علمی ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے قیمت ۱۲

۹۔ **گلشن گفتار** مرتبہ سید محمد ایم اے۔ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مع جامع مقدمہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے کے دکن و ہندوستان کے مشہور شاعروں کے حالات نوشتہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی ضخامت (۸۵) صفحے قیمت ۱۲

۱۰۔ **مقدمات عبدالحق حصہ اول** مرتبہ مرزا محمد بیگ اسپشل افسر مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو و پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے علمی ادبی اردو مقدموں اور دیباچوں کا مکمل مجموعہ جو مختلف موضوع کی گراں مایہ کتابوں پر شائع ہوئے تھے ضخامت (۳۰۴) صفحے قیمت (عاہ)

۱۱۔ **مقدمات عبدالحق** حصہ دوم (زیر طبع)

۱۲۔ **دنیائے افسانہ** از عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی۔ اردو افسانوں کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان پر تنقید اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ضخامت (۲۱۸) صفحے قیمت عہ

۱۳۔ **کردار و افسانہ** از سروری افسانہ نگاری میں کردار اہم جزو ہے اردو کے چند مشہور افسانوں میں کردار عمرو عیار (داستان امیر حمزہ) نجم النساء (مثنوی میر حسن) (توبۃ النصوح) عون محمد (مراثی انیس) تنقیدی مقالات ضخامت (۲۳۲) صفحے قیمت عہ

۱۴۔ **قدیم افسانے** از سروری۔ دنیا کے شہکار افسانوں میں سے قدیم ترین (۲۵) افسانوں کا مجموعہ ضخامت ... صفحے قیمت عہ

۱۵۔ **چینی اور جاپانی افسانے** بہ نگرانی سروری چین اور جاپان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت ... صفحے قیمت

۱۶۔ **انگریزی افسانے** بہ نگرانی سروری انگلستان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۲۰۰) صفحے قیمت عہ

۱۷۔ **مبادی فلسفہ** از میر حسن الدین بی اے، ال ال بی ڈاکٹر اے ایس رابولورٹ پی ایچ ڈی کی پرائمر آف دی فلاسفی کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ ضخامت (۱۳۶) صفحے قیمت ۱۲/

۱۸۔ **مبادی نفسیات** از شیخ عبدالحمید شوق بی اے آنرز۔ یہ اردو زبان میں نفسیات سے متعلق اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ضخامت (۱۹۰) صفحے قیمت عہ

۱۹۔ **قاموس الاغلاط** از مولانا سید مختار احمد ذہین پانچ ہزار الفاظ کی تحقیق اور اول اغلاط کی تصحیح جواب کے اہل تحقیق کے لئے مفید کتاب ضخامت (۱۸۴) صفحے قیمت (سے)

۲۰۔ **محمود گاواں** از ظہیر الدین سلطنت بہمنیہ کے وزیر و مدبر خواجہ جہاں محمود گاواں کی معتبر سوانح عمری ضخامت (۵۵) صفحے قیمت

۲۱۔ **نیلگری** ۔ از حمید اللہ ایم اے، ال ال بی جنوبی ہند کے صحت افزا مقام کی تاریخی و جغرافی معلومات ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت ۱۲/

درسی و تعلیمی کتابیں

ان میں سے اکثر کتابیں قلمروئے آصفیہ حضور نظام کے مدارس میں داخل نصاب ہیں:۔

۱۔ **خیابان اردو** از عارف مدیر صبح دکن۔ ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور شعراء گرامی کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب ضخامت (۴۳) صفحے قیمت مجلد

۲۔ **حدایق الاخلاق** از مولانا ذہین کے نظم و نثر مجموعہ جو ہائی اسکولوں کے لئے نہایت مفید ہے ضخامت (۱۵۸) صفحے قیمت (۱۰؏)

۳۔ **تنظیم الاخلاق** ۔ از سید عبدالعزیز عزیز لڑکے اور لڑکیوں کے لئے اخلاقی نظموں کا مجموعہ ضخامت (۹۸) صفحے قیمت (۱۲/)

۴۔ **خزینہ اخلاق** از سید عبدالعزیز عزیز اخلاقی اور اول نظم و نثر کا مجموعہ جو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بیحد مفید ہے ضخامت (۶۴) صفحے قیمت ۶/

۵۔ **قاعدہ فارسی** ۔ از ابوالمحاسن متین ڈائرکٹ میتھڈ پر فارسی زبان کا جدید قاعدہ قیمت ۶ر

۶۔ **دروس فارسی** حصہ اول از ابوالمحاسن متین ڈائرکٹ میتھڈ پر فارسی کی پہلی کتاب قیمت ۸ر

۷۔ **مخزن القواعد** از میرزا علی رضا شیرازی لکچرار سٹی کالج۔ ہائی اسکول کے لئے فارسی کی بہترین گرامر قیمت ۱۲ر

۸۔ **عقائد الامام** از محمد عبد الغفور عابد حضرت امام اعظم رح کی مقبول عام کتاب فقہ اکبر کا عام فہم اور سلیس اردو ترجمہ ۳ر

۹۔ **قواعد مضمون نویسی حصہ اول** از مظفر الدین اردو مضمون نگاری کی تعلیم و تربیت میں بہترین کتاب قیمت ۳ر

۱۰۔ **قواعد مضمون نویسی حصہ دوم** از مظفر الدین ۵ر قیمت ۶ر

۱۱۔ **طریقہ املا نویسی** از مظفر الدین اردو املا سکھلانے کا مفید رسالہ قیمت ۱ر

۱۲۔ **حمایت الحساب** (۵ حصے) از غلام رسول ابتدائی جماعت سے لے کر چوتھی جماعت کے لئے حساب کی کارآمد و مفید کتاب ہر ایک کی قیمت بالترتیب ۴ر۶ر، ۷ر۶ر، ۷ر۶ر، ۱۲ر۶ر، ۱۴ر

۱۳۔ **جبر و مقابلہ وسطانیہ** ۔ از سید انوار حسین بی، اے ۔ مڈل سکولوں کے لئے کارآمد جبر و مقابلہ قیمت ۵ر

۱۴۔ **مکمل ہندسہ عملی** از محمد منیر الدین بی، اے میٹریکولیشن کے لئے نہایت کارآمد و مفید ہندسہ عملی ۱۴ر

۱۵۔ **تاریخ ہند حصہ اول** ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ جو ایک تجربہ کار ٹرینڈ گریجویٹ نے لکھی ہے قیمت

۱۶۔ **جغرافیہ ریاست حیدرآباد** از غلام قادری، بی اے، غلام رسول اساتذہ سٹی کالج قلمروئے آصفیہ حضور نظام کا بہترین جغرافیہ ضخامت (۱۶۲) صفحے قیمت ۱۲ر

۱۷۔ **معلومات دیہی حصہ اول** از غلام رسول قلمروئے آصفیہ کی زراعت کی ابتدائی معلومات اور دیہاتی انتظام کے متعلق مفید کتاب قیمت ۲ر۶ر

۱۸۔ **معلومات دیہی حصہ دوم** از غلام رسول زراعت اور انتظام سے متعلق مزید معلومات قیمت ۲ر

۱۹۔ **شاہ رفیع الدین قندہاری** از محمد عبد الغفور عابد دکن کے ایک صاحب دل صوفی اور عالم کی دلچسپ سوانح عمری ضخامت (۱۴۴)

۲۰۔ **سیرت خیر البشر** از ذہین آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ نظم میں قیمت ۱ر

۲۱۔ **چھوٹا شیطان** از ذہین علم کی فضیلت اور جہل کی مذمت نظم میں قیمت ۱ر

۲۲۔ **بچوں کا قاعدہ** از مولانا مختار احمد ذہین بچوں کے لئے اردو کا مفید قاعدہ قیمت ۳ر

۲۳۔ **اردو کے حروف تہجی کا تختہ** ۔ مدارس کیلئے اردو کے ابجد پڑھانے کا رنگین باتصویر چارٹ عہ

۲۴۔ **بالک پہاڑہ** ۔ بچوں کے لئے جمع تفریق ضرب اور تقسیم اور کسری پہاڑے ۔ قیمت (۶ر)